لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ

تخریج شدہ ایڈیشن

محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب

سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم

تالیف

علامہ شبلی نعمانی رحمہ اللہ تعالیٰ

علامہ سید سلیمان ندوی رحمہ اللہ تعالیٰ

مکتبہ اسلامیہ

تخریج شدہ ایڈیشن
حصہ پنجم
سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم
محسنِ انسانیت کی سیرت پر منفرد اسلوب کی حامل ایک جامع کتاب
اس میں عبادات مثلاً نماز، اوقاتِ نماز، زکوٰۃ، حج، جہاد، تقویٰ، اخلاق، توکل، صبر اور شکر جیسے اہم امور کو موضوعِ بحث بنایا گیا ہے۔
تالیف
علامہ شبلی نعمانی
علامہ سید سلیمان ندوی
مکتبہ اسلامیہ

کتاب ---------- سیرۃ النبی ﷺ

تالیف ---------- علامہ شبلی نعمانی، علامہ سید سلیمان ندوی

ناشر ---------- محمد سرور عاصم

اشاعت ---------- اکتوبر 2012ء

قیمت ----------

ملنے کا پتا

مکتبہ اسلامیہ

بالمقابل رحمان مارکیٹ غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور۔ پاکستان فون: 042-37244973 فیکس: 042-37232369

بیسمنٹ سمٹ بینک بالمقابل شیل پٹرول پمپ کوتوالی روڈ، فیصل آباد۔ پاکستان فون: 041-2631204, 2034256

E-mail:maktabaislamiapk@gmail.com

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ پنجم

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ ششم

فہرست مضامین سیرۃ النبی ﷺ حصہ ہفتم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچہ طبع دوم

سیرۃ النبی ﷺ کی یہ پانچویں جلد رجب ۱۳۵۴ھ میں بڑی تقطیع پر چھپی تھی، اس وقت سے لوگوں کا تقاضا تھا کہ اس کی چھوٹی تقطیع بھی جلد شائع ہو، مگر نظرِ ثانی کے لیے مجھے وقت نہیں ملتا تھا، اس لیے یہ کام جلد از جلد انجام نہ پاسکا، اب جب اس سے فرصت ملی اور بعض دوستوں نے اس کام میں میرا ہاتھ بٹایا، تو تین برس میں یہ کام انجام کو پہنچا، بعض فروگزاشتیں جو طبع اول میں ہوگئی تھیں، ان کی اصلاح کر دی گئی ہے پھر بھی عصمت کا دعویٰ کون کرسکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ میری لغزشوں سے درگزر فرمائے اور میری لغزشوں کو دوسروں کی لغزشوں کا سبب نہ بنائے۔

رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَا إِنْ نَّسِيْنَا أَوْ أَخْطَأْنَا

داعی

سید سلیمان ندوی

دارالمصنفین، اعظم گڑھ

۲۴/ جمادی الاولیٰ ۱۳۵۷ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

سُبْحَانَ رَبِّكَ رَبِّ الْعِزَّةِ عَمَّا يَصِفُوْنَ وَسَلَامٌ عَلَى الْمُرْسَلِيْنَ وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۔

دیباچہ

سیرۃ النبی ﷺ کی چوتھی جلد ربیع الاول ۱۳۵۱ھ میں شائع ہوئی تھی، آج تین سال کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا فضل ہے کہ وہ اپنے ایک گناہ گار بندہ سے اپنے دین کا ایک کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسن قبول کے لئے کھول دیا ہے۔

موضوع

اس جلد کا موضوع عبادت ہے، اس میں عبادت کی وہ حقیقت اور اسلام میں اس کے وہ اقسام وانواع اور ان میں سے ہر ایک کی وہ مصلحت وحکمت اور اس باب میں گزشتہ مذاہب کے اسباق کی وہ تکمیل جو ذات پاک محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ دنیا پر ظاہر ہوئی، ایک خطا کار قلم نے لکھی اور بیان کی ہے۔ اپنی کوشش تو یہی رہی ہے کہ قدم اس راستہ سے نہ ہٹے جو صراط مستقیم ہے اور وہ سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹے جو ہر مسلمان کا عروۃ الوثقیٰ ہے۔ تاہم وہی کہتا ہوں جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم اور اکابر نے (خدا ان سے راضی ہو) فرمایا کہ ”جو بات کہی گئی ہے، اگر صحیح ہے تو وہ خدا کی طرف سے ہے اور غلط ہے تو نفس خطا کار کا قصور ہے۔“

ان جلدوں کا سیرت سے تعلق

ہر چند کہ اس کتاب کے ضمن میں یہ بات کئی دفعہ دہرائی گئی ہے کہ اس سلسلہ کا تعلق صرف مغازی اور سیرت کے واقعات سے نہیں، جن کو عام طور سے سیرت کہتے ہیں۔ بلکہ اسلام کے پیغام اور اسلام کے پیغام لانے والے دونوں سے یکساں ہے، صاف لفظوں میں یوں کہنا چاہیے کہ اس سلسلہ کا مقصد ان دو سوالوں کا جواب ہے، اسلام کا پیغمبر کون تھا؟ اور وہ کیا لایا تھا؟ سیرت کی شروع کی تین جلدیں پہلے سوال کا جواب تھیں اور باقی جلدیں دوسرے سوال کا جواب ہیں۔ اس سلسلہ کی ترتیب اور تکمیل میں میں نے امکان بھر اس خاکہ کی پیروی کی ہے جس کا خیال حضرۃ الاستاد علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کو تھا۔ ان زبانی بیانوں اور تلقینوں کے علاوہ جو اپنی مجلس کی گفتگو میں فرمایا کرتے تھے، وہ خود اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

> ”چاہتا ہوں کہ ہر قسم کے مباحث سیرت میں آ جائیں۔ یعنی تمام مہمات مسائل پر ریویو، قرآن مجید پر پوری نظر، غرض سیرت نہ ہو بلکہ انسائیکلوپیڈیا اور نام بھی دائرۃ المعارف النبویہ موزوں ہوگا۔ گولمبا ہے اور ابھی میں نے فیصلہ نہیں کیا۔“ (بنام مولانا حبیب الرحمان خان شیروانی صفحہ نمبر ۱۰۴)

سیرۃ جلد اوّل کے مقدمہ میں انہوں نے ان حصوں کا عنوان منصب نبوت رکھا تھا اور لکھا تھا:

دوسرا حصہ منصبِ نبوت کے متعلق ہے۔ نبوت کا فرض تعلیم عقائد اور امر و نواہی اصلاح اعمال اور اخلاق ہے۔ اس بنا پر منصب نبوت کے کاموں کی تفصیل اس حصہ میں کی گئی ہے، اس حصہ میں فرائض خمسہ اور تمام اوامر و نواہی کی ابتدا اور تدریجی تغیرات کی مفصل تاریخ اور ان کے مصالح اور حکم اور دیگر مذاہب سے ان کا مقابلہ اور موازنہ ہے۔ اسی حصہ میں نہایت تفصیل سے بتایا گیا ہے کہ عرب کے عقائد اور اخلاق و عادات پہلے کیا تھے اور ان میں کیا کیا اصلاحیں عمل میں آئیں۔ نیز یہ کہ تمام عالم کی اصلاح کے لئے اسلام نے کیا قانون مرتب کیا اور کیونکر وہ تمام عالم کے لئے کافی ہوسکتا ہے۔'' (جلد اول طبع اول صفحہ ۷۴ و طبع دوم صفحہ ۹۷)

گزشتہ چوتھی جلد یا پانچویں جلد اور آیندہ دو جلدیں درحقیقت اسی منصب نبوت کے مباحث کی تفصیل وتشریح ہیں۔ منصب نبوت، عرب کی گزشتہ حالت اور تعلیم عقائد چوتھی جلد کا موضوع تھی اور فرائض خمسہ، ان کی مصلحتیں اور حکمتیں اس جلد کا عنوان ہیں۔ اخلاق و معاشرت کے نقطوں کے لئے چھٹی جلد اور بقیہ اوامر و نواہی کے لئے جو معاملات سے متعلق ہیں ساتویں جلد ہوگی۔ ان میں سے ہر موضوع کی تفصیل وتشریح میں مصنفِ اول کے ایما کے مطابق قرآن مجید پر پوری نظر رکھی جاتی ہے، ان کی تدریجی تاریخ پیش نظر رہتی ہے۔ ان کی مصلحتوں اور حکمتوں سے پردہ اٹھایا جاتا ہے، دوسرے مذہبوں سے مناظرانہ پہلو کو بچا بچا کر مقابلہ اور موازنہ کیا جاتا ہے اور ہر ایک بحث کے متعلق بتایا جاتا ہے کہ اسلام نے اس باب میں کیا تعلیم پیش کی ہے اور وہ کیوں کر تمام عالم کی اصلاح کے لئے کافی ہے:

؎ درپس آئینہ طوطی صفتم داشتہ اند آنچہ استاد ''مرا'' گفت بماں می گویم

حسن قبول

اللہ پاک کا ہزار ہزار شکر ہے کہ اس نے اس سلسلہ کو حسنِ قبول کی سند عطا فرمائی:

ع قبولِ خاطر دلہا خداداد است می دانم

اس کتاب کی پہلی ہی جلد شائع ہوئی تھی کہ ایک مقدس بزرگ نے جن کے ساتھ مجھے پوری عقیدت تھی اور جن کی زبان سے استحقاق کے باوجود کبھی مدعیانہ فقرہ نہیں نکلا، مجھ سے فرمایا: ''یہ کتاب وہاں قبول ہوگئی۔'' ان کے اس ارشاد کی تصدیق زمانہ کے واقعات نے ہوگئی۔ علاوہ اس کے کہ اس کی ہر جلد کے کئی کئی ایڈیشن شائع ہو چکے۔ ہندوستان اور بیرون ہندوستان کے مسلمانوں میں اس کے ساتھ خاص شیفتگی اور عقیدت پیدا ہوگئی۔ ترکی میں اس کی تین جلدوں کا ترجمہ قسطنطنیہ سے شائع ہوا۔ فارسی میں اس کی چند جلدیں کابل میں ترجمہ کی گئیں اور اب تک منتظر طبع ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عربی میں مکہ معظمہ میں اس کے ترجمہ کا خیال

پیدا ہوا ہے۔

اس کی قبولیت کی بڑی دلیل یہ ہے کہ اس کی پہلی اشاعت کے وقت سے لے کر آج تک اس زبان میں جس میں اس موضوع پر کوئی قابل توجہ کتاب نہ تھی، چھوٹی بڑی سینکڑوں کتابیں نئے نئے دعووں کے ساتھ اس کو سامنے رکھ رکھ کر لوگ لکھ رہے ہیں اور سیرت کا ایک عظیم الشان ذخیرہ ہماری زبان میں بحمد اللہ پیدا ہو گیا ہے اور اس کی تعلیم و مطالعہ اور اشاعت کی طرف مسلمانوں کا عام رجحان ہو گیا ہے۔

امرائے اسلام کی امداد

اس کتاب کے حسن قبول کی ایک اور دلیل یہ ہے کہ مصنف مرحوم نے اس کی تصنیف کا خاکہ جونہی شائع کیا اس کی خدمت کے لئے لبیک کی سب سے پہلی آواز اس محترمہ کی زبان سے نکلی، جس کا ہر تار نفس محبت رسول ﷺ کے دامن سے وابستہ تھا، یعنی ملت محمدی کی خادمہ اور امت محمدی کی مخدومہ تاج الہند نواب سلطان جہاں بیگم سابق فرمانروائے بھوپال (خدا ان پر اپنی رحمتوں کے پھول برسائے) نومبر ۱۹۱۴ء میں مصنف کی وفات پر خیال گزرا کہ شاید یہ توجہ ہمایونی باقی نہ رہے۔ مگر فرمایا کہ یہ کام اس مصنف کے لئے نہ تھا جو مر چکا۔ بلکہ اس خدا کے لئے تھا جس کو موت نہیں۔ اس لئے اپنی شاہانہ ماہوار امداد برابر جاری رکھی۔ مصنف نے سیرت کی تصنیف کے متعلق ایک قطعہ لکھا تھا:

مصارف کی طرف سے مطمئن ہوں میں بہر صورت	کہ ابر فیض سلطان جہاں بیگم زر افشاں ہے
رہی تالیف و تنقید روایت ہائے تاریخی	تو اس کے واسطے حاضر میرا دل ہے میری جاں ہے
عرض دو ہاتھ ہیں اس کام کے انجام میں شامل	کہ جن میں اک فقیر بے نوا ہے ایک سلطاں ہے

جب اس ''فقیر بے نوا'' کی وفات ہوئی تو سرکار عالیہ نے بڑے درد سے فرمایا تھا کہ ''فقیر بے نوا تو چل بسا۔ اب سلطان کی باری ہے۔'' آخر یہ سلطان بھی چل بسی اور تالیف و تنقید روایت کے ساتھ ساتھ زر افشانی کے کام کی ناتمامی کا خطرہ بھی پیدا ہو گیا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ فردوس مکانی نے اپنا سچا جانشین یادگار چھوڑا، وہ تاج و تخت ایک ایسے جواں بخت کے سپرد کر گئیں، جس نے فرائض حکومت کی گرانباری کے ساتھ ساتھ ان کے ناتمام کارناموں کی تکمیل کا بوجھ بھی اٹھالیا اور سیرۃ النبی ﷺ کی تالیف کی امداد میں وہی توجہ مبذول رکھی۔ سکندر صولت افتخار الملک حضور نواب حاجی حمید اللہ خان بہادر فرمانروائے بھوپال کی عمر و دولت و اقبال میں اللہ تبارک و تعالیٰ شانہ برکت عطا فرمائے کہ ان کے زیر سایہ امت و ملت کی سینکڑوں آرزوئیں پرورش پا رہی ہیں۔ خلد اللہ ملکہ

۱۹۱۸ء (۱۳۳۶ھ) میں سیرت کی پہلی جلد جب چھپ کر شائع ہوئی تو جامع نے اس کا ایک نسخہ اعلیٰ حضرت آصفجاہ سابع مظفر الملک والممالک نظام الدولہ نظام الملک سلطان دکن خلد اللہ ملکہ پیشگاہ خسروی میں

پیش کیا۔ حضور ممدوح کو اپنے مولیٰ وآقا حضرت سرور کائنات فخر موجودات سید المرسلین محبوب العلمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفےٰ علیہ الوف التحیات والصلوت کی ذات قدسی آیات سے والہانہ عقیدت ہے۔ سیرت کی پہلی جلد پڑھ کر بہت مسرور ومحظوظ ہوئے اور دوسری جلدوں کے جلد چھپ جانے کی غرض سے دو دو برس کے لئے تین دفعہ اور تین برس کے لئے ایک دفعہ دو سو ماہوار جاری فرمائے، جن سے پچھلے برسوں میں جب ملک کی اقتصادی حالت نے ہم کو خطرہ میں پھنسا دیا تھا، بیحد مدد ملی۔ اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہِ بے نیاز میں التجا ہے کہ وہ باقی جلدوں کی جلد تکمیل کی توفیق عطا فرمائے۔ عمر کا رہوار زندگی کی پچاس سے زیادہ منزلیں طے کر چکا جو کچھ باقی ہے دعا ہے کہ وہ بھی اسی سفر میں گزر جائے اور آخر میں خوش قسمت سعدیؔ کی طرح ہمیں بھی یہ کہنے کا موقع ملے۔

منزل تمام گشت و بہ پایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اول وصف تو ماندہ ایم

مؤلف
سید سلیمان ندوی
شبلی منزل، اعظم گڑھ
۲۳ رجب ۱۳۵۴ھ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عمل صالح

﴿الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾ (۱۰۳/ العصر: ۳)

محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم کو لے کر آئے۔اس کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔ایک ایمان اور دوسری عمل صالح۔کتاب سیرۃ النبی ﷺ کی گزشتہ چوتھی جلد ایمان کی شرح و توضیح میں تھی۔اب یہ پیش نظر حصہ عمل صالح کی تشریح و بیان میں ہے۔ایمان بنیادی اصولوں پر یقین کامل رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا،کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں۔جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔اسلام نے انسان کی نجات اور فلاح کو ان ہی دو چیزوں یعنی ایمان و عمل صالح پر مبنی قرار دیا ہے۔لیکن افسوس ہے کہ عوام میں ایمان کو جو اہمیت حاصل ہے،وہ عمل صالح کو نہیں۔حالانکہ یہ دونوں لازم و ملزوم کی حیثیت سے عملاً یکساں اہمیت رکھتے ہیں۔فرق صرف اتنا ہے کہ ایمان بنیاد ہے اور عمل صالح اس پر قائم شدہ دیوار یا ستون جس طرح کوئی عمارت بنیاد کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی،اسی طرح وہ دیوار یا ستون کے بغیر کھڑی بھی نہیں ہوسکتی۔

ان دونوں کی بہترین مثال اقلیدس کے اصول اور اشکال کی ہے۔ایمان کی حیثیت اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کی ہے جن کو صحیح مانے بغیر اقلیدس کی شکلوں کا اصول محال ہے۔لیکن اگر صرف اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کو تسلیم کرلیا جائے اور ان کے مطابق شکلوں کا عمل نہ کیا جائے تو فن تعمیر و ہندسہ اور مساحت و پیمائش میں اقلیدس کا فن ایک ذرہ کار آمد نہیں ہوسکتا اور نہ اس سے انسان کو وہ فائدے حاصل ہوسکتے ہیں جو اس فن سے اصل مقصود ہیں۔عوام کی اس غلط فہمی کو دور کرنے کے لئے ضرورت ہے کہ اس بارہ میں قرآن پاک کی تعلیم کو تفصیلاً پیش کیا جائے۔قرآن پاک نے انسان کی فلاح و کامیابی کے ذریعہ کو بیسیوں آیتوں میں بیان کیا ہے۔مگر ہر جگہ بلا استثنا ایمان اور عمل صالح دونوں پر اس کو مبنی قرار دیا ہے اور ہر جگہ ایمان کو پہلی اور عمل صالح کو دوسری مگر ضروری حیثیت دی ہے۔فرمایا:

﴿وَالْعَصْرِ ۝ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِیْ خُسْرٍ ۝ اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ﴾

(۱۰۳/ العصر: ۳)

’’زمانہ (مع اپنی پوری انسانی تاریخ کے) گواہ ہے کہ انسان گھاٹے میں ہے۔لیکن وہ جو ایمان لائے اور اچھے کام کیے۔‘‘

زمانہ کی پوری انسانی تاریخ اس حقیقت پر شاہد عدل ہے کہ انہیں افراد اور قوموں پر فوز و فلاح اور

کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔ جنہیں ربانی حقائق کا یقین تھا اور اس یقین کے مطابق ان کے عمل بھی نیک ہوتے رہے۔ ایک دوسری آیت میں فرمایا:

﴿ لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ ۝ ثُمَّ رَدَدْنَاهُ أَسْفَلَ سَافِلِينَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ فَلَهُمْ أَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُونٍ ۝ ﴾ (۹۵/التین: ۴-۶)

''بے شک ہم نے انسان کو بہترین حالت درستی میں پیدا کیا۔ پھر اس کو سب سے نیچوں کے نیچے لوٹا دیا۔ لیکن جو ایمان لائے اور اچھے کام کئے تو ان کے لئے نہ ختم ہونے والی مزدوری ہے۔''

اس آیت میں انسانی فطرت کی بہترین صلاحیت کو پھر خود انسانوں کے ہاتھوں سے اس کی بدترین منزل تک پہنچ جانے کو بیان کیا گیا ہے۔ لیکن اس بدترین منزل کی پستی سے کون لوگ بچائے جاتے ہیں۔ وہ جن میں ایمان کی رفعت اور عمل صالح کی بلندی ہے۔ یہود سے جن کو یہ دعویٰ تھا کہ بہشت انہیں کے ٹھیکہ میں ہے، یہ فرمایا:

﴿ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۸۲)

''اور جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہی جنت والے ہیں۔''

یعنی جنت کا حصول نسل اور قومیت پر موقوف نہیں۔ بلکہ ایمان اور عمل صالح پر ہے۔ جو شخص جنت کی یہ قیمت ادا کرے گا وہ اسی کی ملکیت ہے فرمایا:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالصَّابِئُونَ وَالنَّصَارَىٰ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۹)

''بے شک جو مسلمان ہیں اور جو یہود ہیں اور صابئین اور نصاریٰ جو کوئی اللہ پر اور پچھلے دن پر ایمان لائے اور اچھے کام کرے نہ تو ان پر ڈر ہے، نہ وہ غم کھائیں گے۔''

اس آیت کا منشا بھی یہی ہے کہ فلاح و نجات کا حصول کسی نسل و قومیت پر موقوف نہیں اور نہ کسی مذہب و ملت کی طرف رسمی نسبت پر ہے بلکہ احکام الٰہی پر یقین لانے اور ان کے مطابق عمل کرنے پر ہے۔ عدمِ ایمان اور بدکاری کا نتیجہ دنیا اور آخرت کی تباہی اور ایمان اور نیکوکاری کا نتیجہ دین و دنیا کی بہتری، اللہ تعالیٰ کا وہ طبعی قانون ہے جس میں نہ کبھی بال برابر فرق ہوا اور نہ ہوگا۔ چنانچہ ذوالقرنین کی زبانی یہ فرمایا:

﴿ قَالَ أَمَّا مَن ظَلَمَ فَسَوْفَ نُعَذِّبُهُ ثُمَّ يُرَدُّ إِلَىٰ رَبِّهِ فَيُعَذِّبُهُ عَذَابًا نُّكْرًا ۝ وَأَمَّا مَنْ آمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُ جَزَاءً الْحُسْنَىٰ ﴾ (۱۸/ الکھف:۸۷-۸۸)

''اس نے کہا جو کوئی گناہ کا کام کرے گا تو ہم اس کو (دنیا میں) سزا دیں گے پھر وہ اپنے رب

کے پاس لوٹا کر جائے گا تو اس کو بری طرح سزا دے گا اور جو کوئی ایمان لایا اور نیک عمل کیے تو اس کے لیے بھلائی کا بدلہ ہے۔''

﴿ فَمَنْ يَعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَا كُفْرَانَ لِسَعْيِهٖ ۚ وَاِنَّا لَهٗ كٰتِبُوْنَ ﴾.

(۲۱/ الانبیآء:۹۴)

''تو جو کوئی نیک عمل کرے اور وہ مومن بھی ہو تو اس کی کوشش اکارت نہ ہوگی اور ہم اس کے (نیک عمل) کو لکھتے جاتے ہیں۔''

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ فَسَوْفَ يَلْقَوْنَ غَيًّا ۙ اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ شَيْـًٔا ۙ ﴾.

(۱۹/ مریم:۵۹۔۶۰)

''تو ان کے بعد ان کے ایسے جانشین ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کیا اور نفسانی خواہشوں کی پیروی کی تو وہ گمراہی سے ملیں گے۔ لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لایا اور نیک کام کیے تو وہی لوگ جنت میں داخل ہوں گے اور ان کا ذرا سا حق بھی مارا نہ جائے گا۔''

اس سے اور اسی قسم کی دوسری آیتوں سے یہ بات ثابت ہے کہ جنت کا استحقاق دراصل انہی کو ہے جو ایمان اور پھر ایمان کے مطابق عمل سے بھی آراستہ ہیں اور جو عمل سے محروم ہیں، وہ اس استحقاق سے بھی محروم ہیں۔ الا یہ کہ اللہ تعالیٰ بخشش فرمائے:

﴿ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ رَوْضٰتِ الْجَنّٰتِ ۚ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ هُوَ الْفَضْلُ الْكَبِيْرُ ۝ ذٰلِكَ الَّذِيْ يُبَشِّرُ اللّٰهُ عِبَادَهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ ﴾

(۴۲/ الشوریٰ:۲۲۔۲۳)

''اور جو ایمان لائے اور نیک کام کیے وہ جنت کے باغوں میں ہوں گے، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس وہ ہے جو وہ چاہیں۔ یہی بڑی مہربانی ہے یہی وہ ہے جس کی خوشخبری اللہ اپنے ان بندوں کو دیتا ہے جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے۔''

دوسری جگہ فرمایا:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ كَانَتْ لَهُمْ جَنّٰتُ الْفِرْدَوْسِ نُزُلًا ۙ ﴾

(۱۸/ الکہف:۱۰۷)

''بے شک جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے ان کی مہمانی کے لیے باغ فردوس ہیں۔''

پھر آگے چل کر فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ يَرْجُوْا لِقَآءَ رَبِّهٖ فَلْيَعْمَلْ عَمَلًا صَالِحًا وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ۝ ﴾

(۱۸/ الکھف: ۱۱۰)

'' تو جس کو اپنے پروردگار سے ملنے کی امید ہو تو چاہیے کہ وہ نیک عمل کرے اور کسی کو اپنے پروردگار کا شریک نہ بنائے۔''

ایمان کے ہوتے عمل سے محرومی تو محض فرض ہے، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ جہاں عمل کی کمی ہے، اسی کے بقدر ایمان میں بھی کمزوری ہے، کسی چیز پر پورا پورا یقین آ جانے کے بعد اس کے برخلاف عمل کرنا انسانی فطرت کے خلاف ہے۔ آگ کو جلانے والی آگ یقین کر لینے کے بعد پھر کون اس میں اپنے ہاتھ کو ڈالنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ لیکن نادان بچہ جو ابھی آگ کو جلانے والی آگ نہیں جانتا وہ بار ہا اس میں ہاتھ ڈالنے کو آمادہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے عمل کا قصور ہمارے یقین کی کمزوری کا راز فاش کرتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ تنہا ایمان یا تنہا عمل کو نہیں، بلکہ ہر جگہ دونوں کو ملا کر نجات کا ذریعہ بتایا ہے:

﴿ فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ۝ ﴾ (۲۲/الحج ٥٦)

'' تو جو ایمان لائے اور نیک عمل کیے وہ آرام کے باغوں میں ہوں گے۔''

اسی طرح قرآن پاک میں تھوڑے تھوڑے تغیر سے ۴۵ موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ﴾

'' جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے۔''

اس سے قطعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کی نظر میں ایمان اور عمل باہم ایسے لازم و ملزوم ہیں جو ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے اور نجات اور فوز و فلاح کا مدار ان دونوں پر یکساں ہے۔ البتہ اس قدر فرق ہے کہ رتبہ میں پہلے کو دوسرے پر تقدم حاصل ہے۔ جن مسلمانوں سے اللہ تعالیٰ نے دنیاوی حکومت و سلطنت کا وعدہ فرمایا ہے وہ بھی وہی ہیں، جن میں ایمان کے ساتھ عمل صالح بھی ہو:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾

(۲٤/النور: ٥٥)

'' تم میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے خدا نے وعدہ کیا کہ ان کو زمین کا مالک بنائے گا۔''

آخرت کی مغفرت اور روزی کا وعدہ بھی انہیں سے تھا:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ مِنْهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا ۝ ﴾

(٤٨/ الفتح: ۲۹)

'' اللہ نے ان میں سے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے بخشائش اور بڑی روزی کا وعدہ کیا۔''

بعض آیتوں میں ایمان کے بجائے اسلام یعنی اطاعت مندی اور عمل صالح کی جگہ احسان یعنی نیکوکاری کو جگہ دی گئی ہے مثلاً: ایک آیت میں یہود و نصاریٰ کے اس دعویٰ کی تردید میں کہ بہشت میں صرف وہی جائیں گے، فرمایا:

﴿ بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗۤ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۲)

''کیوں نہیں جس نے اپنے آپ کو اللہ کے تابع کیا اور وہ نیکوکار ہے تو اس کی مزدوری اس کے پروردگار کے پاس ہے۔ نہ ڈر ہے ان کو اور نہ غم۔''

ان تمام آیتوں سے یہ اصول ثابت ہوتا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر ہے اور یہی وہ سب سے بڑی صداقت ہے، جس سے اسلام سے پیشتر مذاہب میں افراط اور تفریط نمایاں تھی۔ عیسائیوں میں جیسا کہ پال کے خطوط [1] میں ہی صرف ایمان پر نجات کا مدار ہے اور بودھ دھرم میں صرف نیکوکاری سے نروان کا درجہ ملتا ہے اور کہیں صرف گیان اور دھیان کو نجات کا راستہ بتایا گیا ہے۔ مگر پیغمبر اسلام ﷺ کے پیغام نے انسان کی نجات کا ذریعہ ذہنی (ایمان) اور جسمانی (عمل صالح) دونوں اعمال کو ملا کر قرار دیا ہے۔ یعنی پہلی چیز یہ ہے کہ ہم کو اصول کے صحیح ہونے کا یقین ہو اس کو ایمان کہتے ہیں۔ پھر یہ کہ ان اصولوں کے مطابق ہمارا عمل درست اور صحیح ہو، یہ عمل صالح ہے اور ہر قسم کی کامیابیوں کا مدار انہی دو باتوں پر ہے۔ کوئی مریض صرف کسی اصول طبی کو صحیح ماننے سے بیماریوں سے نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصول ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لیے کافی نہیں۔ جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل بھی نہ کیا جائے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِلزَّكٰوةِ فٰعِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ ۝ اِلَّا عَلٰۤى اَزْوَاجِهِمْ اَوْ مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُهُمْ فَاِنَّهُمْ غَيْرُ مَلُوْمِيْنَ ۝ فَمَنِ ابْتَغٰى وَرَآءَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْعٰدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ لِاَمٰنٰتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رٰعُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْوٰرِثُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۱۔۱۰)

''وہ ایمان والے مراد کو پہنچے جو نماز میں عاجزی کرتے ہیں، جو نکمی باتوں کی طرف رخ نہیں کرتے، جو زکوۃ دیتے ہیں، جو اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرتے ہیں اور جو اپنی امانتوں اور اپنے عہد کا پاس کرتے ہیں جو اپنی نمازوں کے پابند ہیں، یہی بہشت کے وارث ہیں۔''

---

[1] رومیوں کے نام ۴:۳،۱۴ الکتاب المقدس کتاب العہد الجدید، ص: ۳۴۹، ۳۵۰۔

اس دنیا میں اللہ تعالیٰ نے ہر شے کو ہمارے مادی علل واسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی اور فوز وفلاح بھی صرف ذہنی عقیدہ اور ایمان سے حاصل نہیں ہوسکتی۔ جب تک اس عقیدہ کے مطابق عمل بھی نہ کیا جائے۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے۔ ہماری بھوک دفع نہیں ہوسکتی۔ بلکہ اس کے لیے ہم کو جدوجہد کر کے روٹی حاصل کرنا اور اس کو چبا کر اپنے پیٹ میں نگلنا بھی پڑے گا۔ اس عقیدہ سے کہ ہم کو ہماری ٹانگیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچ نہیں سکتے۔ جب تک اس یقین کے ساتھ ہم اپنی ٹانگوں کو بھی خاص طور سے حرکت نہ دیں۔ یہی صورت ہمارے دوسرے دنیاوی اعمال کی ہے۔ اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لیے بیکار ہے۔ البتہ اس قدر صحیح ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے وہ اس سے بہر حال بہتر ہے۔ جو ان کو سرے سے نہیں مانتا کیوں کہ اول الذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آ جانے اور نیک عمل بن جانے کی امید ہوسکتی ہے اور دوسرے کے لیے تو اوّل پہلی ہی منزل باقی ہے۔ اس لیے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلہ میں شاید اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم کا زیادہ مستحق قرار پائے کہ کم از کم وہ اس کے فرمان کو صحیح باور تو کرتا تھا۔

اعمالِ صالحہ کی قسمیں

''عمل صالح'' کا مفہوم بہت وسیع ہے، اس کے اندر انسانی اعمالِ خیر کے تمام جزئیات داخل ہیں، تاہم ان کی جلی تقسیمات حسب ذیل ہیں۔ عبادات اخلاق، معاملات۔ اسلام میں لفظ عبادت کو بڑی وسعت حاصل ہے۔ اس کے اندر ہر وہ کام داخل ہے، جس کی غرض خدا کی خوشنودی ہو۔ اس لیے اخلاق ومعاملات بھی اگر اس خوش نیتی کے ساتھ کیے جائیں تو وہ عبادات میں داخل ہیں۔ مگر فقہا نے اصطلاحًا یہ تین الگ الگ اور مستقل ابواب قرار دیے ہیں۔ جن کی تفصیل یوں کی جاسکتی ہے کہ اولاً اعمالِ صالحہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق خاص خدا سے ہے، اس کو عبادت کہتے ہیں۔ دوسری وہ جس کا تعلق بندوں سے ہے، اس کی بھی دو قسمیں ہیں، ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسانی فرض کی ہوتی ہے اور دوسری وہ جس میں قانونی ذمہ داری کی حیثیت ملحوظ ہوتی ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا معاملات ہے۔

اعمال صالحہ کی انہیں تینوں قسموں کی تفصیل وتشریح سیرۃ النبی ﷺ کی موجودہ اور آیندہ جلدوں کا موضوع ہے۔

عبادات

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱)

عبادت کے معنی عام طور سے وہ چند مخصوص اعمال سمجھے جاتے ہیں، جن کو انسان خدا کی عظمت اور کبریائی کی بارگاہ میں بجالاتا ہے۔لیکن یہ عبادات کا نہایت تنگ مفہوم ہے۔اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعے سے انسانوں پر جو حقیقت ظاہر فرمائی۔اس کا اصل جوہر یہ نہیں ہے کہ گزشتہ مذاہب کی عبادت کے طریقوں کے بجائے اسلام میں عبادت کے دوسرے طریقے مقرر ہوئے۔بلکہ یہ ہے کہ انسانوں کو یہ بتایا گیا کہ عبادت کی حقیقت اور غایت کیا ہے۔ساتھ ہی عبادات کے گزشتہ ناقص طریقوں کی تکمیل ،مبہم بیانات کی تشریح اور مجمل تعلیمات کی تفصیل کی گئی۔اہل عرب جہاں آسمانی مذہب کی دوسری حقیقتوں سے بے خبر تھے۔وہاں عبادت کے مفہوم و معنی اور اس کے صحیح طریقوں سے بھی ناواقف تھے۔عرب میں جو یہود اور عیسائی تھے، وہ بھی اس کے متعلق اپنے عمل اور تعلیم سے کوئی واضح حقیقت ان کے سامنے پیش نہ کر سکے تھے۔اس عہد میں جو عیسائی فرقے عرب میں تھے۔عقائد میں ان کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت کو تسلیم کرتے تھے اور عبادات میں یہ تھا کہ تمام دنیا کے عیش و آرام اور لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر کے عرب کے سنسان بیابانوں اور پہاڑوں میں انہوں نے اپنی عبادت گاہیں اور خانقاہیں بنالی تھیں اور ان میں بیٹھ کر تمام دنیا کی جدوجہد اور سعی و کوشش کے میدانوں سے ہٹ کر مجرد اور متقشفانہ زندگی بسر کرتے تھے۔اسی لیے عربوں کی شاعری میں عیسائیت کا تخیل ایک ''راہب متبتل'' کی صورت میں تھا۔عرب کا سب سے بڑا شاعر امراء القیس کہتا ہے:

ع منارۃ ممسی راہبٍ متبتل [1] ''دنیا سے الگ تھلگ زندگی بسر کرنے والے راہب کے نام کا چراغ۔''

عرب میں یہود اپنی اخلاقی اور مذہبی بدعملیوں کے سبب سے سخت بدنام تھے۔ان میں روحانی خلوص و ایثار اور خدا پرستی نام کو نہ تھی۔وہ صرف سبت (سنیچر) کے دن تورات کے حکم کے مطابق تعطیل منانا اور اس دن کوئی کام نہ کرنا بڑی عبادت سمجھتے تھے۔قرآن پاک نے ان دونوں فرقوں کی اس حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔یہودیوں پر اس نے بے حکمی، نافرمانی، اکل حرام اور طاغوت کی پرستش کا اور عیسائیوں پر غلو فی الدین کا صحیح الزام قائم کیا ہے۔ [2] یہودی جادو ٹونا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور جب کبھی موقع ملتا غیر قوموں کے بتوں کے سامنے بھی سر جھکا لیتے تھے۔عیسائی حضرت مریم علیہا السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور مسیحی اولیا اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کو پوجتے تھے۔انہوں نے راہبانہ عبادت کے نئے

[1] دیوان امرء القیس، ص:۱۷ دار المعارف القاہرۃ۔ [2] دیکھو/ المائدۃ:۶۲۔۷۷، اور ۵۷/ الحدید:۱۶۔۲۷۔

نئے اور جسم کو سخت تکلیف اور آزار پہنچانے والے طریقے ایجاد کیے تھے اور ان کا نام انہوں نے دینداری رکھا تھا۔ سورۂ حدید میں قرآن پاک نے یہود اور نصاریٰ دونوں کو فاسق کہا ہے، لیکن ان دونوں کے فسق میں نہایت نازک فرق ہے۔ یہود کا فسق دین میں کمی اور سستی کرنا اور نصاریٰ کا فسق دین میں زیادتی اور غلو کرنا تھا اور خدا کے مشروع دین میں کمی اور زیادتی دونوں گناہ ہیں۔ اسی لیے قرآن نے دونوں کو برابر کا فسق قرار دیا:

﴿ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا وَّاِبْرٰهِيْمَ وَجَعَلْنَا فِيْ ذُرِّيَّتِهِمَا النُّبُوَّةَ وَالْكِتٰبَ فَمِنْهُمْ مُّهْتَدٍ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ثُمَّ قَفَّيْنَا عَلٰٓى اٰثَارِهِمْ بِرُسُلِنَا وَقَفَّيْنَا بِعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ وَاٰتَيْنٰهُ الْاِنْجِيْلَ ۙ وَجَعَلْنَا فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ رَاْفَةً وَّرَحْمَةً ۭ وَرَهْبَانِيَّةَۨ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَاۗءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا ۚ فَاٰتَيْنَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْهُمْ اَجْرَهُمْ ۚ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ ﴾ (۵۷/ الحدید:۲۶۔۲۷)

''اور ہم نے نوح اور ابراہیم علیہما السلام کو بھیجا اور ان کی نسل میں نبوت اور کتاب رکھی تو ان میں سے کچھ راہ پر ہیں اور اکثر نافرمان ہیں۔ پھر ان کے بعد ان کے پیچھے ہم نے اپنے اور پیغمبر بھیجے اور مریم کے بیٹے عیسیٰ کو بھیجا اور ان کو انجیل عنایت فرمائی اور جنہوں نے عیسیٰ کی پیروی کی ان کے دل میں نرمی اور رحم دلی بنائی اور ایک رہبانیت انہوں نے نئی چیز نکالی جو ہم نے ان پر نہیں لکھی تھی۔ لیکن خدا کی خوشنودی حاصل کرنا تو انہوں نے اس رہبانیت کو بھی جیسا بنانا چاہیے تھا نہیں بنایا۔ تو ان میں جو ایماندار تھے ان کو ہم نے ان کی مزدوری دی اور ان میں بہت سے نافرمان ہیں۔''

ان آیتوں سے معلوم ہوا کہ عیسائی دین میں اضافہ اور افراط کے مرتکب ہوئے۔ اسی لیے قرآن نے ان کو بار بار کہا:

﴿ لَا تَغْلُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ ﴾ (۴/ النسآء:۱۷۱ و ۵/ المآئدۃ:۷۷)

''اپنے دین میں غلو نہ کرو۔''

ان کا سب سے بڑا غلو یہ تھا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جن کو صرف رسول اللہ ماننے کا حکم دیا گیا تھا۔ وہ ابن اللہ ماننے لگے اور یہود کا یہ حال تھا کہ وہ خدا کے رسولوں کو رسول بھی ماننا نہیں چاہتے تھے۔ بلکہ ان کو قتل کرتے تھے ﴿ وَيَقْتُلُوْنَ النَّبِيّٖنَ ﴾ (۲/ بقرۃ:۶۱، ۳/ آل عمران:۲۱) ساتھ ہی وہ خدائے برحق کو چھوڑ کر بت پرست ہمسایہ قوموں کے بتوں کو پوجنے لگے تھے۔ چنانچہ تورات میں یہودیوں کی بت پرستی اور غیر خداؤں کے آگے سر جھکانے کا بار بار تذکرہ ہے اور قرآن میں ان کے متعلق ہے:

﴿ وَعَبَدَ الطَّاغُوْتَ ۭ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۶۰)

''اور جنہوں نے شیطان کو (یا بتوں کو) پوجا۔''

آنحضرت ﷺ نے عیسائیوں کو تبلیغ کی:

﴿ مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ ۝ قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوا مِن قَبْلُ وَأَضَلُّوا كَثِيرًا وَضَلُّوا عَن سَوَاءِ السَّبِيلِ ۝ ﴾. (۵/ المآئدۃ:۷۵_۷۷)

''مریم کا بیٹا مسیح ایک پیغمبر ہے اور بس اس سے پہلے اور پیغمبر گزر چکے اور اس کی ماں ولی تھی دونوں (انسان تھے) کھانا کھاتے تھے (خدا نہ تھے) دیکھ ہم ان (عیسائیوں) کے لیے اس طرح کھول کر دلیلیں بیان کرتے ہیں، پھر بھی دیکھ وہ کدھر الٹے جاتے ہیں۔ (ان سے) کہہ کہ کیا تم خدا کو چھوڑ کر ان (انسانوں) کو پوجتے ہو جن کے ہاتھ میں نہ نقصان ہے نہ نفع، اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے جو نفع نقصان پہنچا سکتا ہے۔ کہ اے کتاب والو! اپنے دین میں ناحق زیادتی نہ کرو اور ان لوگوں کے خیال پر نہ چلو جو بہک گئے اور بہتوں کو بہکایا اور سیدھے راستہ سے بھٹک گئے۔''

ان کی حالت یہ تھی:

﴿ اتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّن دُونِ اللَّهِ ﴾. (۹/التوبۃ:۳۱)

''خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا لیا تھا۔''

اس زمانہ میں عیسائیوں کے جو گرجے اور پرستش گاہیں عرب میں اور خصوصاً ملک حبش میں تھیں، ان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام اور حواریوں، ولیوں اور شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے۔ عبادت گزار ان کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سربسجود رہتے تھے۔ صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا میں ان معبدوں کے دیکھنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان میں سے شاید بعض بیبیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوتی تھی۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن و خوبی کو بیان کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''خدا یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے، انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا۔ تم ایسا نہ کرنا ان میں سے جب کوئی نیک آدمی مرجاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر دیتے تھے۔'' [1]

[1] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النهی عن بناء المساجد علی القبور. ۱۱۸۱ تا۱۱۸۸۔

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص ابواب میں عیسوی مذہب کے عبادات کے جو حالات بیان کیے ہیں، وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید میں ہیں۔ خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت مریم علیہا السلام، سینٹ پال اور متعدد ولیوں اور شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے، وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آ رہی ہیں اور آج بھی دین دار عیسائی دن رات موم بتیوں کی روشنی میں ان کے آگے مراقبوں اور تسبیحوں میں سرنگوں نظر آتے ہیں۔ روم (اٹلی) کے تاریخی گرجاؤں میں یہ منظر میں نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اور اس وقت محمد رسول اللہ ﷺ کی اس حدیث کی اصلی تشریح میری آنکھوں کے سامنے تھی۔ یہودیوں اور عیسائیوں کو چھوڑ کر خاص عرب کے لوگ اللہ نام ایک ہستی سے واقف ضرور تھے۔ مگر اس کی عبادت اور پرستش کے مفہوم سے بے خبر تھے۔ لات، عزیٰ، ہبل اور اپنے اپنے قبیلہ کے جن بتوں کو حاجت روا اور پرستش کے قابل سمجھتے تھے۔ ان پر جانور کی قربانی کرتے اور اپنی اولادوں کو بھینٹ چڑھاتے تھے۔ سال کے مختلف اوقات میں مختلف بت خانوں کے میلوں میں شریک ہوتے تھے اور پتھروں کے ڈھیروں کے سامنے بعض مشرکانہ رسوم ادا کرتے تھے۔ خانہ کعبہ یعنی خلیل علیہ السلام بت شکن کا معبد تین سو ساٹھ بتوں کا مرکز تھا اور ان کی نماز یہ تھی کہ خانہ کعبہ کے صحن میں جمع ہو کر سیٹی اور تالی بجا بجا کر بتوں کو خوش اور راضی رکھیں۔ قریش کا موحد زید بن عمرو جو آنحضرت ﷺ کی نبوت سے پہلے بت پرستی سے تائب ہو چکا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ''اے خدا مجھے نہیں معلوم کہ میں تجھ کو کس طرح پوجوں اگر جانتا تو اسی طرح عبادت کرتا۔'' [1]

ایک صحابی شاعر عامر بن اکوع خیبر کے سفر میں ترانہ گا رہے تھے اور آنحضرت ﷺ سن رہے تھے: [2]

والله لو لا انت ما اهتدينا ولا تصدقنا و لا صلينا

''خدا کی قسم! اگر تو نہ ہوتا تو نہ ہم راستہ پاتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے۔''

اس شعر میں اس حقیقت کا اظہار ہے کہ وہ محمد رسول اللہ ﷺ ہی کی تعلیم تھی، جس نے اہل عرب کو عبادت کے صحیح طریقوں سے آشنا کیا۔

عرب سے باہر بھی کہیں خدائے واحد کی پرستش نہ تھی۔ بت پرست یونانی اپنے بادشاہوں اور ہیروؤں کے مجسمے اور ستاروں کے ہیکل پوجتے تھے۔ روم، ایشیائے کوچک، یورپ، افریقہ، مصر، بربر، حبشہ وغیرہ عیسائی ملکوں میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام حضرت مریم علیہا السلام اور سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی مورتیاں اور ہڈیاں اور ان کی مصنوعی یادگاریں پوجی جا رہی تھیں۔ زردشت کی مملکت میں آگ کی پرستش جاری تھی۔ ہندوستان سے لے کر کابل و ترکستان اور چین اور جزائر ہند تک بودھ کی مورتوں، سادھوں اور اس کی جلی ہوئی ہڈیوں کی راکھ کی پوجا

---

[1] سيرة ابن هشام ذكر ورقة وزيد بن عمر، ج ١، ص: ١٤٤۔

[2] صحيح مسلم، كتاب الجهاد والسير، باب غزوة خيبر ٤٦٦٩ شعر کا پہلا لفظ مختلف روایتوں میں مختلف ہے۔

ہو رہی تھی۔ چین کے کنفوش اپنے باپ دادوں کی مورتوں کے آگے خم تھے۔ خاص ہندوستان میں سورج دیوتا گنگا مائی اور اوتاروں کی پوجا ہو رہی تھی۔ عراق کے صابئی سبع سیارہ کی پرستش کی تاریکی میں مبتلا تھے۔ باقی تمام دنیا درختوں، پتھروں، جانوروں، بھوتوں اور دیوتاؤں کی پرستش کر رہی تھی۔ غرض عین اس وقت جب تمام دنیا خدائے واحد کو چھوڑ کر آسمان سے زمین تک کی مخلوقات کی پرستش میں مصروف تھی۔ ایک بے آب وگیاہ ملک کے ایک گوشہ سے آواز آئی:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (۲/ البقرة:۲۱)

''لوگو! اپنے اس پروردگار کی پرستش کرو، جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا۔''

سابق کتب الٰہی کے ایمان داروں کو آواز دی گئی:

﴿ يَاأَهْلَ الْكِتٰبِ تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ اَلَّا نَعْبُدَ اِلَّا اللّٰهَ ﴾.

(۳/ آل عمران:٦٤)

''اے کتاب والو! آؤ ہم تم اس بات پر عملاً متحد ہو جائیں، جس میں ہم تم عقیدۃً متفق ہیں کہ ہم خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہ کریں۔''

مگر یہ آواز ریگستان عرب کے صرف چند حق پرستوں نے سنی اور پکار اٹھے:

﴿ رَبَّنَا اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ۖ رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا ﴾

(۳/ آل عمران:۱۹۳)

''خداوندا! ہم نے ایمان کی منادی کی آواز سنی کہ اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ تو ہم ایمان لے آئے تو اے پروردگار ہمارے گناہ معاف کر۔''

ان واقعات کو سامنے رکھ کر آنحضرت ﷺ کی اس دعا کی صداقت کا اندازہ کرو جو بدر کے امتحان گاہ میں آپ کی زبان عبودیت ترجمان سے بارگاہ الٰہی میں کی گئی تھی:

''یا الٰہی! تیرے پوجنے والوں کی یہ مٹھی بھر جماعت آج تیرے لیے لڑنے پر آمادہ ہے۔ الٰہی! آج اگر یہ مٹ گئی تو پھر زمین میں تیری کبھی پرستش نہ ہوگی۔'' [1]

خدا نے اپنے نبی ﷺ کی دعا سنی اور قبول فرمائی کیوں کہ خاتم الانبیاء کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا۔ جو غافل دنیا کو خدا کی یاد دلاتا اور خدا کی سچی اور مخلصانہ عبادت کی تعلیم دیتا۔

صرف ایک خدا کی عبادت

مذہب کی تکمیل اور اصلاح کے سلسلہ میں نبوتِ محمدی ﷺ کا پہلا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے دنیا کے

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب الامداد بالملائكة فی غزوة بدر:٤٥٨٨؛ جامع ترمذی، کتاب التفسیر، ومن سورة الانفال:٣٠٨١؛ مسند أحمد، ج١، ص:٣٠، ٣٢، ١١٧۔

معبدوں سے تمام باطل معبودوں کو باہر نکال کر پھینک دیا۔ باطل معبودوں کی عبادت اور پرستش یک قلم محو کر دی اور صرف اس ایک خدا کے سامنے خدا کی تمام مخلوقات کی گردنیں جھکا دیں اور صاف اعلان کر دیا کہ

﴿ اِنْ كُلُّ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ اِلَّآ اٰتِي الرَّحْمٰنِ عَبْدًا ۝﴾ (۱۹/ مریم:۹۳)

''آسمان وزمین کی تمام مخلوق اس مہربان خدا کے سامنے غلام ہی بن کر آنے والی ہے۔''

خدا کے سوا نہ تو آسمان میں نہ زمین میں نہ آسمان کے اوپر اور نہ زمین کے نیچے کوئی ایسی چیز ہے جو انسان کے سجدہ اور رکوع وقیام کی مستحق ہے اور نہ ہی اس کے سوا کسی اور کے نام پر کسی جاندار کا خون بہایا جا سکتا ہے اور نہ اس کی پرستش کے لیے گھر کی کوئی دیوار اٹھائی جا سکتی ہے اور نہ اس کی نذر مانی جا سکتی ہے اور نہ اس سے دعا مانگی جا سکتی ہے۔ ہر عبادت صرف اسی کے لیے اور ہر پرستش صرف اسی کی خاطر ہے:

﴿ اِنَّ صَلَاتِيْ وَنُسُكِيْ وَمَحْيَايَ وَمَمَاتِيْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝﴾ (۶/ الانعام:۱۶۲)

''بے شبہ میری نماز اور میری قربانی اور میری زندگی اور میری موت سب اسی ایک عالم کے پروردگار اللہ کے لیے ہے۔''

کفار کو بتوں، دیوتاؤں، ستاروں اور دوسری مخلوقات کی پرستش سے ہر طرح منع کیا گیا اور انہیں ہر دلیل سے سمجھایا گیا کہ خدائے برحق کے سوا کسی اور کی پرستش نہیں، لیکن جب ان پر اس سمجھانے بجھانے کا کوئی اثر نہ ہوا تو اسلام کے پیغمبر کو اس انقطاع کے اعلان کا حکم ہوا:

﴿ قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ ۝ لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ ۝ وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ ۝ لَكُمْ دِيْنُكُمْ وَلِيَ دِيْنِ ۝﴾ (۱۰۹/ الکافرون)

''اے کافرو! جس کو تم پوجتے ہو اس کو میں نہیں پوجتا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو، جس کو میں پوجتا ہوں اور نہ میں اسکو پوجنے والا ہوں، جس کو تم نے پوجا اور نہ تم اس کو پوجنے والے ہو، جس کو میں پوجتا ہوں، تمہارے لیے تمہارا دین ہے اور میرے لیے میرا دین ہے۔''

خارجی رسوم کا وجود نہیں

خدا کی عبادت اور پرستش کے وقت جسم وجان سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ نہ سورج کے نکلنے اور اس کی طرف دیکھنے کی حاجت، نہ دریا میں جا کر اس کا پانی اچھالنے سے مطلب [1] نہ سامنے آگ کا الاؤ جلانے کی ضرورت [2] نہ دیوتاؤں، دیبیوں، بزرگوں اور ولیوں کے مجسموں کو پیش نظر رکھنے کی اجازت [3] نہ سامنے موم بتیوں کے روشن کرنے کا حکم [4] نہ گھنٹوں اور ناقوسوں کی ضرورت نہ لوبان اور دوسرے بخورات جلانے کی رسم، نہ سونے چاندی کے خاص خاص ظروف اور برتنوں کے رکھنے کا طریقہ، نہ کسی خاص قسم کے

---

[1] جیسا کہ ہندوؤں میں ہے۔ [2] جیسا کہ پارسیوں میں ہے۔

[3] جیسا کہ ہندوؤں، عام بت پرستوں اور رومن کیتھولک میں ہے۔

[4] جیسا کہ رومن کیتھولک عیسائیوں میں ہے۔

کپڑوں کی قید [1] ان تمام بیرونی رسوم اور قیود سے اسلام کی عبادت پاک اور آزاد ہے۔ اس کے لیے صرف ایک پاک ستر پوش لباس، پاک جسم اور پاک دل کی ضرورت ہے، اگر جسم ولباس کی پاکی سے کبھی مجبوری ہو جائے تو یہ بھی معاف ہے۔

درمیانی، آدمی کی ضرورت نہیں

اسلام میں عبادت کے لیے خدا اور بندہ کے درمیان کسی خاص خاندان اور کسی خاص شخصیت کی وساطت اور درمیانگی کی حاجت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے دین میں ہندوؤں کی طرح نہ برہمن ہیں، نہ پروہت ہیں، نہ پجاری ہیں۔ نہ یہودیوں کی طرح کاہن ہیں نہ ربی ہیں۔ نہ حاخام ہیں نہ حضرت ہارون علیہ السلام کے خاندان کی وساطت کی قید ہے، نہ عیسائیوں کی طرح عبادتوں کی بجا آوری کے لیے پادریوں اور مختلف مذہبی عہدہ داروں کی ضرورت ہے اور نہ پارسیوں کی طرح دستوروں اور موبدوں کی حاجت۔ یہاں ہر بندہ اپنے خدا سے آپ مخاطب ہوتا ہے، آپ باتیں کرتا ہے، آپ عرض حال کرتا ہے، ہر مسلمان اپنا آپ برہمن، اپنا آپ کاہن، اپنا آپ پادری اور اپنا آپ دستور ہے، یہاں یہ حکم ہے کہ تم مجھے براہ راست پکارو میں جواب دوں گا:

﴿ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٦٠)

''تم مجھے پکارو میں تم کو جواب دوں گا۔''

خارجی کشش کی کوئی چیز نہیں

اکثر مذاہب نے اپنی عبادتوں کو دلکش دلفریب مؤثر اور بارعب بنانے کے لیے خارجی تاثیرات سے کام لیا تھا۔ کہیں ناقوس اور قرنا کی پر رعب آوازیں تھیں، کہیں ساز وترنم اور نغمہ و بربط کی دلکش صدائیں تھیں، کہیں جرس اور گھنٹے کا غلغلہ انداز شور لیکن دین محمدی ﷺ کی سادگی نے ان میں سے ہر ایک سے احتراز کیا اور انسانی قلوب کو متاثر کرنے کے لیے دل کے ساز اور روح کی صدا کے سوا کسی اور خارجی اور بناوٹی تدبیر کا سہارا نہیں لیا، تا کہ خدا اور بندہ کا راز ونیاز اپنی اصلی اور فطری سادگی کے ساتھ خلوص واثر کے مناظر پیدا کرے۔

مکان کی قید نہیں

ہر مذہب نے اپنی عبادت کو اینٹ اور چونے کی چہار دیواری میں محدود کیا ہے۔ بت خانوں سے باہر پوجا نہیں۔ آتش خانوں سے الگ کوئی نماز نہیں، گرجوں کے سوا کہیں دعا نہیں اور صومعوں سے نکل کر کوئی پرستش نہیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کے طریقہ میں نہ کسی در و دیوار کی ضرورت نہ محراب ومنبر کی حاجت، وہ دیر وحرم، معبد وصومعہ اور مسجد وکنیسہ سب سے بے نیاز ہے۔ زمین کا ہر گوشہ بلکہ پہنائے کائنات کا ہر حصہ اس کا معبد اور عبادت خانہ ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''مجھے اللہ تعالیٰ نے بعض ایسی خصوصیتیں عنایت کیں جو مجھ سے پہلے پیغمبروں کو نہیں دی گئیں، منجملہ ان کے ایک یہ ہے:

---

[1] یہ چیزیں یہودیوں کے ہاں ہیں پارسیوں میں سفید کپڑوں کی اکثر ضرورت ہے۔

((وجعلت لی الارض مسجدا)) ❶

''اور میرے لیے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنادی گئی۔''

تم سوار ہو کہ پیادہ، گلگشت چمن میں ہو کہ ہنگامہ کارزار میں، خشکی میں ہو کہ تری میں، ہوا میں ہو کہ زمین پر، جہاز میں ہو کہ ریل پر ہر جگہ خدا کی عبادت کر سکتے ہو اور اس کے سامنے سجدہ نیاز بجالا سکتے ہو۔ یہاں تک کہ اگر تم کسی غیر مذہب کے ایسے معبد میں ہو، جس میں سامنے بت اور مجسمے نہ ہوں تو وہاں بھی اپنا فریضہ عبادت ادا کر سکتے ہو۔ ❷ خاص خاص عبادتوں کے وقت مختلف سمتوں اور چیزوں کی طرف رخ کرنا بھی ہر مذہب میں ضروری سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ تمام مسلمانوں کو ایک واحد رخ پر مجتمع کرنے کے لیے، تاکہ ان میں وحدت کی شان نمایاں ہو، مسلمانوں کے لیے بھی کسی ایک سمت خاص کی حاجت تھی اور اس کے لیے اسلام میں مسجد ابراہیمی کی تخصیص کی گئی ہے کہ وہ دنیا میں خدائے واحد کی پرستش کا پہلا مقام ہے۔ لیکن اس کی حیثیت وہ نہیں قائم کی گئی جو دوسرے مذاہب کے قبلوں کی ہے۔ اسلام کا قبلہ شمال وجنوب اور مشرق ومغرب کی حدود سے پاک ہے۔ وہ ستاروں کے رخ یا چاند اور سورج کے مواجہ کا قائل نہیں اور دنیا کے مختلف ملکوں کے مسلمان ہر سمت اور ہر جہت سے اس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مغرب سے بھی مشرق سے بھی شمال سے بھی اور جنوب سے بھی کسی ایک سمت کی تخصیص نہیں اور خود خانہ کعبہ کے صحن میں بیک وقت ہر جہت اور ہر سمت سے اس کی طرف رخ کیا جاتا ہے۔ اگر کسی سبب سے اس رخ کا بھی پتہ نہ لگ سکے تو جدھر بھی رخ کرو ادھر ہی خدا ہے۔ چنانچہ کسی چلتی ہوئی سواری پر سفر کرنے کی حالت میں اور عام نفل نمازوں کی درستی کے لیے قبلہ کی بھی تخصیص نہیں۔ جدھر سواری کا رخ ہو ادھر ہی سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ لڑائیوں میں ہر رخ پر نماز برابر ادا کی جا سکتی ہے۔ اگر خدانخواستہ کعبہ کی عمارت باقی نہ رہے تب بھی اس رخ کھڑا ہو جانا کافی ہے۔ کعبہ کے اندر کھڑے ہو کر جدھر چاہو سر جھکا دو۔

انسانی قربانی کی ممانعت

بعض مذاہب میں خدا کی سب سے مرغوب عبادت یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان اپنی یا اپنی اولاد کی جان کو خواہ گلا کاٹ کر یا دریا میں ڈبا کر یا آگ میں جلا کر یا کسی اور طرح بھینٹ چڑھا دے۔ اسلام نے اس عبادت کا قطعی استیصال کر دیا اور بتایا کہ خدا کی راہ میں اپنی جان قربان کرنا اصل میں یہ ہے کہ کسی سچائی کی حمایت میں یا کمزوروں کی مدد کی خاطر اپنی جان کی پروانہ کرے اور مارا جائے، یہ نہیں ہے کہ اپنے ہاتھ سے اپنا گلا کاٹ لیا جائے یا دریا میں ڈوب مرا جائے یا آگ میں اپنے کو جلا دیا جائے۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جو شخص جس چیز سے اپنے آپ کو قتل کرے گا، اس کو جہنم میں اسی چیز سے سزا دی جائے گی۔'' ❸

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب قول النبی ﷺ: ((جعلت لی الارض مسجدا وطهورا)): ۴۳۸۔

❷ صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ باب الصلوٰۃ فی البیعة رقم الباب: ۵۴۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الادب، باب من اکفر اخاه بغیر تأویل فهو کما قال: ۶۱۰۵۔

حیوانی قربانی میں اصلاح

کسی حیوان کی قربانی کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کا طریقہ اکثر مذاہب میں رائج تھا۔عرب میں اس کا طریقہ یہ تھا کہ لوگ جانور ذبح کر کے بتوں پر چڑھا دیتے تھے۔کبھی یہ کرتے تھے کہ مردہ کی قبر پر کوئی جانور لا کر باندھ دیتے تھے اور اس کو چارہ گھاس نہیں دیتے تھے،وہ اسی طرح بھوک اور پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جاتا تھا۔اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ خدا خون کے نذرانہ سے خوش ہوتا ہے۔چنانچہ قربانی ذبح کر کے معبد کی دیوار پر اس کے خون کا چھاپ دیتے تھے۔یہودیوں میں یہ طریقہ تھا کہ جانور قربانی کر کے اس کا گوشت جلا دیتے تھے اور اس کے متعلق وہ جو رسوم ادا کرتے تھے ان کی تفصیل صفحوں میں بھی نہیں سما سکتی۔ان کا یہ بھی عقیدہ تھا کہ یہ قربانی خدا کی غذا ہے۔ [1] بعض مذاہب میں یہ تھا کہ اس کا گوشت چیل اور کوؤں کو کھلا دیتے تھے۔پیغام محمدی ﷺ نے ان سب طریقوں کو مٹا دیا۔اس نے سب سے پہلے یہ بتایا کہ اس قربانی سے مقصود خون اور گوشت کی نہیں،بلکہ تمہارے دلوں کی غذا مطلوب ہے۔فرمایا:

﴿ لَنْ یَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ یَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (۲۲/ الحج :۳۷)

”اللہ کے پاس قربانی کے جانور کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا،بلکہ تمہارے دل کی پرہیز گاری پہنچتی ہے۔“

اسلام نے تمام عبادات میں صرف ایک حج کے موقع پر قربانی واجب کی ہے اور اہلِ استطاعت کے لیے جو موقعہ حج پر نہ گئے ہوں،مقام حج کی یاد کے لیے قربانی مسنون کی گئی ہے،تاکہ اس واقعہ کی یاد تازہ ہو جب ملتِ حنیفی کے سب سے پہلے داعی نے اپنے خواب کی تعبیر میں اپنے اکلوتے بیٹے کو خدا کے سامنے قربان کرنا چاہا تھا اور خدا نے اس کو آزمائش میں پورا ہوتا دیکھ کر اس کی چھری کے نیچے بیٹے کی بجائے دنبے کی گردن رکھ دی اور اس کے پیروؤں میں اس عظیم الشان واقعہ کی سالانہ یادگار قائم ہو گئی۔

اسی کے ساتھ پیام محمدی ﷺ نے یہ تعلیم دی کہ اس قربانی کا منشا ارواح کو خوش کرنا،مصیبتوں کو دور کرنا،جان کا فدیہ دینا یا صرف خون کا بہانا اور گردن کا کاٹنا نہیں،بلکہ اس سے دو مقصد ہیں،ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ کے اس احسان کا شکر ادا کیا جائے کہ اس نے جانوروں کو ہماری ضرورتوں میں لگایا اور ان کو ہماری غذا کے لیے مہیا کیا اور دوسرا یہ کہ ان کا گوشت غریبوں مسکینوں اور فقیروں کو کھلا کر خدا کی خوشنودی حاصل کی جائے۔چنانچہ فرمایا:

﴿ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا لِّیَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ؕ فَاِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ فَلَهٗۤ اَسْلِمُوْا ؕ وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِیْنَ ﴾ (۲۲/ الحج :۳۴)

”ہم نے ہر قوم کے لیے قربانی مقرر کی،تاکہ وہ ان جانوروں پر خدا کے نام کی یاد کریں،جو ہم نے ان کو روزی کی تو تمہارا خدا ایک خدا ہے،اسی کے آگے سر جھکاؤ اور عاجزی کرنے والے

[1] احبار:۲۱۔۶۔

بندوں کو خوشخبری سنا دے۔"

﴿ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِيْهَا خَيْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۚ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۶)

"اور قربانی کے جانور کو خدا کی نشانیاں بنایا ہے۔تمہارے لیے ان میں بہت فائدے ہیں،ان کو قطار میں کھڑا کر کے تم ان پر خدا کا نام لو تو جب وہ پہلو کے بل جھکیں (یعنی ذبح ہو چکیں) تو ان میں سے کچھ خود کھاؤ اور باقی قناعت پسند فقیروں اور محتاجوں کو کھلا دو،اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے کام میں لگایا ہے کہ خدا کا شکر ادا کرو۔"

یہی وجہ ہے کہ خدا کے نام کے سوا کسی اور کے نام پر اگر جانور کو ذبح کیا جائے تو محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت میں یہ فعل شرک اور ایسے جانور کا گوشت کھانا حرام ہے۔﴿ وَ مَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ ﴾عرب میں دستور تھا کہ خاص رجب کے مہینہ میں قربانی کرتے تھے۔اسلام کے بعد لوگوں نے اس کے متعلق آپ سے پوچھا آپ ﷺ نے فرمایا:"خدا کے نام سے جس مہینہ میں چاہو ذبح کرو،نیک کام خدا کے لیے کرو اور (غریبوں کو) کھلاؤ۔" ❶ غرض قربانی کی یہی دو حقیقتیں ہیں۔صرف خون بہانے کے لیے خون بہانا قربانی کی حقیقت نہیں اور نہ یہ خون بہانا مشرکوں کی دیبیوں اور دیوتاؤں کی طرح اسلام کے خدا کو خوش آتا ہے۔

مشرکانہ قربانیوں کی ممانعت

اسی لیے وہ تمام مشرکانہ قربانیاں جو عرب میں جاری تھیں بند کر دی گئیں۔عرب میں جانوروں کے قربانی کرنے اور ان کو بتوں پر چڑھانے کے مختلف طریقے تھے۔اونٹنی کا پہلا بچہ جو پیدا ہوتا تھا،بتوں کے نام پر عموماً اس کی قربانی کر دیتے تھے اور اس کی کھال کو درخت پر لٹکا دیتے تھے۔اس قسم کے بچے کو فرع کہتے تھے۔رجب کے پہلے عشرہ میں ایک قسم کی قربانی کی جاتی تھی۔جس کا نام عتیرہ تھا اسلام نے ان دونوں قربانیوں کو ناجائز قرار دیا اور رجب کی تخصیص باطل کر دی۔

قال: ((لا فرع ولا عتیرۃ)) ❷

آپ ﷺ نے فرمایا:"فرع اور عتیرہ جائز نہیں ہے۔"

بتوں کے نام پر مختلف ناموں سے زندہ جانور چھوڑے جاتے تھے اور ان کو کوئی شخص کسی دوسرے کام میں استعمال نہیں کر سکتا تھا۔چنانچہ قرآن مجید میں اس کے متعلق خاص طور پر ایک آیت نازل ہوئی:

﴿ مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱۰۳)

❶ ابوداود، کتاب الضحایا، باب فی العتیرۃ: ۲۸۳۰۔

❷ ایضاً: ۲۸۳۱۔

”نہ تو خدا نے بحیرہ، نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام بنایا۔“

مردوں کی قبر کے پاس گائے یا بکری ذبح کرتے تھے لیکن اسلام نے مراسم ماتم کی جو اصلاحیں کیں اس کے سلسلہ میں اس کو بھی ناجائز قرار دیا۔ فرمایا:

((لا عقر فی الاسلام)) [1]

”اسلام میں قبر کے پاس جانوروں کا ذبح کرنا جائز نہیں۔“

عرب جاہلیت میں یہ بھی دستور تھا کہ لوگ اپنی فیاضی وسخاوت کی نمائش اس طرح کرتے تھے کہ دو آدمی مقابل ہو کر جانوروں کے ذبح کی بازی لگاتے تھے۔ اپنا ایک اونٹ یہ ذبح کرتا پھر اس کے مقابل میں دوسرا ذبح کرتا۔ اسی طرح یہ مقابلہ قائم رہتا جس کے اونٹ ختم ہو جاتے یا ذبح کرنے سے انکار کر دیتا وہ ہار جاتا۔ اسلام نے اس جان ومال کے اتلاف کو روک دیا۔ [2]

تجرد، ترکِ لذائذ، ریاضات اور تکالیفِ شاقہ عبادت نہیں

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے۔ اسی قدر خدا خوش ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اسی لیے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو آزار زیادہ دیا جائے گا اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی۔ چنانچہ یونانی فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اس اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر لیتا۔ کوئی ہفتہ میں یا چالیس دن میں ایک دفعہ غذا کرتا تھا۔ کوئی سرتاپا برہنہ رہتا اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کا ننگ سمجھتا تھا۔ کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا تھا۔ کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے کو کھڑا رکھتا تھا یا بیٹھا رہتا تھا اور سونے اور لیٹنے سے قطعاً پرہیز کرتا تھا۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا کہ سوکھ جائے، کوئی عمر بھر تاریک تہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا تھا۔ کوئی تجرد اور ترک دنیا کر کے اہل وعیال اور زن وفرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا غلط مدعی بنتا تھا۔ لیکن نبوت محمدی ﷺ نے راز آشکار کیا کہ ان میں سے کوئی چیز عبادت نہیں، نہ ترک لذائذ سے حق کی لذت ملتی ہے، نہ ہماری غمگینی خدا کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی اس غیر معمولی تکلیف سے خدا کو آرام ملتا ہے، نہ زن وفرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے، نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ خدا کا دین اتنا ہی ہے جو بندہ کی استطاعت کے اندر ہے۔ اس نے کہا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

”خدا کسی کو اس کی گنجائش سے زیادہ کی تکلیف (کا حکم) نہیں دیتا۔“

---

[1] ابوداود، کتاب الجنائز، باب کراھیۃ الذبح عند القبر: ۳۲۲۲۔

[2] ابوداود، کتاب الاضاحی، باب ما جاء فی اکل معاقرۃ الاعراب: ۲۸۲۰۔

اسلام میں روزہ ایک ایسی چیز تھی جس کو بعضوں کے لیے غیر معمولی تکلیف کہہ سکتے ہیں۔ اسلام نے اس میں متعدد آسانیاں پیدا کر کے کہا:

﴿ یُرِیْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْیُسْرَ وَلَا یُرِیْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''خدا تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے سختی نہیں۔''

حج بھی سب لوگوں پر مشکل تھا تو ساتھ ہی فرما دیا:

﴿ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَیْهِ سَبِیْلًا ﴾ (۳/ آل عمران:۹۷)

''جس کو (زادراہ اور چلنے کی) استطاعت ہو اسی پر حج فرض ہے۔''

﴿ وَمَا جَعَلَ عَلَیْكُمْ فِی الدِّیْنِ مِنْ حَرَجٍ ﴾ (۲۲/ الحج:۷۸)

''تمہارے لیے دین میں اس (خدا نے) تنگی نہیں کی۔''

آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((ان ھذا الدین یسر ولن یشاد الدین احد الا غلبه)) [1]

''یہ دین آسان ہے جو کوئی شخص دین سے سختی میں مقابلہ کرے گا تو دین اس کو مغلوب کر دے گا۔''

اور فرمایا:

((انما انا بعثت بالملة السمحة او السهلة الحنیفیة البیضاء)) [2]

''میں تو سہل اور آسان روشن حنیفی دین دے کر بھیجا گیا ہوں۔''

مذہب میں رہبانیت اور جوگ کا جو طریقہ ایجاد کیا گیا خواہ وہ کتنی ہی خوش نیتی سے کیا گیا ہو، تاہم وہ دین حق کی اصلی تعلیم نہ تھی، اسی لیے اسلام کے صحیفہ نے اس کو بدعت سے تعبیر کیا اور کہا:

﴿ وَرَهْبَانِیَّةَ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَیْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَایَتِهَا ﴾

(۵۷/ الحدید:۲۷)

''اور عیسائیوں نے ایک رہبانیت کی بدعت نکالی اور ہم نے ان کو خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے سوا اس کا حکم نہیں دیا تھا تو جیسا چاہیے اس رہبانیت کا حق ادا نہ کیا۔''

ان لوگوں سے جنہوں نے اچھے کھانوں اور زیب و زینت کی جائز چیزوں کو بھی اس لیے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا کہ اس سے خدا خوش ہوگا۔ یہ سوال کیا:

﴿ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ﴾ (۷/ الاعراف:۳۲)

''پوچھ اے پیغمبر ﷺ! کہ اس زیب و زینت اور رزق کی اچھی چیزوں کو جن کو خدا نے اپنے

[1] جمع الفوائد طبع میرٹھ، ج ۱، ص:۲ باب الاقتصاد فی الاعمال بحواله صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الدین یسر: ۳۹؛ نسائی: ۵۰۳۷۔ [2] مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۶۶ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔

بندوں کے لیے بنایا، کس نے حرام کیا؟''

اسلام نے اس مسئلہ میں یہاں تک سختی کی کہ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے بعض بی بیوں کی خوشنودی مزاج کے لیے شہد نہ کھانے کی قسم کھالی تھی، اس پر عتاب آیا۔ خدا نے فرمایا:

﴿ يَاأَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴾

(٦٦/ التحریم:١)

''اے پیغمبر ﷺ! خدا نے جس چیز کو تیرے لیے حلال کیا تو اس کو اپنی بیویوں کی خوشی کی خاطر اپنے اوپر حرام کیوں کرتا ہے اور خدا بخشنے والا مہربان ہے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم میں بعض ایسے لوگ تھے جو عیسائی راہبوں کے اثر یا ذاتی میلان طبع کے سبب سے تجرد، ترک لذائذ اور ریاضات شاقہ کی زندگی بسر کرنا چاہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان کو اس سے باز رکھا اور فرمایا کہ ''میں یہ شریعت لے کر نہیں آیا۔'' قدامہ بن مظعون رضی اللہ عنہ اور ان کے ایک رفیق نے دربار رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! ہم میں سے ایک نے عمر بھر مجرد رہنے اور شادی نہ کرنے کا اور دوسرے نے گوشت نہ کھانے کا ارادہ کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں تو دونوں باتیں کرتا ہوں۔'' یہ سن کر دونوں صاحب اپنے ارادہ سے باز رہے۔ [1]

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ نے جو ایک نہایت عابد و زاہد صحابی تھے، یہ عہد کر لیا تھا کہ وہ ہمیشہ دن کو روزے رکھیں گے اور رات بھر عبادت کریں گے۔ آنحضرت ﷺ کو خبر ہوئی تو آپ نے ان سے فرمایا کہ ''اے عبداللہ! تم پر تمہارے جسم کا بھی حق ہے۔ تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے، تمہاری بیوی کا بھی حق ہے، مہینہ میں تین دن روزے رکھ لینا کافی ہے۔ [2] اسی قسم کی نصیحت آپ ﷺ نے ایک دوسرے تقشف پسند صحابی حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ کو فرمائی۔ آپ کو ان کی نسبت معلوم ہوا کہ وہ شب و روز عبادت میں مصروف رہتے ہیں۔ بیوی سے کوئی تعلق نہیں رکھتے، دن کو روزے رکھتے ہیں، رات کو سوتے نہیں۔ آپ نے ان کو بلا کر پوچھا کہ ''کیوں عثمان! تم میرے طریقہ سے ہٹ گئے؟ عرض کی، خدا کی قسم! میں نہیں ہٹا ہوں، میں آپ ہی کے طریقہ کا طلب گار ہوں۔ فرمایا: ''میں سوتا بھی ہوں اور نماز بھی پڑھتا ہوں، روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں اے عثمان! خدا سے ڈرو کہ تمہارے اہل و عیال کا بھی تم پر حق ہے، تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے، تو روزے بھی رکھو، افطار بھی کرو نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔'' [3]

قبیلۂ باہلہ کے ایک صحابی جب اسلام لا کر اپنے قبیلہ میں واپس گئے تو انہوں نے دن کا کھانا چھوڑ دیا

---

[1] فتح الباری، کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح، ج ٩، ص: ١٣٢ طبع دارالسلام۔
[2] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم: ١٩٧٥۔
[3] ابوداود، کتاب التطوع، مایؤمر به من القصد فی الصلوٰۃ: ١٣٦٩۔

اور مسلسل روزے رکھنے لگے۔ایک سال کے بعد جب وہ پھر خدمت اقدس میں حاضر ہوئے تو ان کی صورت اتنی بدل گئی تھی کہ آپ ﷺ ان کو پہچان نہ سکے۔انہوں نے اپنا نام بتایا تو فرمایا: ''تم خوش رو تھے تمہاری صورت کیوں ایسی ہوگئی۔'' عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! جب سے آپ سے مل کر گیا ہوں متصل روزے رکھتا ہوں۔فرمایا: ''تم نے اپنی جان کو کیوں عذاب میں ڈالا رمضان کے علاوہ ہر مہینہ میں ایک روزہ کافی ہے۔'' انہوں نے اس سے زیادہ کی طاقت ظاہر کی تو آپ نے مہینہ میں دو روزوں کی اجازت دی۔انہوں نے اس سے زیادہ کی اجازت چاہی تو آپ نے مہینہ میں تین روزے کر دیے۔انہوں نے اس سے بھی زیادہ اضافہ کی درخواست کی، تو آپ نے ماہ حرام کے روزوں کی اجازت دی۔ [1] ایک دفعہ چند صحابہ رضی اللہ عنہم نے ازواج مطہرات رضی اللہ عنہن کی خدمت میں حاضر ہو کر آپ ﷺ کی دن رات کی عبادت و ریاضت کا حال دریافت کیا وہ سمجھتے تھے کہ رسول خدا ﷺ کو دن رات سوا عبادت کے اور کوئی کام نہ ہوگا۔انہوں نے آپ کی عبادت کا حال سنا تو بولے ہم کو رسول اللہ ﷺ سے کیا نسبت؟ آپ تو معصوم ہیں، ان میں سے ایک صاحب نے کہا، میں تو رات بھر نمازیں پڑھوں گا۔دوسرے صاحب بولے، میں عمر بھر روزے رکھوں گا۔تیسرے صاحب نے اپنا ارادہ یہ ظاہر کیا کہ میں عمر بھر مجرد رہوں گا۔کبھی نکاح نہ کروں گا۔آنحضرت ﷺ ان کی یہ گفتگو سن رہے تھے۔ان کو خطاب کر کے فرمایا: ''خدا کی قسم! میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتا ہوں، تاہم میں روزہ رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں۔راتوں کو نماز بھی پڑھتا ہوں اور سوتا بھی ہوں اور عورتوں سے نکاح بھی کرتا ہوں جو میرے طریقہ پر نہیں چلتا، وہ میری جماعت میں نہیں۔'' [2]

بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے جو افلاس اور غربت کی وجہ سے شادی نہیں کر سکتے تھے اور ضبط نفس پر بھی قادر نہ تھے چاہا کہ اپنا عضو قطع کرا دیں۔انہوں نے آنحضرت ﷺ سے اس رہبانیت کی اجازت چاہی تو آپ نے سخت برہمی ظاہر فرمائی، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وغیرہ صحابہ کہتے ہیں، اگر حضور اس کی اجازت دیتے تو بہت سے لوگ اس پر عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔ [3]

ان واقعات سے اندازہ ہوگا کہ آپ نے کس اہتمام بلیغ کے ساتھ لوگوں کو عبادت کا صحیح مفہوم و مقصود تعلیم فرمایا۔

آپ نے کبھی کبھی بذات خاص کئی کئی دن تک متصل روزے رکھے۔صحابہ نے بھی آپ کی پیروی میں اس قسم کے روزے رکھنے چاہے آپ نے منع فرمایا۔لیکن وہ یہ سمجھے کہ آپ صرف اپنی شفقت کی بنا پر منع فرماتے ہیں۔اس لیے انہوں نے افطار نہ کیا آپ نے دو دن روزے رکھے تھے کہ اتفاق سے چاند نکل آیا

---

[1] ابوداود، کتاب الصیام، باب صوم اشھر الحرم: ۲۴۲۸۔

[2] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب ترغیب النکاح: ۵۰۶۳۔ [3] صحیح بخاری، کتاب النکاح، باب مایکرہ من التبتل والخصاء: ۵۰۷۳؛ مسلم، کتاب النکاح: ۳۴۰۴، ۳۴۰۵۔

آپ نے افطار کرلیا اور فرمایا: ''اگر مہینہ بڑھ سکتا تو میں اتنے روزے رکھتا کہ ان مذہب میں غلو کرنے والوں کا سارا غلو رہ جاتا۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ یا رسول اللہ ﷺ! پھر آپ کیوں کئی کئی دن کے روزے رکھتے ہیں؟ فرمایا: ''تم میں سے کون میری طرح ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا پلاتا رہتا ہے۔'' [1] اسی لیے اسلام میں عام امت کے لیے یہ روزے نہیں ہیں۔

ایک دفعہ ایک مسجد میں آپ کا گزر ہوا دیکھا، تو ایک ستون میں ایک رسی لٹک رہی ہے، دریافت کیا تو لوگوں نے کہا یہ زینب نے باندھی ہے۔ رات کو نماز میں جب وہ کھڑی کھڑی تھک جاتی ہیں تو اسی کے سہارا کھڑی ہوتی ہیں، یہ سن کر آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رسی کھول دو لوگو! تم اسی وقت تک نماز پڑھو، جب تک تم میں نشاط باقی رہے۔ جب کوئی تھک جائے تو بیٹھ جائے۔'' [2]

ایک دفعہ ایک عورت سامنے سے گزری حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا، یہ خولاء ہے، لوگ کہتے ہیں کہ یہ رات بھر نہیں سوتی اور عبادت میں مصروف رہتی ہے۔ فرمایا کہ ''یہ رات بھر نہیں سوتی! لوگو! اسی قدر کرو جتنی طاقت ہے۔'' [3] جو لوگ اپنی قوت اور استطاعت سے زیادہ رات بھر نمازوں میں مشغول رہتے تھے، ان کو مخاطب کر کے فرمایا:

((اکلفوا من العمل ماتطیقون فان اللّٰہ لا یملّ حتّٰی تملوا فان احبّ العمل الی اللّٰہ ادومہ وَاِنْ قلّ)) [4]

''اتنے ہی کام کی تکلیف اٹھاؤ جس کو کر سکو۔ کیونکہ جب تک تم نہ اُکتا جاؤ خدا نہیں اکتاتا، خدا کے نزدیک سب سے پسندیدہ وہی کام ہے جس کو تم ہمیشہ کر سکو اگر چہ وہ تھوڑا ہی ہو۔''

حج میں رہبانیت کی بہت سی باتیں عرب میں جاری تھیں۔ بعض حاجی یہ عہد کر لیتے تھے کہ وہ اس سفر میں زبان سے کچھ نہ بولیں گے یا سواری کی استطاعت کے باوجود وہ پیادہ سفر کریں گے اور کسی سواری پر نہ چڑھیں گے یا اس سفر میں کسی سایہ کے بغیر دھوپ ہی میں چلیں گے۔ بعض لوگ اپنی گنہگاری کے اظہار کے لیے اپنی ناک میں نکیل ڈال کر طواف کرتے تھے اور اس کو ثواب جانتے تھے۔ اسلام نے ان تمام طریقوں کو منسوخ کر دیا کہ خواہ مخواہ کی تکلیف خدا کی خوشنودی کا باعث نہیں۔ حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ کی بہن نے یہ نذر مانی تھی کہ وہ پیدل حج کریں گی۔ عقبہ نے آ کر آنحضرت ﷺ سے فتویٰ پوچھا، آپ نے جواب دیا: ''خدا کو تمہاری بہن کی اس نذر کی حاجت نہیں۔ ان سے کہو کہ وہ سوار ہو کر حج کریں۔'' [5] اسی طرح آپ

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب النهی عن الوصال: ٢٥٦٦۔ [2] بخاری، کتاب التهجد، باب ما یکرہ من التشدید فی العبادة: ١١٥٠؛ مسلم، کتاب صلوٰة المسافرین، باب فضیلة العمل الدائم...: ١٨٣١؛ نسائی، کتاب قیام اللیل: ١٦٤٤۔ [3] بخاری، ایضاً: ١١٥١؛ مسلم، ایضاً: ١٨٣٣، ١٨٣٤؛ نسائی: ١٦٤٣۔
[4] ابوداود، کتاب التطوع، باب ما یؤمر به من القصد: ١٣٦٨۔ [5] ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب من رأی علیه کفارة...: ٣٢٩٣ ومسند ابن جارود کتاب الایمان والنذور۔

نے ایک اور شخص کو دیکھا کہ قربانی کے اونٹ ساتھ ہونے کے باوجود پیدل چل رہا ہے۔ آپ نے اس کو سوار ہونے کا حکم دیا۔ اس نے معذرت کی کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”میں یہ جانتا ہوں کہ یہ قربانی کا جانور ہے، لیکن تم اس پر سوار ہولو۔“ ❶ ایک دفعہ حج کے سفر میں آپ نے ایک بڈھے کو دیکھا جو خود نہیں چل سکتا تھا، اس کے بیٹے اس کو دونوں طرف سے پکڑ کر چلا رہے تھے، آپ ﷺ نے دریافت فرمایا تو معلوم ہوا کہ اس نے پیدل حج کی نیت کی ہے۔ فرمایا: ”خدا کو اس کی حاجت نہیں کہ یہ اپنی جان کو اس طرح عذاب میں ڈالے اس کو سوار کر دو۔“ ❷ ایک دفعہ آپ خطبہ دے رہے تھے دیکھا کہ ایک شخص چلچلاتی ہوئی دھوپ میں ننگے سر کھڑا ہے۔ آپ ﷺ نے پوچھا: یہ کون شخص ہے اور اس کی یہ کیا حالت ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس کا نام ابواسرائیل ہے۔ اس نے نذر مانی ہے کہ وہ کھڑا رہے گا بیٹھے گا نہیں اور نہ سایہ میں آرام کرے گا اور نہ بات کرے گا اور برابر روزے رکھے گا۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”اس سے کہو کہ باتیں کرے، بیٹھے، سایہ میں آرام لے اور اپنا روزہ پورا کرے۔“ ❸ حج میں دیکھا کہ ایک شخص اپنی ناک میں نکیل ڈالے ہوئے ہے اور دوسرا اس کو جانور کی طرح اس کی نکیل پکڑ کر کھینچ رہا ہے، آپ نے جا کر نکیل کاٹ دی اور فرمایا کہ ”اگر ضرورت ہو تو ہاتھ پکڑ کر اس کو طواف کراؤ۔“ ❹

اس قسم کی غیر ضروری ریاضتوں کے متعلق عیسائی راہبوں کی ناگفتہ بہ حالت دیکھ کر آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا تشددوا علی انفسکم فانما هلك من كان قبلكم بتشديد هم علی انفسهم و ستجدون بقايا هم فی الصوامع والديارات)) ❺

”اپنی جانوں پر سختی نہ کرو کہ تم سے پہلی قومیں اپنی جانوں پر سختی کرنے سے تباہ ہوئیں اور ان کی بقیہ نسلیں آج بھی گرجوں اور دیروں میں تم کو ملیں گی۔“

خاتم الانبیاء ﷺ نے عبادت کے ان تمام غلط راہبانہ طریقوں کا اپنے ایک مختصر فقرہ سے ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لا صرورة فی الاسلام)) ❻

”اسلام میں رہبانیت نہیں۔“

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱۶۸۹_۱۶۹۰۔

❷ ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب من رأی کفارة.....: ۳۳۰۱؛ ترمذی، ابواب الایمان والنذور، باب ما جاء فیمن یحلف بالمشی ولا یستطیع: ۱۵۳۷۔

❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان والنذور، باب النذر فیما لا یملك: ۶۷۰۴؛ ابوداود، کتاب الایمان والنذور، باب النذر فی المعصیة: ۳۳۰۰۔ ❹ صحیح بخاری، ایضًا: ۶۷۰۳۔

❺ طبرانی اوسط: ۳۰۷۸؛ ابوداود، کتاب الادب: ۴۹۰۴۔

❻ ابوداود، کتاب المناسك، باب لا صرورة فی الاسلام: ۱۷۲۹۔

عزلت نشینی اور قطع علائق عبادت نہیں

اکثر مذاہب نے دینداری اور خدا پرستی کا کمال یہ سمجھا تھا کہ انسان کسی غار، کھوہ یا جنگل میں بیٹھ جائے اور تمام دنیا سے کنارہ کشی اختیار کر لے۔ اسلام نے اس کو عبادت کا صحیح طریقہ نہیں قرار دیا۔ عبادت درحقیقت خدا اور اس کے بندوں کے حقوق کے ادا کرنے کا نام ہے۔ جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا اس بنا پر وہ شخص جو اپنے تمام ہم جنسوں سے الگ ہو کر ایک گوشہ میں بیٹھ جاتا ہے، وہ درحقیقت ابنائے جنس کے حقوق سے قاصر رہتا ہے۔ اس لیے وہ کسی تعریف کا مستحق نہیں۔ اسلام کا صحیح تخیل یہ ہے کہ انسان تعلقات کے اژدحام اور علائق کے ہجوم میں گرفتار ہو کر ان میں سے ہر ایک کے متعلق جو اس کا فرض ہے اس کو بخوبی ادا کرے، جو شخص ان تعلقات و علائق اور حقوق و فرائض کے ہجوم سے گھبرا کر کسی گوشۂ عافیت کو تلاش کرتا ہے، وہ دنیا کے کارزار کا نامرد اور بزدل سپاہی ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں کو جوانمرد سپاہی دیکھنا چاہتا ہے۔ جو ان سب جھمیلوں کو اٹھا کر بھی خدا کو نہ بھولیں۔ غرض اسلام کے نزدیک عبادت کا مفہوم ترک فرض نہیں، بلکہ ادائے فرض ہے۔ ترک عمل نہیں بلکہ عمل کچھ نہ کرنا نہیں بلکہ کرنا ہے۔ ابھی تم اوپر پڑھ چکے ہو کہ آنحضرت ﷺ نے بعض ان صحابہ کو جو اہل و عیال اور دوست و احباب سب کو چھوڑ کر دن بھر روزہ رکھتے تھے اور راتوں کو عبادت کرتے تھے۔ فرمایا: ''اے فلاں تم ایسا نہ کرو کہ تم پر تمہاری بیوی بچوں کا بھی حق ہے۔ تمہارے مہمان کا بھی حق ہے، تمہاری جان کا بھی حق ہے، تمہاری آنکھ کا بھی حق ہے''۔ اس سے ظاہر ہوا کہ اسلام کی نظر میں عبادت ان حقوق کو بجا لانا ہے۔ ان حقوق کو ترک کر دینا نہیں۔ چنانچہ ایک دفعہ کسی غزوہ میں ایک صحابی کا گزر ایک ایسے مقام پر ہوا۔ جس میں موقع سے ایک غار تھا۔ قریب ہی پانی کا چشمہ بھی تھا۔ آس پاس کچھ جنگل کی بوٹیاں بھی تھیں۔ ان کو اپنی عزلت نشینی کے لیے یہ جگہ بہت پسند آئی۔ خدمت بابرکت میں آ کر عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! مجھ کو ایک غار ہاتھ آ گیا ہے۔ جہاں ضرورت کی سب چیزیں ہیں جی چاہتا ہے کہ وہاں گوشہ گیر ہو کر ترک دنیا کر لوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں یہودیت اور عیسائیت لے کر دنیا میں نہیں آیا ہوں، میں آسان اور سہل اور روشن ابراہیمی مذہب لے کر آیا ہوں۔'' [1]

اسلام سے پہلے آنحضرت ﷺ غار حرا میں کئی کئی دن جا کر رہا کرتے تھے اور عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ لیکن جب سے وحی کا پہلا پیام آپ کے پاس آیا اور دعوت و تبلیغ کا بار آپ کے مبارک کندھوں پر رکھا گیا۔ شب و روز میں رات کی چند ساعتیں اور سال میں رمضان کے چند اخیر دن، گوشۂ عزلت اور زاویہ تنہائی میں بسر ہوتے تھے، ورنہ تمام دن پوری جماعت کے ساتھ مل کر خالق کی عبادت اور پھر مخلوق کی خدمت میں صرف ہوتے تھے اور یہی تمام خلفا اور عام صحابہ رضی اللہ عنہم کا طرز عمل رہا اور یہی اسلام کی عملی اور سیدھی

---

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۲۶۶۔

سادی عبادت تھی۔ [1]

اسلام میں عبادت کا مفہوم

اوپر کی تفصیلات سے یہ واضح ہوا ہوگا کہ اسلام میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں، جو دوسرے مذہبوں میں پایا جاتا ہے۔ عبادت کے لفظی معنی اپنی عاجزی اور درماندگی کا اظہار ہے اور اصطلاح شریعت میں خدائے عزوجل کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانہ کو پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لانا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں عبادت کا مقابل اور بالضد لفظ استکبار اور غرور استعمال ہوا ہے:

﴿ إِنَّ الَّذِينَ يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِي سَيَدْخُلُونَ جَهَنَّمَ دَاخِرِينَ ﴾ (٤٠/ المؤمن: ٦٠)

''جو میری عبادت سے غرور کرتے ہیں وہ جہنم میں جائیں گے۔''

فرشتوں کے متعلق فرمایا:

﴿ وَمَنْ عِنْدَهُ لَا يَسْتَكْبِرُونَ عَنْ عِبَادَتِهِ ﴾ (٢١/ الانبیآء: ١٩)

''جو اس کے پاس ہیں وہ اس کی عبادت سے غرور نہیں کرتے۔''

سعادت منداور باایمان مسلمانوں کے متعلق فرمایا:

﴿ إِنَّمَا يُؤْمِنُ بِآيَاتِنَا الَّذِينَ إِذَا ذُكِّرُوا بِهَا خَرُّوا سُجَّدًا وَسَبَّحُوا بِحَمْدِ رَبِّهِمْ وَهُمْ لَا

---

[1] اسلام میں گوشہ گیری اور عزلت نشینی کی اجازت صرف دو موقعوں پر ہے ایک اس شخص کے لیے جس میں فطرۃً بدی ہے جس کی سرشت دوسروں کو نفع پہنچانا نہیں بلکہ تکلیف دینا ہے۔ آنحضرت ﷺ نے اس کو برائی سے بچنے کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ وہ لوگوں سے قطع تعلق کر لے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بدو نے آکر آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ سب سے بہتر شخص کون ہے؟ فرمایا: ''ایک تو وہ جو اپنی جان و مال کو خدا کی راہ میں قربان کرتا ہے دوسرے وہ جو کسی گھاٹی میں بیٹھ کر اپنے رب کی عبادت کرے اور لوگوں کو اپنے شر سے محفوظ رہنے دے۔'' (صحیح بخاری ، کتاب الادب ، باب العزلة راحة من خلاط السوء: ٦٤٩٤) اس تعلیم نبوی نے انسانوں کی دو قسمیں کر دیں، ایک وہ جن کو خلق اللہ کی ہدایت اور خدمت کی فطری توفیق ملی ہے تو ان پر یہ فرض ہے کہ وہ مجمع اور ہجوم میں رہ کر ان کی بھلائی کا فرض انجام دیں، یہاں تک کہ اس راہ میں ان کی دولت بھی خرچ ہو جائے اور ان کی جان بھی کام آجائے، دوسرے وہ لوگ ہیں جن میں طبعاً مردم آزاری اور دوسروں کو نقصان پہنچانے کا مادہ ہے ان کی اخلاقی اور روحانی اصلاح اسی میں ہے کہ وہ اپنے کو مجمع سے الگ رکھ کر خدا کی عبادت میں اپنا وقت صرف کریں، تاکہ وہ گناہ کے بار سے اور لوگ ان کے آزار سے محفوظ رہیں۔ دوسرا موقع جس میں آنحضرت ﷺ نے عزلت نشینی کی اجازت دی ہے وہ ہے جب مجمع و آبادی یا قوم و ملک میں فتنہ و فساد کا بازار اس طرح گرم ہو کہ وہ اس کی روک تھام سے عاجز اور اس کی اصلاح سے قاصر ہو تو ایسے موقع پر اس کے لیے پسندیدہ یہی ہے کہ وہ جماعت سے ہٹ کر گوشہ گیر ہو جائے، چنانچہ آپ ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''ایک ایسا زمانہ لوگوں پر آئے گا جس میں ایک مسلمان کی بہترین دولت بکری ہوگی جس کو لے کر وہ بارش کی جگہوں اور پہاڑوں کی گھاٹیوں کو تلاش کرے گا، تاکہ وہ اپنے دین و ایمان کو فتنوں سے بچا سکے۔'' (صحیح بخاری ، کتاب الادب ، باب العزلة راحة من خلاط السوء: ٦٤٩٥) گوشہ گیری اور عزلت کے یہ دو موقع بھی درحقیقت نہایت صحیح اصول پر مبنی ہیں، پہلے موقع میں ایسے فرد کا جس سے جماعت اور مخلوق کو فائدہ کے بجائے نقصان کا اندیشہ ہو، الگ رہنا جماعت اور فرد دونوں کے لیے فائدہ مند ہے اور دوسرے موقع پر جب کہ جماعت کا نظام ابتر ہو گیا ہو اور کوئی فرد جو بجائے خود نیک اور سعید ہو، لیکن اپنی کمزوری کے باعث وہ اس جماعت کی اصلاح پر قادر نہ ہو تو اس کے لیے جماعت کے دائرہ اثر سے اپنے کو باہر رکھ کر ہی اپنی نیکی اور سعادت کی تکمیل مناسب ہے۔

﴿يَسْتَكْبِرُوْنَ۝﴾ (۳۲/ السجدة:۱۵)

''میری آیتوں پر وہی ایمان لاتے ہیں، جن کو ان آیتوں سے سمجھایا جائے تو وہ سجدہ میں گر پڑتے ہیں اور اپنے پروردگار کی پاکی بیان کرتے ہیں اور غرور نہیں کرتے۔''

اس قسم کی اور آیتیں بھی قرآن پاک میں ہیں، جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور غرور و استکبار باہم مقابل کے متضاد معنی ہیں۔ اس بنا پر اگر غرور و استکبار کے معنی خدا کے مقابلہ میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو بھی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنی خدا کے آگے اپنی عاجزی و بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے اپنی گردنِ اطاعت کو خم کرنا ہے، اس بنا پر صحیفہ محمدی ﷺ کی زبان میں عبادت بندہ کا ہر ایک وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی انسان بظاہر کیسا ہی اچھے سے اچھا کام کرے۔ لیکن اس سے اس کا مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی اطاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگا۔ اس سے ثابت ہوا کہ کسی اچھے کام کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے پاک اور خالص نیت کا ہونا شرط ہے اور یہی چیز عبادت اور غیر عبادت کے درمیان امرِ فارق ہے۔ قرآن پاک میں یہ نکتہ جابجا ادا ہوا ہے:

﴿وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى۝ الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۝ وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰٓى۝ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْاَعْلٰى۝ وَلَسَوْفَ يَرْضٰى۝﴾ (۹۲/ الليل:۱۷۔۲۱)

''دوزخ سے وہ پرہیزگار بچا لیا جائے گا جو اپنا مال دل کی پاکی حاصل کرنے کو دیتا ہے۔ اس پر کسی کا احسان باقی نہیں۔ جس کا بدلہ اس کو دینا ہو۔ بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات اس کا مقصود ہے وہ خوش ہوگا۔''

﴿وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ اللّٰهِ ط﴾ (۲/ البقرة:۲۷۲)

''صرف خدا کی ذات کی طلب کے لیے جو تم خرچ کرو۔''

﴿اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ﴾ (۷۶/ الدهر:۹)

''ہم تو صرف خدا کے لیے تم کو کھلاتے ہیں۔''

﴿فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ۝ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ۝﴾

(۱۰۷/ الماعون:۴۔۶)

''پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل رہتے ہیں اور جو دکھاوے کے لیے کام کرتے ہیں۔''

قرآن کی ان آیتوں کی جامع و مانع تفسیر آنحضرت ﷺ نے ان مختصر لیکن بلیغ فقروں میں فرما دی ہے کہ

((انما الا عمال بالنیات)) [1]

''اعمال کا ثواب نیت پر موقوف ہے۔''

اسی کی تشریح آپ ﷺ نے ان لوگوں سے کی جو اپنا گھربار چھوڑ کر ہجرت کر کے مدینہ منورہ آ رہے تھے:

((لکل امرء مانوٰی فمن کانت هجرته الی اللّٰه و رسوله فاجره علی اللّٰه و من کانت هجرته الی دنیا یصیبها او امرأة ینکحها فهجرته الی ما هاجر الیه)) [2]

''ہر شخص کو وہی ملے گا، جس کی اس نے نیت کی۔ اگر ہجرت سے مقصود خدا اور رسول تک پہنچنا ہے تو اس کا ثواب خدا دے گا۔ اگر کسی دنیاوی غرض کے لیے ہے یا کسی عورت کے لیے ہے تو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہے، جس کی نیت سے اس نے ہجرت کی۔''

اس تشریح سے یہ ثابت ہوگا کہ آنحضرت ﷺ نے عبادت کا جو مفہوم دنیا کے سامنے پیش کیا ہے، اس میں پہلی چیز دل کی نیت اور اخلاص ہے۔ اس میں کسی خاص کام اور طرز و طریقہ کی تخصیص نہیں ہے۔ بلکہ انسان کا ہر وہ کام جس سے مقصود خدا کی خوشنودی اور اس کے احکام کی اطاعت ہے، عبادت ہے، اگر تم اپنی شہرت کے لیے کسی کو لاکھوں دے ڈالو تو وہ عبادت نہیں، لیکن خدا کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی بجا آوری کے لیے چند کوڑیاں بھی کسی کو دو تو یہ بڑی عبادت ہے۔ تعلیم محمدی ﷺ کی اس نکتہ رسی نے عبادت کو درحقیقت دل کی پاکیزگی، روح کی صفائی اور عمل کے اخلاص کی غرض و غایت بنا دیا ہے اور یہی عبادت سے اسلام کا اصلی مقصود ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۱)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا، تاکہ تم کو تقویٰ حاصل ہو۔''

اس آیت سے ظاہر ہوا کہ عبادت کی غرض و غایت محض حصولِ تقویٰ ہے۔ تقویٰ انسان کے قلب کی وہ کیفیت ہے، جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت ہوتی ہے۔ آپ نے ایک دفعہ سینہ کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ''تقویٰ کی جگہ یہ ہے۔'' [3] اور قرآن نے بھی ﴿تقوی القلوب﴾ [4] ''دلوں کا تقویٰ'' کہہ کر اسی نکتہ کو کھولا ہے۔ اسی کیفیت کا پیدا کرنا اسلام میں عبادت کی اصلی غرض ہے۔ نماز روزہ اور تمام عبادتیں سب اسی کے حصول کی خاطر ہیں۔ اس بنا پر انسان کے وہ تمام مشروع افعال و اعمال جن سے شریعت کی نظر میں یہ غرض حاصل ہو، سب عبادت ہیں۔ اسی مفہوم کو ہم دوسری عبارت میں یوں ادا کر سکتے ہیں کہ پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ عبادت صرف چندان مخصوص اعمال کا نام ہے، جن کو انسان خدا کے لیے

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی، باب کیف کان بدء الوحی:۱۔ [2] ایضاً۔

[3] مسلم، کتاب البر والصلة، باب تحریم ظلم المسلم:۶۵٤۱۔ [4] ۲۲/ الحج: ۳۲۔

کرتا ہے، مثلاً: نماز دعا قربانی لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس تنگ دائرہ کو بیحد وسیع کر دیا۔ اس تعلیم کی رو سے ہر ایک وہ نیک کام جو خاص خدا کے لیے اور اس کی مخلوقات کے فائدہ کے لیے ہو اور جس کو صرف خدا کی خوشنودی کے حصول کے لیے کیا جائے عبادت ہے۔ اسلام میں خدا کے لیے کسی کام کے کرنے کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کام خواہ خدا کی بڑائی اور پاکی کے لیے ہو یا کسی انسان یا حیوان کے فائدہ کے لیے ہو، لیکن اس کام کے کرنے سے اس کام کے کرنے والے کا مقصود نمائش، دکھاوا، حصول شہرت یا دوسروں کو احسان مند بنانا وغیرہ کوئی دنیاوی اور مادی غرض نہ ہو، بلکہ محض خدا کی محبت، خوشنودی اور رضا مندی ہو۔ اس تشریح کی رو سے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے اس کو دفعتہ مٹا دیا۔ دین اور دنیا کی حیثیت اسلام میں دو حریف کی نہیں رہتی، بلکہ دو دوست کی ہو جاتی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کے کام کہتے ہیں، اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں، لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی و نمائش نہ ہو، بلکہ خدا کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں دین کے کام ہیں، اس لیے دین اور دنیا کے کاموں میں کام کا تفرقہ نہیں، بلکہ غرض و غایت اور نیت کا تفرقہ ہے۔ تم نے اوپر پڑھا کہ آنحضرت ﷺ نے ان صحابہ کو جو دن رات خدا کی عبادت میں مصروف رہتے تھے۔ فرمایا کہ ''تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو آرام دو، تمہاری آنکھ کا بھی تم پر حق ہے کہ اس کو کچھ دیر سونے دو۔ تمہاری بیوی کا بھی حق ہے کہ اس کی تسلی کرو اور تمھارے مہمان کا بھی حق ہے۔ [1] کہ اس کی خدمت کے لیے کچھ وقت نکالو۔'' غرض ان حقوق کو بھی ادا کرنا خدا کے احکام کی اطاعت اور اس کی عبادت ہے۔ چنانچہ پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا بھی عبادت ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا لِلّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۷۲)

''اے ایمان والو! ہم نے جو تم کو پاک اور ستھری چیزیں روزی کی ہیں ان کو کھاؤ اور خدا کا شکر ادا کرو، اگر تم اسی کی عبادت کرتے ہو۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ پاک روزی ڈھونڈھنا اور کھانا اور اس پر خدا کا شکر ادا کرنا عبادت ہے، ایک اور آیت میں توکل یعنی کاموں کے لیے کوشش کر کے نتیجہ کو خدا کے سپرد کر دینا بھی عبادت قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ﴾ (۱۱/ ھود:۱۲۳)

''اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ رکھو۔''

اسی طرح مشکلات میں صبر و استقلال بھی عبادت ہے۔ فرمایا:

﴿ فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ ﴾ (۱۹/ مریم:۶۵)

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف:٦١٣٤۔

''اس کی عبادت کر اور صبر کر۔''

کسی شکستہ دل سے اس کی تسکین وتشفی کی بات کرنا اور کسی گناہگار کو معاف کرنا بھی عبادت ہے۔ارشاد ہے:

﴿ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ﴾ (۲/ البقرة:۲۶۳)

''اچھی بات کہنا اور معاف کرنا اس خیرات سے بہتر ہے جس کے پیچھے ستانا ہو۔''

اسی آیت پاک کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے ان الفاظ میں فرمائی ہے:

((كُلّ معروف صدقة)) [1]

''ہر نیکی کا کام خیرات ہے۔''

((تبسمك فى وجه اخيك صدقة))

''تمہارا کسی بھائی کو دیکھ کر مسکرانا بھی خیرات ہے۔''

((واما طة الاذى عن الطريق صدقة)) [2]

''راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کا ہٹا دینا بھی خیرات ہے۔''

غریب اور بیوہ کی مدد بھی عبادت، بلکہ بہت سی عبادتوں سے بڑھ کر ہے،فرمایا:

((الساعى على الارملة والمسكين كالمجاهد فى سبيل الله وكالذى يصوم النهار ويقوم الليل)) [3]

''بیوہ اور غریب کے لیے کوشش کرنے والے کا مرتبہ خدا کی راہ میں جہاد کرنے والے کے برابر ہے اور اس کے برابر ہے جو دن بھر روزہ رکھے اور رات بھر نماز پڑھتا ہو۔''

باہم لوگوں کے درمیان سے بغض وفساد کے اسباب دور کرنا اور محبت پھیلانا ایسی عبادت ہے، جس کا درجہ نماز، روزہ اور زکوۃ سے بڑھ کر ہے، آپ ﷺ نے ایک دن صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا:

((الا اخبر كم بافضل من درجة الصيام والصلوٰة والصدقة))

''کیا میں تم کو روزہ، نماز اور زکوۃ سے بھی بڑھ کر درجہ کی چیز نہ بتاؤں؟''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی، یارسول اللہ! ارشاد فرمائیے۔فرمایا:

((اصلاح ذات البين)) [4]

''وہ آپس کے تعلقات کا درست کرنا ہے۔''

حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ایک دوسرے صحابی حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے ملنے گئے تو دیکھا کہ ان کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب کل معروف صدقة:۶۰۲۱۔ [2] ترمذی، ابواب البر والصلة، باب ما جاء فی صنائع المعروف:۱۹۵۶۔ [3] بخاری، کتاب الادب، باب الساعی علی الارملة:۶۰۰۶۔
[4] سنن ابی داود، کتاب الادب، باب فی اصلاح ذات البین:۴۹۱۹۔

بیوی نہایت معمولی اور میلے کپڑے پہنے ہیں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے وجہ دریافت کی تو بولیں کہ تمہارے بھائی کو دنیا کی خواہش نہیں ہے۔ اس کے بعد مہمان کے لیے کھانا آیا تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نے کہا، میں روزے سے ہوں۔ حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، میں تو تمہارے بغیر نہیں کھاؤں گا۔ آخر انہوں نے افطار کیا رات ہوئی تو ابودرداء رضی اللہ عنہ نماز کو کھڑے ہونے لگے حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے کہا، ابھی سو رہو۔ پچھلی پہر کو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جگایا اور کہا اب نماز پڑھو۔ چنانچہ دونوں نے تہجد کی نماز ادا کی پھر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان سے کہا، اے ابودرداء رضی اللہ عنہ! تمہارے رب کا بھی تم پر حق ہے اور تمہاری جان کا بھی تم پر حق ہے۔ تمہاری بیوی کا بھی تم پر حق ہے تو جس جس کا حق تم پر ہے سب کو ادا کرو"۔ حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ نے آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آ کر حضرت سلمان رضی اللہ عنہ کی یہ تقریر نقل کی۔ آپ نے فرمایا کہ "سلمان نے سچ کہا۔" [1] لوگوں نے آنحضرت ﷺ سے دریافت کیا کہ یارسول اللہ! تمام کاموں میں سب سے بہتر کونسا کام ہے؟ فرمایا: "خدا پر ایمان لانا اور اس کی راہ میں جہاد کرنا۔" لوگوں نے پوچھا کس غلام کے آزاد کرنے میں زیادہ ثواب ہے؟ ارشاد ہوا: "جس کی قیمت زیادہ ہو اور جو اپنے مالک کو زیادہ پسند ہو۔" انہوں نے کہا، اگر یہ کام ہم سے نہ ہو سکے تو؟ فرمایا: "پھر ثواب کا کام یہ ہے کہ کام کرنے والے کی مدد کرو یا جس سے کوئی کام بن نہ آتا ہو۔ اس کا کام کر دو"۔ پھر سوال ہوا کہ اگر یہ بھی نہ ہو سکے؟ فرمایا: "تو پھر یہ کہ لوگوں کے ساتھ کوئی برائی نہ کرو۔ یہ بھی ایک قسم کا صدقہ ہے جو خود تم اپنے اوپر کر سکتے ہو۔" [2]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا: "خدا اپنے بندوں سے کہے گا کہ میں نے تم سے کھانا مانگا تم نے نہ کھلایا۔ وہ عرض کریں گے، خداوند! تو نے کیسے کھانا مانگا تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ فرمائے گا، کیا تم کو معلوم نہیں کہ میرے فلاں بندے نے تم سے کھانا مانگا تم نے کھانا اس کو نہ کھلایا، اگر تم اس کو کھلاتے تو اس کو تم میرے پاس پاتے۔ اے ابن آدم! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو نے مجھے پانی نہ پلایا وہ کہے گا کہ اے پروردگار! میں تجھ کو کیسے پانی پلاؤں تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ وہ فرمائے گا، تم کو معلوم نہ تھا کہ میرے فلاں بندہ نے پیاس میں تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو پانی نہ پلایا۔ اگر پلاتا تو اس کو میرے پاس پاتا۔ اے ابن آدم! میں بیمار رہا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی وہ کہے گا، اے پروردگار! میں کیونکر تیری بیمار پرسی کروں، تو تو خود تمام جہان کا پروردگار ہے۔ فرمائے گا، تجھ کو خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی عیادت نہ کی، اگر کرتا تو تُو اس کو میرے پاس پاتا یا مجھے اس کے پاس پاتا۔" [3] اس مؤثر طریقہ ادا نے خدا شناسی اور خدا آگاہی کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیے اور دکھا دیا کہ خدا کی عبادت اور اس کی خوشنودی کے حصول کے کیا کیا طریقے ہیں؟ حضرت سعد رضی اللہ عنہ جو چاہتے تھے کہ اپنی کل دولت خدا کی راہ میں دے دیں

[1] صحیح بخاری، کتاب الادب، باب صنع الطعام و التکلف للضیف: ٦١٣٩۔

[2] ادب المفرد امام بخاری، باب معونۃ الرجل اخاہ: ٢٢٠۔ [3] ایضًا، باب عیادۃ المرضی: ٥١٧۔

آپ ﷺ نے انہیں بتایا کہ ''اے سعد! جو کچھ اس نیت سے خرچ کرو کہ اس سے خداوند تعالیٰ کی ذات مطلوب ہے۔اس کا تم کو ثواب ملے گا، یہاں تک کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں بھی دو، اس کا بھی ثواب ہے۔'' [1] ابو مسعود انصاری رضی اللہ عنہ سے ارشاد فرمایا: ''مسلمان اگر ثواب کی نیت سے اپنی بیوی کا نفقہ پورا کرے تو وہ بھی صدقہ ہے۔'' [2] غریب و نادار صحابہ رضی اللہ عنہم نے دربار رسالت میں ایک دن شکایت کی کہ یارسول اللہ ﷺ! دولت مند لوگ ثواب میں بڑھ گئے۔ ہماری طرح وہ بھی نماز پڑھتے ہیں، وہ بھی روزے رکھتے ہیں، ان کے علاوہ وہ مالی عبادت بھی بجالاتے ہیں، جو ہم نہیں بجالا سکتے۔ فرمایا: ''کیا تم کو اللہ نے وہ دولت نہیں دی ہے جس کو صدقہ کر سکو، تمہارا سبحان اللہ اور بحمد اللہ کہنا بھی صدقہ ہے۔ یہاں تک کہ جو کوئی اپنی نفسانی خواہش کو جائز طریقہ سے پوری کرتا ہے وہ بھی ثواب کا کام کرتا ہے۔'' لوگوں نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! وہ تو اپنی نفسانی غرض کے لیے یہ کرتا ہے۔ فرمایا کہ ''اگر وہ ناجائز طریقہ سے اپنی ہوس پوری کرتا تو کیا اس کو گناہ نہ ہوتا؟ پھر اسکو جائز طریقہ سے پورا کرنے کا ثواب کیوں نہ ملے گا۔'' [3] محمد رسول اللہ ﷺ کی ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ حسنِ عمل ثواب اور عبادت کے مفہوم میں اسلام نے کتنی وسعت پیدا کی ہے اور کتنی توبرتو انسانی غلطیوں کا ازالہ کیا ہے، اس تشریح کے بعد روشن ہو جائے گا کہ وحی محمدی نے بالکل صحیح طور سے خلقت انسانی کی غرض و غایت عبادت الٰہی قرار دی ہے:

﴿ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ ﴾ (۵۱/ الذاریت: ۵۶)

''میں نے انسانوں کو اور جنوں کو اسی لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔''

اس آیت پاک میں عبادت کا وہ تنگ مفہوم نہیں ہے جو عام طور سے سمجھا جاتا ہے، بلکہ وہ تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں تک وسیع ہے، جن کے کرنے کا مقصد خدا کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار، اس کی اطاعت اور اس کی خوشنودی کی طلب ہو۔ اس وسعت کے اندر انسان کی پوری زندگی کے کام داخل ہیں۔ جن کے بحسن و خوبی انجام دینے کے لیے اس کی خلقت ہوئی ہے۔ یہ روحانیت کا وہ راز ہے جو صرف محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ سے دنیا کو معلوم ہوا۔ عام طور سے مشہور ہے کہ شریعت میں چار عبادتیں فرض ہیں، یعنی نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔ اس سے یہ شبہ نہ ہو کہ ان فرائض کی تخصیص نے عبادت کے وسیع مفہوم کو محدود کر دیا ہے۔ درحقیقت یہ چاروں فریضے عبادت کے سینکڑوں وسیع معنوں اور ان کے جزئیات کے بے پایاں دفتر کو چار مختلف بابوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ جن میں سے ہر ایک فریضہ عبادت اپنے افراد اور جزئیات پر مشتمل اور ان سب کے بیان کا مختصر عنوان باب ہے۔ جس طرح کسی وسیع مضمون کو کسی ایک مختصر سے لفظ یا فقروں میں ادا کر کے اس وسیع مضمون کے سرے پر لکھ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ چاروں فرائض درحقیقت انسان کے تمام نیک اعمال اور اچھے

---

[1] ادب المفرد، باب یوجر فی کل شیء: ۷۵۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب النفقات، باب فضل النفقة علی الاهل: ۵۳۵۱۔ [3] ادب المفرد امام بخاری، باب ان کل معروف صدقة: ۲۲۷۔

کاموں کو چار مختلف عنوانوں میں الگ الگ تقسیم کر دیتے ہیں، اس لیے ان چار فرضوں کو بجا طور سے انسان کے اچھے اعمال اور کاموں کے چار اصول ہم کہہ سکتے ہیں:

① بندوں کے وہ تمام اچھے کام اور نیک اعمال جن کا تعلق تنہا خالق اور مخلوق سے ہے۔ ایک مستقل باب ہے جس کا عنوان نماز ہے۔

② وہ تمام اچھے اور نیک کام جو ہر انسان دوسرے کے فائدہ اور آرام کے لیے کرتا ہے۔ صدقہ اور زکوۃ ہے۔

③ خدا کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنا، کسی اچھے مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت جھیلنا اور نفس کو اس تن پروری اور مادی خواہشوں کو نجاست اور آلودگی سے پاک رکھنا جو کسی اعلیٰ مقصد کی راہ میں حائل ہوتی ہیں۔ روزہ ہے یا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کے تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

④ دنیائے اسلام میں ملت ابراہیمی کی برادری اور اخوت کی مجسم تشکیل و تنظیم، مرکزی رشتہ اتحاد کا قیام اور اس مرکز کی آبادی اور کسب روزی کے لیے ذاتی کوشش اور محنت کے باب کا سرِ عنوان حج ہے۔

غور کر کے دیکھو انسان کے تمام اعمال اور اچھے کام انہی اصول چہارگانہ کے تحت میں داخل ہیں، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ''اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم ہے (۱) توحید و رسالت کا اقرار کرنا (۲) نماز پڑھنا (۳) روزہ رکھنا (۴) زکوۃ دینا (۵) حج کرنا۔'' [1] پہلی چیز میں عقائد کا تمام دفتر سمٹ جاتا ہے اور بقیہ چار چیزیں ایک مسلمان کے تمام نیک اعمال اور اچھے کاموں کو محیط ہیں۔ انہی ستونوں پر اسلام کی وسیع اور عظیم الشان عمارت قائم ہے۔ اس تقریر کا مفہوم یہ نہیں ہے کہ یہ چاروں فرض عبادتیں نماز زکوۃ، روزہ اور حج اصل مطلوب بالذات نہیں ہیں، بلکہ یہ مقصد ہے کہ یہ چاروں عبادتیں اپنے تمام جزئیات باب اور محتویات کے ساتھ فرض ہیں۔ جو شخص صرف ان چاروں فرائض کو جو عنوان باب ہیں ادا کرتا ہے اور اس باب کے نیچے کے مندرجہ جزئیات سے پہلو تہی کرتا ہے، اس کی عبادت ناقص اور اس کی اطاعت نامکمل ہے اور اس کے لیے دین و دنیا کی وہ فلاح و کامیابی جس کا خدائے تعالیٰ نے وعدہ فرمایا ہے، مشکوک ہے۔ یہیں سے یہ شبہ زائل ہوتا ہے کہ ہماری نمازیں ہم کو برائیوں سے کیوں باز نہیں رکھتیں، ہمارے روزے ہم کو تقویٰ کی دولت کیوں نہیں بخشتے، ہماری زکوۃ ہمارے دلوں کو پاک و صاف کیوں نہیں کرتی۔ ہمارا حج ہمارے گناہوں کی مغفرت کا باعث کیوں نہیں بنتا اور قرنِ اول کی طرح ہماری نمازیں ملکوں کو فتح اور ہماری زکوتیں ہمارے قومی افلاس کو دور کیوں نہیں کرتیں اور ہمارے سامنے دین و دنیا کے موعودہ برکات کا انبار کیوں نہیں لگ جاتا، لیکن خدا کا وعدہ یہ ہے:

﴿ وَعَدَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَيَسْتَخْلِفَنَّهُمْ فِي الْاَرْضِ ﴾ (۲۴/ النور:۵۵)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب دعاؤکم ایمانکم: ۸؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان ارکان الاسلام: ۱۱۱ تا ۱۱۴۔

”اللہ نے ان سے جو ایمان رکھتے ہیں اور تمام نیک کام کرتے ہیں، یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ ان کو زمین میں خلیفہ بنائے گا۔“

اسی لیے ایمان کامل اور اعمال نیک کے بغیر اس وعدہ کی ایفا کی توقع رکھنا حماقت ہے۔

اسی طرح ان چاروں جلی عنوانات کے احکام سے قطع نظر کر کے صرف مندرجۂ تحت جزئیات کی تعمیل ممکن ہے کہ دنیائے فانی کی بادشاہی کا اہل بنا دے۔ مگر آسمان کی بادشاہت میں اس کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اسلام اس لیے آیا ہے کہ اپنے پیرووں کے پاؤں کے نیچے دونوں جہانوں کی بادشاہیاں رکھ دے [1] اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب عبادات کے مفہوم کو اس وسعت کے ساتھ سمجھا جائے جو اسلام کا منشا ہے اور اسی وسعت کے ساتھ اس کو ادا کیا جائے جو اسلام کا مطالبہ ہے۔

---

[1] سیرۃ ابن ہشام وفد قریش عند النبی ﷺ ج۱، ص: ۲۵۲ مطبع محمد علی مصر، کلمة واحدة یعطونیها تملکون بها العرب وتدین لکم بها العجم۔

نماز

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ﴾

اسلام کی عبادت کا یہ پہلا رکن ہے جو امیر و غریب، بوڑھے، جوان، عورت، مرد، بیمار و تندرست سب پر یکساں فرض ہے۔ یہی وہ عبادت ہے جو کسی شخص سے کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ اگر اس فرض کو کھڑے ہو کر نہیں ادا کر سکتے تو بیٹھ کر ادا کرو اور اگر اس کی بھی قدرت نہیں ہے تو لیٹ کر کر سکتے ہو۔ اگر منہ سے نہیں بول سکتے تو اشاروں سے ادا کرو۔ [1] اگر کسی سخت مجبوری میں رک کر نہیں پڑھ سکتے تو چلتے ہوئے پڑھو۔ [2] اگر کسی سواری پر ہو تو جس طرف وہ چلے اسی رخ پڑھو۔ [3]

نماز کیا ہے؟

مخلوق کا اپنے دل زبان اور ہاتھ سے اپنے خالق کے سامنے بندگی اور عبودیت کا اظہار، اس رحمٰن و رحیم کی یاد اور اس کے بے انتہا احسانات کا شکریہ، حسن ازل کی حمد و ثنا اور اس کی یکتائی اور بڑائی کا اقرار یہ اپنے محبوب سے مہجور روح کا خطاب ہے، یہ اپنے آقا کے حضور میں جسم و جان کی بندگی ہے۔ یہ ہمارے اندرونی احساسات کا عرض نیاز ہے، یہ ہمارے دل کے ساز کا فطری ترانہ ہے۔ یہ خالق و مخلوق کے درمیان تعلق کی گرہ اور وابستگی کا شیرازہ ہے۔ یہ بے قرار روح کی تسکین، مضطرب قلب کی تشفی اور مایوس دل کی دوا ہے۔ یہ فطرت کی آواز ہے، یہ حساس و اثر پذیر طبیعت کی اندرونی پکار ہے، یہ زندگی کا حاصل اور ہستی کا خلاصہ ہے۔ کسی غیر مرئی طاقت کے آگے سرنگوں ہونا، اس کے حضور میں دعا و فریاد کرنا اور اس سے مشکلوں میں تسلی پانا انسان کی فطرت ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی ساز ہے، جو نا معلوم انگلیوں کے چھونے سے بجتا رہتا ہے، یہی ﴿اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ﴾ کا فطری جواب ہے۔ قرآن نے جا بجا انسانوں کی اس فطری حالت کا نقشہ کھینچا ہے اور پوچھا ہے کہ جب تم پر مصیبتیں آتی ہیں۔ جب سمندر میں طوفان اٹھتا ہے اور تمہارا جہاز بھنور میں پھنستا ہے تو خدا کے سوا کون ہوتا ہے جس کو تم پکارتے ہو؟ غرض انسان کی پیشانی کو خود بخود ایک مسجود کی تلاش رہتی ہے، جس کے سامنے وہ جھکے، اندرون دل کی عرض و نیاز کرے اور اپنی دلی تمناؤں کو اس کے سامنے پیش کرے، غرض عبادت، روح کے اسی فطری مطالبہ کا جواب ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو انسانی روح کے جوش جنون کا علاج ممکن نہیں۔ وحشی سے وحشی مذہب میں بھی عبادت کے کچھ رسوم اس ندائے فطرت کی تسلی کے لئے موجود ہیں، پھر آسمانی مذاہب اس سے کیوں کر خالی ہو سکتے ہیں؟ چنانچہ دنیا کے ہر آسمانی مذہب میں خدا کی یاد کا حکم اور اس یاد کے کچھ مراسم موجود ہیں۔ اسلام میں اگر حمد و تسبیح ہے تو یہودیوں میں مزمور، عیسائیوں میں دعا،

---

[1] نیل الاوطار، ج۲، ص: ۲۸ بروایت موقوف از دارقطنی۔ [2] ابوداود، کتاب صلاة السفر، باب صلوٰة الطالب: ۱۲۴۹۔ [3] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورة البقرة باب قوله: فان خفتم فرجالا......: ۴۵۳۵؛ مسلم، کتاب صلاة المسافرین، باب جواز صلاة النافلة علی الدابة فی السفر حیث توجهت: ۱۶۱۰، ۱۶۱۱۔

پارسیوں میں زمزمہ اور ہندوؤں میں بھجن ہیں اور دن رات میں اس فریضہ کے ادا کرنے کے لئے ہر ایک میں بعض اوقات کا تعین بھی ہے۔ اس بنا پر یہ یقین کرنا چاہیے کہ نماز مذہب کے ان اصول میں سے ہے جن پر تمام دنیا کے مذہب متفق ہیں۔ قرآن پاک کی تعلیم کے مطابق دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی امت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب [1] سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو مکہ کی ویران سرزمین میں آباد کرتے ہیں تو اس کی غرض یہ بتاتے ہیں کہ ﴿ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (۱۴/ابراہیم ۔۶) ''اے ہمارے پروردگار! تا کہ وہ نماز کھڑی کریں۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے اور اپنی نسل کے لئے دعا کرتے ہیں کہ ﴿ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي ﴾ (۱۴/ابراہیم ۔۴۰) ''اے میرے پروردگار! مجھ کو اور میری نسل میں سے لوگوں کو نماز کھڑی کرنے والا بنا۔'' حضرت اسماعیل علیہ السلام کی نسبت قرآن پاک کی شہادت ہے: ﴿ وَكَانَ يَأْمُرُ أَهْلَهُ بِالصَّلٰوةِ ﴾ (۱۹/مریم:۵۵) ''اور وہ اپنے اہل وعیال کو نماز کا حکم دیتے تھے۔'' حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کے ہم قوم طعنہ دیتے ہیں: ﴿ أَصَلٰوتُكَ تَأْمُرُكَ أَن نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ آبَاؤُنَا ﴾ (۱۱/ھود ۔۸۷) ''کیا تمہاری نماز تم کو یہ حکم دیتی ہے کہ ہمارے باپ دادا جس کو پوجتے آئے ہیں اس کو چھوڑ دیں۔'' حضرت لوط علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی نسل کے پیغمبروں کے متعلق قرآن کا بیان ہے: ﴿ وَأَوْحَيْنَا إِلَيْهِمْ فِعْلَ الْخَيْرَاتِ وَإِقَامَ الصَّلٰوةِ ﴾ (۲۱/الانبیاء:۷۳) ''اور ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز کھڑی کرنے کی وحی کی۔'' حضرت لقمان علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہیں: ﴿ يَا بُنَيَّ أَقِمِ الصَّلٰوةَ ﴾ (۳۱/لقمان ۔۱۷) ''اے میرے بیٹے! نماز کھڑی کر۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا گیا: ﴿ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِي ﴾ (۲۰/طٰـــــہ:۱۴) ''اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔'' حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام اور ان کے ساتھ بنی اسرائیل کو حکم ہوتا ہے: ﴿ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (۱۰/یونس:۸۷) ''اور نماز کھڑی کیا کرو۔'' بنی اسرائیل سے وعدہ تھا: ﴿ إِنِّي مَعَكُمْ لَئِنْ أَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ ﴾ (۵/المآئدۃ:۱۲) ''میں تمہارے ساتھ ہوں اگر تم نماز کھڑی کیا کرو۔'' حضرت زکریا علیہ السلام کی نسبت ہے: ﴿ وَهُوَ قَائِمٌ يُصَلِّي فِي الْمِحْرَابِ ﴾ (۳/آل عمران:۳۹) ''وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔'' حضرت

---

[1] قرآن کی تائید تورات اور زبور سے بھی ہوتی ہے، لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کے پرانے صحیفوں میں نماز کے لیے اصطلاحی لفظ خدا کا نام لینا تھا، چنانچہ تورات اور زبور میں نماز کا ذکر اسی نام سے آیا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پاس ایک قربان گاہ بنائی اور خدا کا نام لیا۔ (پیدائش ۱۲۔۶، ص:۱۸) حضرت اسحٰق علیہ السلام نے خدا کا نام لیا (پیدائش ۲۶۔۲۵ ص:۴۱) حضرت داود علیہ السلام نے خدا کا نام لیا (زبور:۱۱۷۔۱۱۶) اور یہ اصطلاح قرآن میں بھی مستعمل ہوئی ہے: ﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ﴾ (۸۷/الاعلیٰ:۱۵) ''اور اپنے رب کا نام لیا، پس نماز پڑھی۔'' اس معنی کی اور بھی آیتیں قرآن پاک میں مذکور ہیں، یہودیوں کے پچھلے صحیفوں سفر دانیال وغیرہ اور عیسائیوں کے تمام صحیفوں میں نماز کے لیے دعا کا لفظ استعمال ہوا ہے جو عربی لفظ صلوٰۃ کے ہم معنی ہے۔ اس لیے انجیل کے اردو مترجموں نے اس کا ترجمہ نماز کیا ہے۔ (متی:۱۷۔۲۱ اور متی:۲۳۔۱۴، ص:۴۲ ص:۴۴)

عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں: ﴿ وَاَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ ﴾ (۱۹/مریم:۳۱) ''اور خدا نے مجھ کو نماز کا حکم دیا ہے۔''

آیات بالا کے علاوہ قرآن سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اسلام کے زمانہ میں بھی عرب میں بعض یہود اور عیسائی نماز پڑھا کرتے تھے:

﴿ مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَآىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَآءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ ﴾

(۳/ آل عمران :۱۱۳)

''اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔''

حدیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں۔ مثلاً: آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جب نماز پڑھو تو تہبند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو۔ یہودیوں کی طرح (ننگے) نہ پڑھو۔'' (ص ۴۷) ''تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر مت ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو۔'' (ص ۴۷) ''نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو۔'' (ص ۱۱۲) ''تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے اور جوتے پہنے رہو۔'' (ص ۱۱۴) ''میری امت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔'' (ص ۸۴) [1] ان حوالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز ادا کرتے تھے۔ عرب میں جو لوگ اپنے کو دین ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے، ان میں بعض تو ایسے تھے کہ وہ کسی خاص طریقہ عبادت سے واقف نہ تھے۔ چنانچہ زید بن عمرو کا واقعہ گزر چکا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ اے خدا! مجھے معلوم نہیں کہ میں تجھ کو کیسے پوجوں؟ یہ کہہ کر ہتھیلی اٹھاتے تھے اور اسی پر سجدہ کر لیتے تھے۔ [2] لیکن ایک دو ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی صورت سے نماز پڑھتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کی ملاقات اور اپنے اسلام لانے کے تین برس پہلے سے رات کو نماز پڑھ لیتے تھے۔ کسی نے ان سے پوچھا کہ اس وقت آپ کس رخ نماز پڑھتے تھے کہنے لگے جدھر رخ کر لیا۔ [3] عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے: [4]

وادرکن اعجازا من اللیل بعدما اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

''اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ کو پالیا اس وقت کے بعد جب کہ عبادت گزار حنیفی نماز پڑھ چکا تھا۔''

اس شعر سے ثابت ہوتا ہے کہ عرب میں مذہب حنیفی کے پیرو پچھلی رات میں نماز ادا کرتے تھے۔

---

[1] کنز العمال جلد چہارم طبع حیدر آباد کے مختلف ابواب سے یہ حدیثیں نقل کی گئی ہیں اور متن میں اس جلد کے صرف صفحات لکھ دیئے گئے ہیں۔

[2] ابن هشام ذکر زید بن عمرو بن نفیل، ص:۱۴۴۔ [3] صحیح مسلم، کتاب فضائل الصحابة، باب من فضائل ابی ذر: ۶۳۵۹۔ [4] لسان العرب لفظ حنف، ج۱، ص:۷۳۹۔

یہود کی بڑی جماعت نے نماز کو بھلا دیا تھا اور ان کی نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی اور نماز سے زیادہ انہوں نے قربانی اور نذرانوں پر زور دیا تھا، جن میں خلوص اور خدا پرستی کا شائبہ تک نہ تھا۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔ [1] دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے، الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے عموماً گم ہو چکی تھی۔ اس کی شکل وصورت اس قدر مسخ ہو گئی تھی کہ آج بھی ان کے صحیفوں میں اس کی اصلی شکل نظر نہیں آتی، نہ اس کے ارکان کا پتہ لگتا ہے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان الہامی صحیفوں کے حامل اور امانت دار اس فرض کو کس طرح ادا کرتے تھے، کن مؤثر دعاؤں کو پڑھتے تھے اور اس کی ادائیگی کے کیا اوقات تھے۔ جو کچھ ان میں رہ گیا تھا وہ صرف عملی رسم ورواج اور بعد کے مذہبی مقتداؤں کی کچھ تجویزیں جن پر مذہبی فریضہ سمجھ کر عمل کیا جا رہا تھا۔ سجدہ جو نماز کی روح اور نیاز الٰہی کی انتہائی منزل ہے۔ اس کو یہود ونصاریٰ دونوں نے مشکل اور باعث تکلیف سمجھ کر چھوڑ دیا تھا اور اس طرح نماز کی ظاہری شکل وصورت بھی انہوں نے بگاڑ دی تھی۔ قرآن مجید میں ان کی اس صورت حال کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَّرِثُوا الْكِتٰبَ يَاْخُذُوْنَ عَرَضَ هٰذَا الْاَدْنٰى وَيَقُوْلُوْنَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۚ وَاِنْ يَّاْتِهِمْ عَرَضٌ مِّثْلُهٗ يَاْخُذُوْهُ ۭ اَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِمْ مِّيْثَاقُ الْكِتٰبِ اَنْ لَّا يَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوْا مَا فِيْهِ ۭ وَالدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ يُمَسِّكُوْنَ بِالْكِتٰبِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۭ اِنَّا لَا نُضِيْعُ اَجْرَ الْمُصْلِحِيْنَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف: ۱۶۹۔۱۷۰)

''ان کے بعد ان کے وہ جانشین ہوئے جن کو خدا کی کتاب باپ دادوں سے وراثت میں ملی وہ صرف اس دنیاوی زندگی کا فائدہ لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو معاف کر دیا جائے گا اور اگر ایسا ہی فائدہ اب بھی ان کے سامنے آئے تو لے لیں (اور مذہب کی پروا نہ کریں) کیا ان سے کتاب کا معاہدہ نہیں لیا گیا کہ وہ خدا کے متعلق سچ کے سوا کچھ اور نہ کہیں گے اور ان لوگوں نے جو کچھ اس (کتاب) میں ہے، اس کو پڑھا اور آخرت کا گھر ان لوگوں کے لئے ہے جو پرہیز گار ہیں کیا تم نہیں سمجھتے؟ اور وہ لوگ جو کتاب کو مضبوطی سے پکڑیں اور انہوں نے نماز کو قائم کیا تو ہم اپنی حالت درست کرنے والوں کی مزدوری کو برباد نہیں کرتے۔''

سورۂ مریم میں تمام انبیائے صادقین کے ذکر کے بعد خدا فرماتا ہے:

[1] دیکھو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم لفظ عبادت (ورشپ)۔

﴿ فَخَلَفَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ خَلْفٌ اَضَاعُوا الصَّلٰوةَ وَاتَّبَعُوا الشَّهَوٰتِ ﴾ (۱۹/ مریم:۵۹)

''ان کے بعد ان کے جانشین ایسے ہوئے جنھوں نے نماز کو برباد کر دیا اور اپنی خواہشوں کی پیروی کی۔''

نماز کے ضائع اور برباد کرنے سے مقصود نماز کو صرف چھوڑ دینا نہیں ہے، بلکہ زیادہ تر اس کی حقیقت اور اس کی روح کو گم کر دینا ہے۔ مسلمان جب اپنی نماز کے لئے حی علی الصلوٰۃ (نماز کے لئے آؤ) کا ترانہ بلند کرتے ہیں تو یہود و نصاریٰ اس کا مذاق اڑاتے تھے، اس پر قرآن نے ان کی نسبت یہ شہادت دی کہ ان کی خدا پرستی کی روح اتنی مردہ ہو چکی ہے کہ جب دوسرے لوگ خدا پرستی کے جذبہ میں سرشار ہوتے ہیں تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں:

﴿ وَاِذَا نَادَيْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْقِلُوْنَ ﴾

(۵/ المآئدہ:۵۸)

''اور جب تم نماز کے لئے آواز دیتے ہو تو وہ اس کو ہنسی کھیل بنا لیتے ہیں، یہ اس لئے کہ وہ عقل سے خالی ہو چکے ہیں۔''

اہل عرب اور قریش جو اپنے آبائی مذہب پر تھے وہ گو نماز کی صورت سے کسی حد تک واقف تھے، مگر بھولے سے بھی اس فرض کو ادا نہیں کرتے تھے۔ بتوں کی پوجا، جنات کی دہائی، فرشتوں کی خوشامد، یہ ان کی عبادت کا خلاصہ تھا۔ حج وطواف یا دوسرے موقعوں پر وہ خدا سے دعائیں مانگتے تو ان میں بھی بتوں کے نام لے لیتے اور شرک کے فقرے ملا دیتے تھے۔ موحدانہ خضوع وخشوع کا ان کی دعاؤں میں شائبہ تک نہ تھا۔ مسلمانوں کو جب بھی نماز پڑھتے دیکھ لیتے تو ان کا منہ چڑھاتے تھے، دِق کرتے تھے، دھکیل دیتے تھے، شور کرتے تھے، سیٹی اور تالی بجاتے تھے، چنانچہ ان کے متعلق قرآن نے کہا:

﴿ وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ اِلَّا مُكَاۗءً وَّتَصْدِيَةً ۭ ﴾ (۸/ الانفال:۳۵)

''اور ان کی نماز خانہ کعبہ کے پاس سیٹی اور تالی بجانا ہے۔''

اگلے مفسروں نے اس آیت پاک کے دو مطلب لئے ہیں، ایک یہ کہ واقعاً وہ جو نماز پڑھتے تھے اس میں سیٹی اور تالی بجایا کرتے تھے۔ دوسرے یہ کہ مسلمان جب نماز پڑھتے تھے تو وہ سیٹی اور تالی بجا کر ان کی نماز خراب کرنی چاہتے تھے اور گویا یہی ان کی نماز تھی۔ [1] پہلے معنی کی بنا پر تو ان کی نماز محض ایک قسم کا کھیل کود اور لہو ولعب تھا اور دوسرے معنی کی رو سے سرے سے ان کے ہاں نماز ہی نہ تھی، بلکہ دوسروں کو نماز سے روکنا یہی ان کی نماز تھی۔ ایک اور آیت میں ہے:

﴿ اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى ۝ عَبْدًا اِذَا صَلّٰى ۝ ﴾ (۹۶/ العلق ۹۔۱۰)

---

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور، ج۹، ص:۱۴۷، ۱۴۸۔

''کیا تو نے اس شخص کو دیکھا جو ایک بندہ کو نماز پڑھنے سے روکتا ہے۔''

ایک بندہ سے مراد خود آنحضرت ﷺ کی ذات ہے آپ جب صحن حرم میں نماز پڑھتے تو قریش جو بے فکری کے ساتھ ادھر ادھر بیٹھے رہتے کبھی آپ کی ہنسی اڑاتے اور کبھی دق کرتے ، [1] کبھی آپ کی گردن میں پھندا ڈال دیتے [2] اور کبھی جب آپ سجدہ میں جاتے پشت مبارک پر نجاست لا کر ڈال دیتے تھے اور جب آنحضرت ﷺ کو اس بار نجاست سے اٹھنے میں تکلیف ہوتی تو ہنستے اور قہقہہ لگاتے تھے۔ [3] اسی لئے آنحضرت ﷺ اسلام کے آغاز میں تو اخفا کے خیال سے اور اس کے بعد ان کے ان حرکات کی وجہ سے عموماً رات کو اور دن کو کسی غار یا درہ میں چھپ کر نماز پڑھا کرتے تھے اور مسلمان بھی عموماً ادھر ادھر چھپ کر ہی نماز پڑھتے تھے یا پھر رات کے سناٹے میں اس فرض کو ادا کرتے تھے۔ مشرکین اگر کبھی اس حالت میں ان کو دیکھ پاتے تو مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے تھے۔ ابن اسحٰق میں ہے کہ صحابہ جب نماز پڑھنا چاہتے تو گھاٹیوں میں چھپ کر نماز پڑھتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت سعد رضی اللہ عنہ بن ابی وقاص چند مسلمانوں کے ساتھ مکہ کی ایک گھاٹی میں نماز پڑھ رہے تھے کہ مشرکین کی ایک جماعت آ گئی، اس نے اس نماز کو بدعت (نیا کام) سمجھا اور مسلمانوں کو برا بھلا کہا اور ان سے لڑنے پر آمادہ ہوگئی۔ [4] الغرض جب محمد رسول اللہ ﷺ نے انسانوں کو خدا کے آگے سر بسجود ہونے کی دعوت دی تو اس وقت تین قسم کے لوگ تھے، ایک وہ (یعنی یہود) جو نماز تو پڑھتے تھے لیکن عموماً اس کی حقیقت سے بیگانہ تھے، ان کی نمازیں بالعموم اخلاص واثر، سکون و دلجمعی، خشوع وخضوع اور خوف وخشیت سے بالکل خالی تھیں، دوسرے وہ (یعنی عیسائی) جو خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کو بھی اپنے سجدہ کے قابل سمجھتے تھے اور ان کی عبادتیں کرتے تھے اور وہ چیز جو توحید کا آئینہ تھی، ان کے ہاں شرک کا مظہر بن گئی تھی۔ تیسرے وہ (یعنی عرب بت پرست) جنہوں نے نہ کبھی خدا کا نام لیا اور نہ کبھی خدا کے آگے سر جھکایا وہ اس روحانی لذت سے آشنا ہی نہ تھے۔

توحید کے بعد اسلام کا پہلا حکم

آنحضرت ﷺ جب مبعوث ہوئے تو توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آپ کو ملا وہ نماز کا تھا۔ ﴿ يَاأَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنْذِرْ ۝ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ ﴾ (٧٤/ المدثر:١-٣) ''اے لحاف میں لپٹے ہوئے اٹھ اور ہشیار کر اور اپنے رب کی بڑائی بول۔'' رب کی بڑائی بولنا یہی نماز کی بنیاد ہے۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ یہ نماز تکمیل کے مدارج طے کرتے ہوئی اس نقطہ پر پہنچ گئی جو روحانی معراج کی آخری سرحد ہے۔ آپ نے سونے والوں کو جگایا، بھولے ہوؤں کو بتایا، انجانوں کو سکھایا اور خدا اور بندے کے ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑا، گوشت پوست

[1] ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکور، ج٣٠، ص:١٤٠، ١٤١۔ [2] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ: ٣٦٧٨۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الصلوٰۃ، باب المراۃ تطرح عن المصلی شیئًا من الاذی: ٥٢٠۔

[4] سیرۃ ابن ہشام (ابتداء ما افترض اللّٰہ سبحانہ من الصلوٰۃ)، ج١، ص:١٦٢۔

کے، سونے چاندی کے اور اینٹ اور پتھر کے ان بتوں کو جو خدا کی جگہ کھڑے تھے دھکیل کر نیچے گرا دیا۔ صرف ایک خدا کی نماز دنیا میں باقی رکھی اور خدا کے سوا ہر ایک کے سجدہ کو حرام کر دیا، اس طرح آپ کی تعلیم کے ذریعہ سے نماز کی اصل حقیقت دنیا میں ظاہر ہوئی۔ آپ نے اہل عرب اور دنیا کی بت پرست قوموں کو نماز کا طریقہ بتایا، اس کے ارکان و آداب سکھائے، مؤثر دعائیں تعلیم کیں، عیسائیوں کو مخلصانہ عبادت اور ایک خدا کی پرستش کا سبق دیا۔ یہودیوں کو نماز کے خضوع و خشوع راز و نیاز اور اخلاص واثر سے باخبر کیا اور انبیائے عالم کی نماز کو اپنے عمل کے ذریعہ سے شکل و صورت اور روح و حقیقت دونوں کے ساتھ ناقابل تحریف اور غیر متغیر وجود بخش دیا۔ حکم ہوتا ہے کہ

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

”نمازوں کی نگہداشت کرو۔“

یہ نماز کی ظاہری اور معنوی دونوں حیثیتوں سے نگہداشت کا حکم ہے اور مسلمان کی پہچان یہ مقرر ہوئی کہ

﴿ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ (٦/ الانعام:٩٢)

”اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔“

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳)

”جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔“

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹)

”اور (کامیاب ہیں) وہ جو اپنی نمازوں کی نگہداشت کرتے ہیں۔“

خود آنحضرت ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ خود بھی نماز پڑھو اور اپنے اہل و عیال کو بھی اس کا حکم دو اور اس نماز پر جس کا مکہ کے قیام کے زمانہ میں ادا کرنا بہت مشکل ہے، پوری پابندی اور مضبوطی کے ساتھ جمے رہو۔ فرمایا:

﴿ وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۳۲)

”اور اپنے گھر والوں پر نماز کی تاکید رکھو اور خود بھی اس کے اوپر جمے (پابند) رہو۔“

نماز کیسی ہونی چاہیے؟ فرمایا:

﴿ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

”اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے رہو۔“

تعریف کی گئی کہ

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ فِيْ صَلَاتِهِمْ خٰشِعُوْنَ ۝ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۲)

''کامیاب ہیں وہ مومن جو اپنی نماز میں خشوع کرتے ہیں۔''

حکم ہوا کہ

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵)

''تم اپنے پروردگار کو گڑگڑا کر اور چپکے چپکے پکارو۔''

﴿ وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ ﴾ (۷/ الاعراف:۵۶)

''اور اس (خدا) کو ڈر اور امید کے ساتھ پکارو۔''

﴿ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ڛ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۹)

''اور خدا کو پکارو اس حال میں کہ تم دین کو اسی کے لئے خالص کرنے والے ہو۔''

اس اجمال کے بعد نماز کے تمام مباحث پر ایک تفصیلی نگاہ کی ضرورت ہے۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام سے پہلے بھی دنیا میں کوئی ایسا مذہب نہیں آیا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو، لیکن چونکہ وہ مذہب خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے، اس لئے ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی۔ چنانچہ اسلام سے پہلے کی دنیا کے کسی مذہب میں آج نماز یعنی خدا کے سامنے اقرارِ عبودیت اور اس کی حمد و ثنا کو واضح معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں۔ یعنی کسی مذہب کے پیرووں بلکہ معلموں کے عمل سے بھی اس کی یہ صورت نمایاں نہیں ہوتی۔ ورنہ جیسا کہ گزر چکا قرآن کے رو سے تو دنیا میں کوئی ایسا پیغمبر نہیں آیا، جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور اس نے اپنی امت کو اس کی تاکید نہ کی ہو، مگر موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا وہ کہیں نمایاں واضح اور مؤکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ خاتم الانبیاء اور قرآن پاک خاتم الکتب ہو کر آیا ہے، اس لئے اس فریضہ الٰہی کو دینِ کامل میں ایسی منظم، واضح مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔ یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے، کسی حالت میں بھی سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن پاک میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی اور کاہلی نفاق کی علامت [1] اور اس کا ترک کفر کی نشانی [2] بتائی گئی ہے، یہ وہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا اور اس کی تکمیل اس شبستان قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔ [3]

---

[1] منافقین کی صفت میں ہے: ﴿ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ ﴾ (۴/ النسآء:۱۴۲) ''جب وہ نماز کو اٹھتے ہیں تو سست و کاہل ہو کر اٹھتے ہیں۔'' ﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ ﴾ (۱۰۷/ الماعون:۴۔۵) ''افسوس ہے ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت کرتے ہیں۔'' [2] کفار کے بارے میں ہے: ﴿ لَمْ نَكُ مِنَ الْمُصَلِّيْنَ ۙ ﴾ (۷۴/ المدثر:۴۳) ''ہم نمازیوں میں نہ تھے۔'' یہ وہ اس وقت کہیں گے جب ان سے پوچھا جائیگا کہ تم دوزخ میں کیوں ہو۔ [3] کتب صحاح واقعات معراج واسراء وصحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب کیف فرضت الصلوۃ فی الاسراء: ۳۴۹۔

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے۔ چنانچہ سورۂ روم (رکوع ۴) میں پہلا حکم یہ دیا گیا: ﴿ فَأَقِمْ وَجْهَكَ لِلدِّينِ حَنِيفًا ۚ فِطْرَتَ اللَّهِ الَّتِي فَطَرَ النَّاسَ عَلَيْهَا ۚ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۰) ''اپنا منہ ہر طرف سے پھیر کر دین توحید پر سیدھا رکھو وہی اللہ کی فطرت ہے، جس پر اس نے لوگوں کو بنایا ہے۔'' اس کے بعد دوسرا حکم اسی سے ملحق یہ ہے:

﴿ وَاتَّقُوهُ وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴾ (۳۰/ الروم: ۳۱)

''اور نماز کو کھڑا رکھو اور مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔''

اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہو جانے کا اندیشہ ہے، کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعہ سے بڑھاتے نہ رہیں، خود اس کیفیت کے زائل ہو جانے کا خوف لگا رہتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ آنحضرت ﷺ نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق شرک اور کفر کا ڈر ظاہر فرماتے رہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز دین کا ستون ہے۔'' جس طرح ستون گر جانے سے عمارت گر جاتی ہے، اسی طرح نماز کے ترک کرنے سے دل کی دینداری بھی رخصت ہو جاتی ہے۔ طائف کے وفد نے جب مدینہ منورہ آ کر صلح کی بات چیت شروع کی تو نماز، جہاد اور صدقات سے مستثنیٰ ہونا چاہا آپ نے دو پچھلی باتوں سے مستثنیٰ کر دیا۔ لیکن نماز کے متعلق فرمایا: ''جس دین میں خدا کے سامنے جھکنا نہ ہو اس میں کوئی بھلائی نہیں۔'' آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا ہے کہ ''نماز دل کی روشنی ہے۔'' اپنی نسبت فرمایا ہے: ''نماز میری آنکھ کی ٹھنڈک ہے۔'' ایک تمثیل میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''انسان آگ میں جلتا رہتا ہے اور نماز سے وہ آگ بجھ جاتی ہے'' یہ محبوبِ ازل کے ہجر و فراق کی آگ ہے اور نماز آبِ زلال ہے جو اس آگ کو سرد کر دیتا ہے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کفر اور ایمان کے درمیان امتیاز نماز ہی سے ہے۔'' کیونکہ ایمان اور کفر دونوں انسان کی اندرونی حالت سے تعلق رکھتے ہیں، جس کا اظہار اس کے اعمال ہی سے ہو سکتا ہے۔ مسلمان کا وہ عمل جس کے دیکھنے کا دن میں متعدد دفعہ لوگوں کو موقع ملے نماز ہی ہے عین اس وقت جب جنابِ رسالت پناہ کی زندگی کے اخیر لمحے تھے اور فرضِ نبوت کے آخری حروف زبان مبارک سے ادا ہو رہے تھے، آپ ﷺ فرما رہے تھے: ''نماز اور غلام۔'' [1]

نماز کی حقیقت

نماز کے لیے اصل عربی لفظ صلوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ کے معنی عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے ہیں، اس لیے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے

[1] یہ تمام حدیثیں کنز العمال، (کتاب الصلوٰۃ، ج ٤) میں مختلف کتب حدیث کے حوالوں سے درج ہیں۔

بھی نماز کی یہی تشریح فرمائی ہے۔معاویہ بن حکم سلمی ایک نومسلم صحابی تھے،ان کو اسلام کے جو آداب بتائے گئے ان میں ایک چیز یہ بھی تھی کہ ''جب کبھی کسی مسلمان کو چھینک آئے اور وہ الحمدللہ کہے تو اس کے جواب میں تم یرحمک اللہ کہو۔'' اتفاق سے ایک دفعہ نماز باجماعت ہورہی تھی۔معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اس میں شریک تھے،ان کے پاس کسی مسلمان کو چھینک آئی،انہوں نے نماز کی حالت میں یرحمک اللہ کہہ دیا۔صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کو گھورنا شروع کیا۔معاویہ نے نماز ہی میں کہا تم سب مجھے کیوں گھور رہے ہو؟ صحابہ رضی اللہ عنہم نے زانو پر ہاتھ مارے اور سبحان اللہ کہا،اب وہ سمجھے کہ بولنے سے منع کیا جارہا ہے۔نماز ہوچکی تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ ''نماز میں کون باتیں کرتا تھا۔'' لوگوں نے معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ کیا۔آپ نے ان کو پاس بلا کر نہایت نرمی سے سمجھایا کہ ''نماز قرآن پڑھنے اور اللہ کو یاد کرنے اور اس کی پاکی اور بڑائی بیان کرنے کا نام ہے،اس میں انسان کو باتیں کرنا مناسب نہیں۔'' [1] حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک دفعہ فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ)) ''دعا عبادت کا مغز ہے۔'' اور حضرت نعمان بن بشیر انصاری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ((اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ)) ''دعا ہی عبادت ہے۔'' اس کے بعد آپ نے یہ کہہ کر کہ تمہارا پروردگار فرماتا ہے اس تفسیر کی تائید میں یہ آیت پڑھی۔ [2]

جس میں دعا ہی کا نام عبادت بتایا گیا ہے:

﴿ ادْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ ۭ اِنَّ الَّذِيْنَ يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِيْ سَيَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دٰخِرِيْنَ ۝ ﴾

(٤٠/ المؤمن:٦٠)

''مجھ سے دعا مانگو میں قبول کروں گا،جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں،وہ عنقریب جہنم میں جائیں گے۔''

مستدرک حاکم (کتاب الدعاء) میں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بہترین عبادت دعا ہے۔'' اس کے بعد آیت مذکور تلاوت فرمائی۔قرآن پاک میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے۔یعنی خدا کی یاد فرمایا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ۝ ﴾ (٢٠/ طٰهٰ:١٤)

''اور میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔''

کامیابی اسی کے لیے ہے جو خدا کو یاد کرکے نماز ادا کرتا ہے:

---

[1] سنن ابی داود، کتاب الصلوة، باب تشمیت العاطس فی الصلوة: ٩٣٠، ٩٣١ یہ دو روایتیں ہیں ہم نے ان دونوں کو جمع کرلیا ہے۔ [2] یہ دونوں حدیثیں جامع ترمذی، کتاب الدعوات، باب الدعاء مخ العبادة: ٣٣٧١، ٣٣٧٢ میں ہیں؛ ابوداود، کتاب الوتر، باب الدعاء: ١٤٧٩؛ مستدرك حاكم، كتاب الدعاء، ج١، ص: ٤٩١۔

﴿قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۴۔۱۵)

''کامیاب وہ ہوا جس نے پاکی حاصل کی اور خدا کا نام یاد کیا پس نماز پڑھی۔''

انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دلی بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون واطمینان کی راحت اس کو صرف اسی ایک قادر مطلق کی پکار، دعا اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو ان الفاظ میں ادا کیا:

﴿اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَىِٕنُّ الْقُلُوْبُ ۝﴾ (۱۳/ الرعد:۲۸)

''ہاں! خدا ہی کی یاد سے دل تسکین پاتے ہیں۔''

یہی وجہ ہے کہ مصیبتوں کے ہجوم اور تکلیفوں کی شدت کے وقت ثبات قدم اور دعا ہی چارہ کار بنتے ہیں

﴿وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''ثابت قدمی اور نماز (یا دعا) کے ذریعہ سے اپنی مصیبتوں میں مدد چاہو۔''

زمین سے لے کر آسمان تک کائنات کا ذرہ ذرہ خدائے قادر وتوانا کے سامنے سرنگوں ہے، آسمان، زمین، چاند، ستارے، دریا، پہاڑ، جنگل، جھاڑ، چرند، پرند سب اس کے آگے سر بسجود ہیں اور اس کے مقرر کردہ احکام وقوانین کی بے چون وچرا اطاعت کر رہے ہیں، یہی ان کی تسبیح ونماز ہے:

﴿وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ وَلٰكِنْ لَّا تَفْقَهُوْنَ تَسْبِيْحَهُمْ ۭ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۴۴)

''اور (دنیا میں) کوئی چیز نہیں مگر یہ کہ وہ اس (خدا) کی حمد کی تسبیح پڑھتی ہے، البتہ تم ان کی تسبیح سمجھتے نہیں ہو۔''

﴿اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسْجُدُ لَهٗ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ وَالشَّمْسُ وَالْقَمَرُ وَالنُّجُوْمُ وَالْجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَاۗبُّ وَكَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ۭ وَكَثِيْرٌ حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ ۭ﴾

(۲۲/ الحج:۱۸)

''کیا تو نہیں دیکھتا کہ جو آسمانوں میں ہے اور جو زمین میں ہے اور سورج چاند تارے پہاڑ درخت جانور اور بہت سے آدمی اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہت سے آدمیوں پر اس کا عذاب ثابت ہو چکا (یوں کہ وہ اس کو سجدہ نہیں کرتے تھے)۔''

غور کرو! کائنات کا ذرہ ذرہ بلا استثنا خدا کے سامنے سرنگوں ہے۔ لیکن استثنا ہے تو صرف انسان میں کہ بہتیرے اس کو سجدہ کرتے ہیں اور بہتیرے اس سے روگرداں ہیں، اسی لیے وہ عذاب کے مستحق ہو چکے۔ انسان کے علاوہ تمام مخلوقات بلا استثنا اطاعت گزار ہے، کیونکہ وہ ذاتی ارادہ اور اختیار سے سرفراز نہیں، خدا کے حکم

کے مطابق وہ ازل سے اپنے کام میں مصروف ہے اور قیامت تک مصروف رہے گی، لیکن انسان ذاتی ارادہ و اختیار کا ایک ذرہ پاکر سرکشی اور بغاوت پر آمادہ ہے، اسلام کی نماز انہیں سرکش اور باغی انسانوں کو دوسری مطیع وفرمانبردار مخلوقات کی طرح اطاعت وانقیاد اور بندگی وسرافگندگی کی دعوت دیتی ہے۔ جب دنیا کی تمام مخلوقات اپنی اپنی طرز اور اپنی اپنی بولیوں میں خدا کی حمد وثنا اور تسبیح وتہلیل میں مصروف ہے تو انسان کیوں نہ اپنے خدا کی تقدیس کا ترانہ گا کر اپنی اطاعت کا ثبوت پیش کرے اور یہی نماز ہے۔

نماز کی روحانی غرض وغایت

نماز کی روحانی غرض وغایت یہ ہے کہ اس خالقِ کل، رازقِ عالم، مالک الملک، منعم اعظم کی بے غایت بخششوں اور بے پایاں احسانوں کا شکر ہم اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تاکہ نفس وروح اور دل ودماغ پر اس کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی وبے چارگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اس کی محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے، اس کے حاضر وناظر ہونے کا تصور ناقابل زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ ونیت اور ہر جسمانی فعل وعمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھا ہوا دیکھیں، جس سے اپنے برے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں اور بالآخران سے بالکل باز آئیں۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں ہے کہ ایک روز آنحضرت ﷺ صحابہ رضی اللہ عنہم کے مجمع میں تشریف فرما تھے، ایک شخص نے سائل کی صورت میں آکر ایمان اسلام کی حقیقت دریافت کی۔ آپ نے اس کی تشریح فرمائی پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ احسان کیا ہے؟ فرمایا: ''یہ کہ تم اپنے پروردگار کی عبادت اس طرح کرو گویا تم اس کو دیکھ رہے ہو، کیوں کہ اگر تم اس کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو دیکھ رہا ہے۔'' اسی طرح ایک اور شخص کو نماز کے آداب کی تعلیم دیتے ہوئے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کیوں کہ اس وقت وہ اپنے رب کے ساتھ راز ونیاز کی باتوں میں مصروف ہوتا ہے۔'' [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک رات جب آپ اعتکاف میں بیٹھے تھے اور شاید لوگ الگ الگ تراویح کی نماز پڑھ رہے تھے تو آپ ﷺ نے سر مبارک باہر نکال کر فرمایا: ''لوگو! نمازی جب نماز پڑھتا ہے تو اپنے رب سے سرگوشی کرتا ہے، اس کو جاننا چاہیے کہ وہ کیا عرض معروض کر رہا ہے، نماز میں ایک دوسرے کی آواز کو مت دباؤ۔'' [2]
ان تعلیمات سے اندازہ ہوگا کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل ودماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق وعادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی:

[1] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب حك البزاق بالید من المسجد: ٤٠٥؛ مسلم، باب المساجد، باب النھی عن البصاق فی المسجد: ١٢٣٠؛ مسند احمد، ج ٢، ص: ٣٤۔

[2] مسند احمد، ج ٢، ص: ٣٦، ٦٧، ١٢٩۔

﴿ وَأَقِمِ الصَّلَوٰةَ ۖ إِنَّ الصَّلَوٰةَ تَنْهَىٰ عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنكَرِ ۗ وَلَذِكْرُ اللَّهِ أَكْبَرُ ۗ ﴾

(۲۹/ العنکبوت:۴۵)

''اور نماز کھڑی کیا کر کہ نماز بے حیائی اور برائی کی باتوں سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے۔''

اس آیت میں نماز کی دو حکمتیں بیان کی گئی ہیں ایک تو یہ کہ نماز برائیوں اور بے حیائیوں سے روکتی ہے اور دوسری اس سے بڑھ کر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں، بے حیائی اور برائی کی باتوں سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزلِ مقصود اور حقیقی کامیابی ہے، چنانچہ فرمایا:

﴿ قَدْ أَفْلَحَ مَن تَزَكَّىٰ ۝ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهِ فَصَلَّىٰ ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ:۱۴۔۱۵)

''کامیاب ہوا وہ جس نے صفائی حاصل کی اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ انسان کی فلاح اور پاکیزگی کے حصول کی تدبیر یہ ہے کہ وہ اپنے پروردگار کا نام لے یعنی نماز پڑھے اس سے زیادہ واضح یہ آیت پاک ہے:

﴿ إِنَّمَا تُنذِرُ الَّذِينَ يَخْشَوْنَ رَبَّهُم بِالْغَيْبِ وَأَقَامُوا الصَّلَوٰةَ ۚ وَمَن تَزَكَّىٰ فَإِنَّمَا يَتَزَكَّىٰ لِنَفْسِهِ ۚ وَإِلَى اللَّهِ الْمَصِيرُ ۝ ﴾ (۳۵/ فاطر:۱۸)

''تو انہیں کو تو ہشیار کر سکتا ہے جو بن دیکھے اپنے پروردگار سے ڈرتے ہیں اور نماز کھڑی کیا کرتے ہیں اور جو تزکیہ اور دل کی صفائی حاصل کرتا ہے وہ اپنے ہی لیے حاصل کرتا ہے اور (آخر) خدا ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ نماز انسان کو اس کی اخلاقی کمزوریوں سے بچاتی، نفسانی برائیوں سے ہٹاتی اور اس کی روحانی ترقیوں کے درجہ کو بلند کرتی ہے۔ فرمایا:

﴿ إِنَّ الْإِنسَانَ خُلِقَ هَلُوعًا ۝ إِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوعًا ۝ وَإِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوعًا ۝ إِلَّا الْمُصَلِّينَ ۝ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۰۔۲۳)

''بے شک انسان بے صبرا بنا ہے جب اس پر مصیبت آئے تو گھبرایا اور جب کوئی دولت ملے تو بخیل لیکن وہ نمازی (ان باتوں سے پاک ہیں) جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔''

آپ نے دیکھا کہ پابندی سے نماز ادا کرنے والے کے لیے قرآن نے کن اخلاقی برکتوں کی بشارت سنائی ہے۔

نماز کے انہیں ثمرات اور برکات کی بنا پر ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے ایک تمثیل میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے

فرمایا کہ ''اگر کسی شخص کے گھر کے سامنے ایک صاف و شفاف نہر بہتی ہو جس میں وہ دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس پر میل رہ سکتا ہے؟'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی! نہیں یا رسول اللہ ﷺ! ارشاد ہوا کہ ''نماز بھی اسی طرح گناہوں کو دھو دیتی ہے جس طرح پانی میل کو۔'' [1] ایک دفعہ ایک بدوی مسلمان نے آ کر اپنے ایک گناہ کی معافی کی تدبیر پوچھی اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [2]

﴿ وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّـَٔاتِ ۚ ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِينَ ﴾ (۱۱/ هود: ۱۱٤)

''اور دن کے دونوں کناروں پر اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں نماز کھڑی کیا کرو، بے شک نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں، یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے۔''

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ مذہب اپنے پیروؤں میں جس قسم کے جذبات اور محرکات پیدا کرنا چاہتا ہے ان کا اصلی سرچشمہ یہی نماز ہے جو اپنے صحیح آداب و شرائط کے ساتھ بجا لائی گئی ہو یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے نماز کو دین کی عمارت کا اصلی ستون قرار دیا ہے جس کے گر جانے سے پوری عمارت کا گر جانا یقینی ہے۔

نماز کے لیے کچھ آداب و شرائط کی ضرورت

جس طرح مادی عالم کے کچھ قانون ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے ہمارے اعمال کے صحیح نتائج پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی دنیا جس کو مذہب ''قلب کا عالم'' اور فلسفہ نفسیات یا ''دماغی کیفیات'' کہتا ہے اس کے لیے بھی کچھ قانون اور اسباب ہیں جن کی پابندی اور رعایت سے قلب و دماغ اور نفس و روح کے مطلوبہ اعمال و افعال سامنے آتے اور ان کے صحیح نتیجے مرتب ہوتے ہیں۔ سائیکالوجی (علم نفسیات) کے انکشاف اور ترقی نے اب اس گرہ کو بالکل کھول دیا ہے اس نے بتایا ہے کہ ہم اپنے یا دوسروں کے اندر جس قسم کے جذبات اور ولولے پیدا کرنا چاہیں اور ان کے مناسب شکل و صورت اور ماحول (گرد و پیش) نہ اختیار کریں تو ہم کو ان کے پیدا کرنے میں کامیابی نہیں ہوسکتی۔ ہمارے تمام تمدنی اجتماعی اور معاشرتی قوانین اسی اصول کے تحت میں وضع ہوئے ہیں اور اسی اصول کی بنا پر ہر قسم کے مذہبی، سیاسی اور اجتماعی مقاصد کے حصول کے لیے رواجی رسوم و آداب اور قواعد و ضوابط مقرر ہیں۔ معبدوں، ہیکلوں اور گرجوں میں جہاں مذہبی عظمت و تقدس پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے، پجاریوں اور کاہنوں کے خاص لباس، خاص رسوم و آداب، سکون و خاموشی، ادب و لحاظ، گھنٹوں کی پرشکوہ آواز اور نشست و برخاست کے خاص طریقے ضروری سمجھے گئے ہیں شاہانہ رعب

[1] یہ حدیث مختلف کتابوں میں مختلف روایتوں کے ساتھ آئی ہے کنز العمال، (ج٤، ص: ٦٧ و ٦٨) میں حاکم، ١/ ٢٠٠؛ احمد، ١/ ١٧٧؛ ابن خزیمة: ٥٢٨ وطبرانی کبیر: ٧٥٨٤ اور بیهقی کے حوالوں سے یہ تمام روایتیں یکجا مذکور ہیں۔

[2] صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوة، باب الصلوة کفارة: ٥٢٦ وکتاب التفسیر: ٤٦٨٧۔

وداب کے اثرات پیدا کرنے کے لیے شاہی جلوسوں اور سلطانی درباروں میں فوجوں کے پرے قوی ہیکل چوبدار عصا بردار نقیب وچاؤش خدام کی زرق برق پوشاکیں، ننگی تلواریں، بلند نیزے، تخت وتاج، علم و پرچم، ماہی مراتب، نوبت ونقارہ اور دمبدم دورباش اور نگاہ روبرو کی پر رعب صدائیں ضروری ہیں، کسی تعلیمی یا علمی میلان پیدا کرنے کے لیے فضا کا سکون وخاموشی، مقام کی سادگی وصفائی، شوروغوغا اور شہر وبازار سے دوری، ضروری چیزیں ہیں، بزمِ عروسی کے لیے رنگ وبو، نوروسرور، گانا بجانا اور عیش ونشاط کا اظہار طبعی ہے۔ انہی طبعی ونفسی اصول کی بنا پر مذہبی اعمال میں بھی ان محرکات وآداب وقوانین کی رعایت رکھی گئی ہے۔ نماز سے مقصود دل کے خضوع وخشوع، توبہ وانابت، پشیمانی وشرمندگی، اطاعت وبندگی اور خدا کی عظمت وکبریائی اور اپنی عاجزی ودرماندگی کا اظہار نیز دل ودماغ اور نفس وروح میں پاکی صفائی اور طہارت پیدا کرنا ہے اس بنا پر نماز کے لیے بھی ایسے آداب وشرائط اور ارکان مقرر کیے گئے جن سے انسان کے اندر اس قسم کے جذبات کو تحریک اور نشوونما ہو۔ مثلاً: نماز پڑھنے والا یہ سمجھ کر کہ وہ اب شہنشاہِ عالم کے دربار میں کھڑا ہے، ہاتھ باندھے رہے، نظر نیچے کیے رہے، طور وطریق اور حرکات وسکنات میں ادب واحترام کا لحاظ رکھے، نماز کی جگہ پاک ہو، بدن پاک ہو، کپڑے پاک ہوں، ادب سے اس کی بارگاہ میں اپنی دعاؤں اور التجاؤں کو پیش کرے، اس ظاہری مجموعی ہیئت کا اثر انسان کی باطنی کیفیت پر پڑتا ہے اور اس میں روحانی فیوض وبرکات کی استعداد وصلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ فرض کیجیے کہ ظاہری صفائی وپاکیزگی کا لحاظ نہ رکھا جائے تو دل کی صفائی وپاکیزگی کا تصور اس کے اندر مؤثر انداز میں کیوں کر پیدا ہوگا، یہی نفسی اصول ہے جو انسان کے ہر نظام اور ارادہ میں جاری وساری ہے۔ اندر بنانے کے لیے باہر کا بنانا بھی ایک حد تک ضروری ہے۔

اسی اصول کی بنا پر تنہائی کی فرض نمازوں سے جماعت کی نماز اور گھر کی نمازوں سے مسجد کی نماز بہتر ہے کہ جماعت کا ماحول اور مسجد کا منظر دلوں کی کیفیت کو دوبالا کر دے گا۔ اسی بنا پر تمام بڑے بڑے کاموں میں اجتماعیت اور نظام کی وحدت کا خیال رکھا جاتا ہے۔ اسی اصول کے ماتحت اسکولوں کی تنظیم اور ان کی درجہ بندی، کھیل میں فریقین کی ہم رنگی وہم لباسی، فوجوں میں وردی اور حرکت وعمل کی یکسانی کی ضرورت سمجھی گئی ہے اور یکساں اسلحہ اور ہتھیار اور ہمقدم سکون ورفتار کی بھی ضرورت ہے کہ ان ظاہری محرکات کا اثر پوری جماعت کے اندرونی تخیل پر پڑتا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ جماعت میں چند اشخاص ایسے ہوں جو اصلی کیفیت سے متکیف ہوں ان کی یہ حقیقی کیفیت اپنے اثر سے دوسروں کو بھی پرکیف بناتی ہے اور ان سے دوسرا اور دوسرے سے تیسرا متاثر ہو کر کم وبیش پوری جماعت متاثر ہو جاتی ہے، اسی لیے جلسوں میں ایک کی ہنسی سے سب کو ہنسی اور ایک کے رونے سے بہتوں کو رونا آ جاتا ہے۔ نفسیاتِ اجتماع میں یہ مسئلہ پوری طرح واضح ہے، غرض اسی سے اسلام نے اپنی عبادت کے لیے ان طبعی ونفسی اصول کا بڑا لحاظ رکھا ہے نماز کے

آداب شرائط اور ارکان انہی کا نام ہے۔

ذکر و دعا و تسبیح کے دو طریقے

یہ بار بار دہرایا جا چکا ہے کہ نماز سے مقصود خضوع و خشوع، ذکر الٰہی، حمد و ثنا، اپنے گناہوں پر ندامت و استغفار اور اسی قسم کے دوسرے پاک جذبات کی تحریک ہے۔ یہ تمام باتیں درحقیقت انسان کے دل سے تعلق رکھتی ہیں جن کے لیے ظاہری ارکان کی حاجت نہیں ہے۔ اسی لیے اسلام نے اپنی عبادتوں کی دو قسمیں کی ہیں ایک تو وہ جن کو انسان ہر حال اور ہر صورت میں کسی قید و شرط کے بغیر ادا کر سکے اس کا نام عام تسبیح و تہلیل اور ذکرِ الٰہی ہے جس کے لیے نہ زمانہ کی قید ہے نہ مکان کی شرط ہے، نہ اٹھنے بیٹھنے کی پابندی ہے، یہ عبادت ہر لحظہ اور ہر صورت میں انجام پا سکتی ہے۔ چنانچہ خدا نے فرمایا:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٣)

''پس تم اللہ کو کھڑے بیٹھے اور لیٹے یاد کرو۔''

اور محمد رسول اللہ ﷺ کے فیض صحبت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی یہی حالت تھی، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ ﴾ (٣/ آل عمران:١٩١)

''جو کھڑے بیٹھے لیٹے خدا کو یاد کرتے ہیں۔''

دنیاوی مشاغل اور ظاہری کاروبار بھی ان کو اس فرض سے غافل نہیں کرتے۔ فرمایا:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيْهِمْ تِجَارَةٌ وَّلَا بَيْعٌ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ ﴾ (٢٤/ النور:٣٧)

''ایسے لوگ ہیں جن کو تجارتی کاروبار اور خرید و فروخت کے مشاغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتے۔''

نماز متحدہ طریقہ عبادت کا نام ہے

دوسری عبادت وہ ہے جو خاص شکل و صورت کے ساتھ خاص اوقات میں اور خاص دعاؤں کے ذریعہ ادا کی جائے اس کا نام نماز ہے۔ پہلا طرز عبادت انفرادی چیز ہے اور وہ ہر فرد کے جداگانہ انتخاب پر منحصر ہے۔ اس کو جماعتی حیثیت حاصل نہیں ہے اور نہ اسلام میں اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا مسنون بتایا گیا ہے وہ تنہائی کا راز ہے جس کو اس طرح خاموشی سے ادا کرنا چاہیے کہ ریا اور نمائش کا شائبہ بھی پیدا نہ ہو سکے لیکن دوسری قسم کی عبادت درحقیقت جماعتی صورت رکھتی ہے اور اسی لیے اس کو جماعت کے ساتھ ادا کرنا واجب قرار دیا گیا ہے اور اس کے انکار پر قتل تک جائز ہو سکتا ہے۔ اگر اس کو جماعت کے ساتھ کوئی شخص ادا نہ کرے تو اگرچہ وہ ادا ہو جائے گی لیکن جماعت کے ثواب اور برکات سے اس شخص کو محرومی رہے گی۔ دوسرے لفظوں میں ہم اس کو یوں تعبیر کر سکتے ہیں کہ عام ذکر و فکر اور تسبیح و تہلیل انفرادی طریقہ عبادت ہے اور نماز ایک جماعتی

شعار ہے جو خاص ارکان اور شرائط کے ساتھ اوقات مقررہ پر ادا ہوتی ہے اور جس کے ادا کرنے کا جماعت کے ہر فرد کو ہر حالت میں حکم ہے البتہ اگر کسی عذر کی بنا پر جماعت کے ساتھ ادا نہ ہو سکے تو تنہا بھی اس کو ادا کرنا ضروری ہے۔ اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو کسی منزل میں اپنی فوج سے جس کے ساتھ اس کو چلنا تھا کسی وجہ سے پیچھے رہ گیا اب تنہا رہ کر بھی اس کو وہی فرض ادا کرنا ہے جو پوری فوج کے ساتھ اس کو ادا کرنا پڑتا۔

نماز میں نظامِ وحدت کا اصول

اسلام کے عام فرائض و احکام اور خصوصاً نماز اور اس کے متعلقات کی نسبت غور کرتے وقت ایک خاص اصول کو ہمیشہ پیش نظر رکھنا چاہیے۔ وہی اصول درحقیقت اسلام کا اصلی راز بلکہ سر الاسرار ہے۔ اسلام کی اصل حقیقت صرف ایک ہے اور وہ توحید ہے یہ توحید نہ صرف ایک فلسفیانہ موشگافی اور صوفیانہ نکتہ پروری ہے بلکہ وہ عملی کیفیت ہے جس کو اسلام کے ایک ایک حکم سے آشکارا ہونا چاہیے۔ اسلام کے دوسرے احکام کی طرح نماز بھی اس حقیقت اور کیفیت کا مظہر ہے نماز کی ایک ایک حرکت، ایک ایک جنبش، ایک ایک لفظ، ایک ایک اشارہ اور ایک ایک طرز سے اس حقیقت و کیفیت کو تراوش کرنا چاہیے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک نماز کی کوئی خاص شکل و صورت آئین و طریق اور سمت و وقت مقرر نہ کیا جاتا جماعتیں اس کو ایک متحدہ نظام میں ادا نہیں کر سکتی تھیں، نماز لاکھوں کروڑوں مسلمانوں پر جنہوں نے دعوت محمدی ﷺ کو قبول کیا فرض تھی اب اگر ان میں سے ہر ایک کو یہ اجازت ہوتی کہ جیسے چاہے جب چاہے جدھر منہ کر کے چاہے ادا کر لے تو اسلام کی وحدت کا نظام قائم نہ رہتا اور نہ اس کے دل کی طرح اس کی جسمانی اداؤں سے بھی توحید کا راز آشکار ہوتا اور نہ کل روئے زمین کے لاکھوں کروڑوں مسلمان واحد جماعت کی مجسم صورت بن سکتے۔ غرض اس نظام وحدت کا آشکارا و ہویدا کرنا توحید کا سب سے بڑا رمز اور شعار ہے اور کروڑوں دلوں کو جو کروڑوں اشباح و اجسام میں ہیں ایک متحد جسم اور واحد قالب ظاہر کرنا صرف اسی طرح ممکن ہے کہ ان سے واحد نظام کے ماتحت واحد صورت و شکل میں واحد اعمال و افعال کا صدور کرایا جائے چنانچہ انسان کے تمام جماعتی نظام کی وحدت اسی اصول پر مبنی ہے قوم کی وحدت، فوج کی وحدت، کسی بزم و انجمن کی وحدت، کسی مملکت و سلطنت کی وحدت، غرض ہر ایک نظامِ وحدت اسی اصول پر قائم ہے اور اسی طرح قائم ہو سکتا ہے۔

نماز میں جسمانی حرکات

یہ بھی ظاہر ہے کہ نماز کی اصل غرض و غایت چند پاکیزہ جذبات کا اظہار ہے۔ یہ انسانی فطرت ہے کہ جب انسان کے اندر کوئی خاص جذبہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے حسب حال اس سے کوئی فعل یا حرکت بھی صادر ہوتی ہے غصہ کی حالت میں چہرہ سرخ ہو جاتا ہے، خوف میں زرد پڑ جاتا ہے، خوشی میں کھل اٹھتا ہے، غم میں سکڑ جاتا ہے، جب وہ کسی سے سوال کرتا ہے تو اس کے سامنے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا دیتا ہے، کسی کی تعظیم کرتا ہے تو

اس کو دیکھ کر کھڑا ہو جاتا ہے، کسی سے عاجزی کا اظہار کرتا ہے تو اس کے آگے جھک جاتا ہے، اس سے بھی زیادہ اپنا تذلل، فروتنی اور خوشامد مقصود ہو تو منہ کے بل گرتا ہے اور پاؤں پر سر رکھ دیتا ہے۔ یہ جذبات کے اظہار کے فطری طریقے ہیں جو ہر قوم میں تقریباً یکساں رائج ہیں۔ اس تشریح کے بعد اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جس طرح نماز کی دعائیں انسانی طرز بیان میں ادا کی گئی ہیں اس کے ارکان بھی انسان کے فطری افعال و حرکات کی صورت میں رکھے گئے ہیں۔ انسان کے قلبی افعال و اعمال کے مظاہر اس کے جسمانی اعضاء ہیں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے ارادہ و نیت اور اس کے دلی جذبات و احساسات کے متعلق اس وقت تک کچھ نہیں کہہ سکتا جب تک اس کے ہاتھ پاؤں اور زبان سے ان کے مطابق کوئی عمل یا حرکت ظاہر نہ ہو اگر ایسا نہ ہو تو ہر انسان اپنی نسبت ولایت اور خیر کل ہونے کا دعویٰ کر سکتا ہے اور سوسائٹی کا کوئی ممبر اس کی تکذیب نہیں کر سکتا لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح سوسائٹی کی بنیاد ہی سرے سے تباہ و برباد ہو جاتی ہے اگرچہ انسان کے اندر کی ہر چیز اسی طرح خدا کے سامنے ہے جس طرح باہر کی اور اس لیے خدا کو ظاہری اعمال کی ضرورت نہیں مگر خود بندوں کو ان کی ضرورت ہے کہ وہ اپنی ظاہری اور باطنی دونوں حیثیتوں سے عرض و التجا اور تذلل و عاجزی کی تصویر بن جائیں۔ انسان اپنے جسم اور روح دونوں کے لحاظ سے خدا کا مخلوق ہے اس کی زندگی کے دونوں جزو خدا کے احسانات و انعامات سے یکساں گراں بار ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ اس خالق و رازق اور اس ارحم الراحمین کے سامنے روح اور جسم دونوں جھک کر سجدہ نیاز ادا کریں۔ غرض یہ وجوہ ہیں جن کی بنا پر شریعت نے جسم و جان دونوں کی رعایت کرتے ہوئے نماز کے ارکان مقرر کیے۔

اوپر گزر چکا ہے کہ انسان کے فطری اعمال و حرکات کے قالب میں نماز کا پیکر تیار کیا گیا ہے۔ جسمانی طریقے سے ہم کسی بڑے محسن کی تعظیم اور اس کے سامنے اپنی عاجزی کا اظہار تین طریقوں سے کرتے ہیں، کھڑے ہو جاتے ہیں، جھک جاتے ہیں، زمین پر سر رکھ دیتے ہیں۔ نماز کے بھی یہ تین رکن ہیں چنانچہ آغاز عالم سے انبیائے کرام علیہم السلام نے جس نماز کی تعلیم انسانوں کو دی وہ انہیں تین اجزاء سے مرکب تھی کھڑے ہو جانا (قیام) جھک جانا (رکوع) اور زمین پر سر رکھ دینا (سجدہ)

ارکان نماز

معلوم ہو چکا ہے کہ نماز ملتِ ابراہیمی کی سب سے بڑی خصوصیت تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خدا کے گھر کی تعمیر و تطہیر کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس کی غرض بھی بتائی گئی:

﴿ وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ﴾ (۲۲/ الحج:۲٦)

''اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک و صاف کر۔''

اس حکم میں نماز کے تینوں ارکان قیام، رکوع اور سجود کا مفصل اور بہ ترتیب ذکر ہے۔ حضرت مریم علیہا السلام

کا زمانہ سلسلہ اسرائیلی کا آخری عہد تھا ان کو خطاب ہوا:

﴿ يٰمَرۡيَمُ اقۡنُتِىۡ لِرَبِّكِ وَاسۡجُدِىۡ وَارۡكَعِىۡ مَعَ الرّٰكِعِيۡنَ۝ ﴾ (۳/ آل عمران: ٤٣)

''اے مریم! اپنے رب کے حضور میں کھڑے ہو کر بندگی کر اور سجدہ کر اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کر۔''

اس نماز مریمی میں بھی نماز کے تینوں ارکان موجود ہیں۔

ان ارکان کی ترتیب

جب کوئی حقیقت تین مرتب ارکان سے مرکب ہو اور اس میں سے ایک کا اول ہونا اور دوسرے کا سب سے مؤخر ہونا ثابت ہو جائے تو تیسرے کا وسط میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا۔ چنانچہ نماز کی ہر رکعت قیام اور رکوع اور سجدہ سے مرکب ہے اور قیام کا اول اور سجود کا آخر ہونا قرآن پاک کی حسب ذیل آیت سے ثابت ہے تو رکوع کا ان دونوں کے بیچ میں ہونا خود بخود ثابت ہو جائے گا:

﴿ وَاِذَا كُنۡتَ فِيۡهِمۡ فَاَقَمۡتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلۡتَقُمۡ طَآئِفَةٌ مِّنۡهُمۡ مَّعَكَ وَلۡيَاۡخُذُوۡۤا اَسۡلِحَتَهُمۡ فَاِذَا سَجَدُوۡا فَلۡيَكُوۡنُوۡا مِنۡ وَّرَآئِكُمۡ ﴾ (٤/ النسآء: ١٠٢)

''جب تو ان میں ہے تو ان کے لیے نماز کھڑی کرے تو چاہیے کہ ان میں سے ایک گروہ کے لوگ تیرے ساتھ کھڑے ہوں اور اپنے ہتھیار لیے رہیں، پھر جب یہ سجدہ کر لیں تو یہ تمہارے پیچھے چلے جائیں۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ایک رکعت میں پہلے کھڑا ہونا ہے اور آخر میں سجدہ پر ایک رکعت تمام ہوئی ہے پس لامحالہ رکوع، قیام و سجود کے بیچ میں ہو گا اور ہر رکعت کے ارکان سہ گانہ کی ترتیب یہ ہو گی کہ اول قیام پھر رکوع، پھر سجود۔

صحفِ سابقہ میں نماز کے ارکان

تورات کے حوالوں سے بھی نماز کے مختلف ارکان کا پتہ چلتا ہے مگر مشکل یہ ہے کہ مترجموں نے عبرانی اور یونانی لفظ کے ترجمے اپنے خیالات اور رسم و رواج کے مطابق کر دیے ہیں جس سے حقیقت کے چہرہ پر بڑی حد تک پردہ پڑ جاتا ہے۔ بہرحال عبادت اور تعظیم کے یہ تینوں طریقے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی شریعت اور ان کی نسل میں جاری تھے۔ ذیل میں ہم ان میں سے ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں۔

قیام

''پر ابرہام (ابراہیم) ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا۔'' (پیدائش ۱۸_۲۲)

رکوع

''اور (ابراہیم) زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند۔'' (پیدائش ۱۸_۲)

سجدہ

''اور یہ سن کے کہ خداوند نے بنی اسرائیل کی خبر گیری کی اور ان کے دکھوں پر نظر کی انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کیے'' (خروج ۴۔۳۱)

''تب ابرہام (ابراہیم) منہ کے بل گرا اور خدا اس سے ہم کلام ہو کر بولا۔'' (پیدائش ۱۷۔۳)

''تب ابرہام (ابراہیم) نے اپنے جوانوں سے کہا: تم یہاں گدھے کے پاس رہو میں اس لڑکے کے ساتھ (اپنے فرزند کی قربانی کے لیے) وہاں تک جاؤں گا اور سجدہ کر کے پھر تمہارے پاس آؤں گا۔'' (پیدائش ۲۲۔۵)

''تب اس مرد (حضرت اسحاق علیہ السلام کا ایلچی) نے سر جھکایا اور خداوند کو سجدہ کیا اور اس نے کہا میرے خداوند ابرہام کا خدا مبارک ہے۔'' (پیدائش ۲۴۔۲۶)

''اور ایسا ہوا کہ جب داؤد علیہ السلام، پہاڑ کی چوٹی پر پہنچا جہاں اس نے خدا کو سجدہ کیا۔'' (۲سموال ۱۵۔۳۲)

زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام خدا تعالیٰ سے کہتے ہیں:

''اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔'' (زبور ۵۔۷)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے اور اسلام نے اسی کی پیروی کی ہے۔ موجود انجیل میں دعا اور نماز کا ذکر (متی ۶۔۵ و ۱۷۔۲۱ و ۲۶، ۳۶۔ مرقس ۱۴۔۳۲ ولوقا ۲۲۔۴۱) وغیرہ میں ہے۔ طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لیے گھٹنا ٹیکنا (جو گویا رکوع ہے) (لوقا ۲۲۔۴۱) اور دوسری میں (متی ۲۶۔۳۹) منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے اور بقیہ انجیلوں میں خاموشی ہے۔ عہد بعثت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے۔ کھڑے ہو کر توراۃ یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے تھے۔ اور سجدہ بھی کرتے تھے قرآن پاک کی شہادت ہے:

﴿ لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱۱۳)

''وہ برابر نہیں ہیں اہل کتاب میں کچھ ایسے بھی ہیں جو رات کو خدا کی آیتیں کھڑے ہو کر پڑھتے ہیں اور سجدے کرتے ہیں۔''

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں۔ [1] اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی نماز کے یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔ اسلام کی نماز بھی انہیں قدیم ارکان اور فطری شکل و صورت کے ساتھ فرض ہوئی جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے اب تک چلی آ رہی تھی چنانچہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مصنفین اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔'' [2]

---

[1] فتح الباری ابن حجر، ج ۲، ص: ۲۲۷ مصر۔ [2] مضمون صلوۃ، ج ٤، ص: ۹٦۔

اسلام نے صرف یہ کیا کہ اس خزانہ کو وقف عام کر دیا۔ انسانی آمیزشوں کو نکال کر بھلائے ہوئے فریضوں کو دوبارہ یاد دلایا، مٹے ہوئے نقش کو ابھار دیا، نماز کے بے جان پیکر میں حقیقت کی روح پھونک دی اس میں اخلاص کا جوہر پیدا کیا اس کو دین کا ستون بنایا اور اپنی متواتر تعلیم وعمل سے اس کی ظاہری شکل و صورت کو بھی ہر انسانی تغیر سے محفوظ کر دیا اس طرح اس نے اس تکمیل کا فرض انجام دیا جس کے لیے وہ ازل سے منتخب تھا۔ یہ مسئلہ کہ نماز مطلق تسبیح وتہلیل اور ذکر الٰہی کا نام نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ ارکان بھی ہیں، رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے عمل متواتر کے علاوہ خود قرآن پاک سے بھی ثابت ہے۔ خوف اور جنگ میں نماز کے قصر اور ارکان کی تخفیف کی اجازت دی گئی ہے اس کے بعد ہے کہ جب خطرہ جاتا رہے تو نماز کو اس طرح ادا کرو جس طرح تم کو سکھایا گیا ہے۔

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۳۸_۲۳۹)

”نمازوں کی اور بیچ کی نماز کی نگہداشت کرو اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو پھر اگر خوف ہو تو پیادہ یا سوار ہو کر (پڑھو) پھر جب خوف جاتا رہے تو اللہ کو ویسے یاد کرو جیسے اس نے تم کو بتایا جو تم نہیں جانتے تھے۔“

اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس ذکر الٰہی کا کوئی خاص طریقہ تھا جس کی عملی شکل نماز ہے اور اس کی تفصیل سورۂ نساء میں ہے۔ اس طرح جنگ کی نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت [1] کے متعلق کہا گیا ہے:

﴿ فَاِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ ۚ فَاِذَا اطْمَاْنَنْتُمْ فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۚ ﴾ (۴/ النسآء:۱۰۳)

”پس جب نماز (ایک رکعت) ادا کر چکو تو اللہ کو اٹھتے بیٹھتے اور پہلوؤں پر یاد کرو پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔“

اس آیت میں غور کرنے کی دو باتیں ہیں: اول یہ ہے کہ ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوئی اس کو الصلوٰۃ (نماز) کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اٹھ کر، بیٹھ کر، جھک کر، لیٹے اور لڑائی، حملہ اور مدافعت کی حالت میں پوری ہوئی اس کو صرف ذکر اللہ کہا گیا۔ دوسری بات یہ ہے کہ جنگ کی اس عارضی مخفف نماز کو اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنا) کے لفظ سے ادا نہیں کیا گیا حالانکہ ذکر الٰہی تسبیح وتہلیل اور بعض ارکان بھی اس میں

[1] اس کی تشریح میں فقہا کا اختلاف ہے، میں نے یہاں وہ لکھا ہے جو میرے نزدیک صحیح ہے۔

موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ پھر جب اطمینان ہو جائے تو نماز کھڑی کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ (نماز کھڑی کرنے) کے معنی مطلق ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامتِ صلوٰۃ کے ضمن میں ذکر و فکر، تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قراءت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اب اس عارضی مانع کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے یہی وہ ارکان تھے جن کے متعلق سورۂ بقرہ میں یہ کہا گیا تھا کہ جب خوف جاتا رہے تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔ اب ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ اسلام میں نماز کن ارکان کے ساتھ مقرر ہوئی ہے۔ گو اس کے لیے یہ بالکل کافی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے تمام عمر خود کس طرح نماز پڑھی اور صحابہ رضی اللہ عنہم کو کس طرح کی نماز سکھائی کیوں کہ نماز کی یہ عملی کیفیت پورے تواتر کے ساتھ اس عہد سے لے کر آج تک موجود ہے اور دوست و دشمن اور مخالف و موافق کو معلوم ہے اور اسلام کے ہر فرقہ میں یکساں طور سے عملاً بلا اختلاف مسلّم ہے، تاہم نظریہ پسند لوگوں کے لیے قرآن پاک سے ان کا ثبوت پہنچا دینا زیادہ مناسب ہوگا:

ہم پہلے رب العزت کی بارگاہ میں مؤدب کھڑے ہوتے ہیں:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرہ :۲۳۸)

''نمازوں پر (عموماً) اور بیچ کی نماز پر (خصوصاً) نگاہ رکھو اور خدا کے آگے مؤدب کھڑے ہو۔''

نماز کا آغاز خدا کا نام لے کر کرتے ہیں کہ

﴿ وَذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ فَصَلّٰى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلیٰ :۱۵)

''اور اپنے پروردگار کا نام لیا پس نماز پڑھی۔''

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ ﴾ (۷٤/ المدثر :۳)

''اور اپنے رب کی بڑائی کر۔''

لفظ اللہ اکبر جس کی نماز میں بار بار تکرار کی جاتی ہے اسی حکم کی تعمیل ہے۔

اس کے بعد خدا کی حمد و ثنا کرتے اور اس سے اپنے گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۝ ﴾ (۵۲/ الطور :٤٨)

''اور جب تو کھڑا ہو تو اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔''

پھر قرآن پڑھتے ہیں:

﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ﴾ (۷۳/ المزمل :۲۰)

''قرآن میں سے جتنا ہو سکے پڑھو۔''

قرآن کی ان آیتوں میں خدا کے اسماء اور صفات کا تذکرہ کرتے ہیں اور اس کی حمد خصوصیت کے ساتھ بیان کرتے ہیں جس سے اس کی بڑائی (تکبیر) ظاہر ہوتی ہے:

﴿ قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ ؕ اَیًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰی ۚ وَلَا تَجْهَرْ بِصَلَاتِكَ وَلَا تُخَافِتْ بِهَا وَابْتَغِ بَیْنَ ذٰلِكَ سَبِیْلًا ۝ وَقُلِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ لَمْ یَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ یَكُنْ لَّهٗ شَرِیْكٌ فِی الْمُلْكِ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ وَلِیٌّ مِّنَ الذُّلِّ وَكَبِّرْهُ تَكْبِیْرًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنیٓ اسرآءیل: ۱۱۰ـ۱۱۱)

''کہہ اللہ کو پکارو یا رحمٰن کو پکارو جو کہہ کر پکارو سب اچھے نام اسی کے ہیں اپنی نماز نہ بہت زور سے پڑھ اور نہ بہت چپکے بیچ کی راہ تلاش کر اور کہہ کہ حمد اس اللہ کی جس نے کوئی بیٹا نہیں بنایا اور نہ سلطنت میں کوئی اس کا شریک ہے اور نہ درماندگی کے سبب سے اس کا کوئی مددگار ہے اور اس کی بڑائی کر بڑی بڑائی۔''

چونکہ اس کی یہ حمد سورۂ فاتحہ میں بہ تمام وکمال مذکور ہے اس لیے اس سورہ کو ہر نماز میں پہلے پڑھتے ہیں اس کے بعد قرآن میں جتنا پڑھنا ممکن اور آسان ہوتا ہے اس کو پڑھتے ہیں۔ پھر خدا کے سامنے ادب سے جھک جاتے یعنی رکوع کرتے ہیں:

﴿ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِیْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۳)

''اور رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرو۔''

پھر اس سے آگے پیشانی کو زمین پر رکھ دیتے یعنی سجدہ کرتے ہیں:

﴿ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ وَافْعَلُوا الْخَیْرَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾

(الحج:۲۲)

''اے ایمان والو! جھکو (رکوع کرو) اور سجدہ کرو اور اپنے رب کی پرستش کرو اور نیک کام کرو تاکہ کامیاب ہو۔''

ان دونوں (رکوع وسجدہ) میں خدا کی تسبیح وتحمید کرتے ہیں:

﴿ فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِیْمِ ۝ ﴾ (۵٦/ الواقعہ:۷۴و۹٦)

''تو اپنے بزرگ پروردگار (ربِّ عظیم) کے نام کی تسبیح کر۔''

﴿ سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلَى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلی:۱)

''اپنے برتر رب (ربِّ اعلیٰ) کی تسبیح کر۔''

آنحضرت ﷺ کی ربانی تعلیم کے مطابق پہلا حکم رکوع میں اور دوسرا سجدے میں ادا ہوتا ہے۔ [1]

[1] ابن ماجہ، ابواب اقامة الصلوٰة، باب التسبیح فی الرکوع والسجود:۸۸۷۔

قیام، رکوع اور سجود کی یہ ترتیب سورۂ حج (۴۔ ذکر ابراہیم علیہ السلام) اور آل عمران (۵۔ ذکر مریم) سے اور یہ امر کہ سجدہ پر ایک رکعت تمام ہو جاتی ہے سورۂ نساء (۱۵ ذکر نمازِ خوف) سے ثابت ہے۔ درحقیقت ارکان کی یہ ترتیب بالکل فطری اور عقلی ہے، پہلے کھڑا ہونا، پھر جھک جانا، پھر سجدہ میں گر پڑنا، اس میں خود طبعی اور فطری ترتیب ہے۔ تعظیم کی ابتدائی اور کثیر الوقوع شکل یہ ہوتی ہے کہ آدمی کھڑا ہو جاتا ہے۔ جب کیفیات اور جذبات میں گہرائی پیدا ہو جاتی ہے تو وہ جھک جاتا ہے اور جب فرطِ بے خودی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے تو اپنے بلند ترین حصۂ جسم (یعنی پیشانی) کو اپنے محسن اور معظم کے پست ترین حصۂ جسم (یعنی پاؤں) پر رکھ دیتا ہے یہی سبب ہے کہ سجدہ نماز کی کیفیات کی انتہائی صورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے:

﴿وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ﴾ (۹۶/ العلق:۱۹)

''اور سجدہ کر اور قریب ہو جا۔''

گویا سجدہ قربت الٰہی کی اخیر منزل ہے شاید اسی لیے وہ ہر رکعت میں مکرر ادا کیا جاتا ہے۔

نماز تمام جسمانی احکامِ عبادت کا مجموعہ ہے

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں ہم کو مختلف قسم کی جسمانی، لسانی اور قلبی عبادتوں کا حکم دیا گیا ہے۔ جسم کو ادب سے کھڑا رکھنے، پھر جھکانے اور سرنگوں کرنے کا حکم ہے۔ مختلف دعاؤں کے پڑھنے کی تاکید ہے۔ خدا کی تسبیح و تحمید کا ارشاد ہے۔ دعا اور استغفار کی تعلیم ہے۔ دل کے خضوع و خشوع کا فرمان ہے۔ رسول پر درود بھیجنے کا امر ہے۔ اس لیے نماز کی تشکیل اس طرح کی گئی کہ اس ایک عبادت کے اندر قرآن پاک کی تمام جسمانی، لسانی اور روحانی عبادتوں کے احکام یکجا ہو گئے۔ اسی لیے ایک نماز قرآن کے تمام گوناگوں جسمانی، لسانی اور روحانی عبادات کا مجموعہ ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ قرآن پاک میں مسلمانوں کو قیام، رکوع، سجود، تہلیل، تسبیح، تکبیر، قراءت، قرآن، ذکرِ الٰہی اور درود پڑھنے کے جو احکام عطا کیے گئے ہیں ان کی مجموعی تعمیل کا نام نماز ہے۔ جس میں یہ تمام منفرد احکام مجموعی حیثیت سے انجام پاتے ہیں۔ دوسری طرف ان احکام کی بجا آوری میں ایک ترتیب پیدا کی گئی ہے کہ اگر وہ نہ ہوتی اور یہ کام انسانوں کے ذاتی انتخاب پر چھوڑ دیا جاتا کہ جو چاہے رکوع کر لے، جو چاہے سجدہ کر لے، جو چاہے صرف قیام کر لے، جو چاہے زبان ہی سے ذکر و قراءت پر اکتفا کر لے اور جو چاہے صرف دل سے دھیان کر کے اس فرض سے ادا ہو جائے تو ہر فرد سے فرائضِ الٰہی کے متعدد ارکان چھوٹ جاتے، جن پر کبھی عمل نہ ہوتا اور عجب نہیں کہ افراد کی طبعی سستی اور سہل انگاری ان پورے احکام کی تعمیل میں مانع آتی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ تمام مسلمانوں کی عبادت کی واحد اور منظم شکل پیدا نہ ہوتی نہ جماعت ہو سکتی اور نہ نماز کو ایک مذہب کی عبادتِ خاص کہا جا سکتا اور نہ جماعتی رمزو شعار کی وحدت کی شان اس سے پیدا ہو کر مسلمانوں کو واحد امت بناتی اور بتاتی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فرشتہ کے

ذریعہ اپنے رسول کو اس عبادت کی عملاً تعلیم دی۔ [1] اور رسول نے امت کو سکھایا اور امت نے نسلاً بعد نسل موجودہ اور آیندہ نسل کو سکھایا اور اس پورے تواترِ عمل کے ساتھ جن میں ذرا بھی شک وشبہ نہیں، وہ آج تک محفوظ ہے۔

نماز کی دعا

نماز کی مختلف حالتوں میں ان حالتوں کے مطابق دعائیں پڑھی جاتی ہیں اور پڑھی جاسکتی ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ سے نماز کی مختلف حالتوں کی بیسیوں مختلف دعائیں مروی ہیں اور ہر مسلمان ان میں سے جو چاہے پڑھ سکتا ہے۔ لیکن نماز کی وہ اصلی دعا جس سے ہمارے قرآن کا آغاز ہوتا ہے، جس کو نماز میں پڑھنے کی تاکید آنحضرت ﷺ نے فرمائی ہے۔ جس کو آپ نے تمام عمر نماز کی ہر رکعت میں پڑھا ہے اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام مسلمان پڑھتے آئے ہیں، وہ سورۂ فاتحہ ہے، جو مقاصدِ نماز کے ہر پہلو پر حاوی اور محیط ہے، اسی لیے وہ اسلام میں نماز کی اصلی دعا ہے۔ یہ وہ دعا ہے جو خدا نے بندوں کی بولی میں اپنے منہ سے ادا کی۔

﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝ صِرَاطَ الَّذِيْنَ اَنْعَمْتَ عَلَيْهِمْ ۝ غَيْرِ الْمَغْضُوْبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّيْنَ ۝ ﴾ (۱/ الفاتحۃ: ۱ تا ۷)

”حمد ہو اس اللہ کی جو سب جہانوں کا پروردگار ہے رحم والا مہربان ہے، ہمارے عمل کے بدلے کے دن کا مالک (ہے) (اے آقا) ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد مانگتے ہیں، تو ہم کو سیدھے راستہ پر چلا، ان کا راستہ جن پر تو نے فضل کیا، ان کا راستہ نہیں جن پر غضب آیا اور نہ ان کا جو بہک گئے۔“

(اس دعا کو ختم کر کے آمین کہتے ہیں۔ یعنی اے خدا! تو اس کو قبول کر)

یہ وہ دعا ہے جس کو ہر مسلمان ہر نماز میں دہراتا ہے، جس کے بغیر ہر نماز ناتمام اور ادھوری رہتی ہے۔ [2]

یہ دعا اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے، خدا کی حمد وستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا وسزا کا یقین ہے، عبادت کے مخلصانہ ادا کا اقرار ہے، توفیق وہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے۔ جس وقت اس حمد میں خدا کی پہلی صفت کل جہانوں کا پروردگار زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، سب سامنے آجاتی ہیں۔ جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت اور کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی

---

[1] مؤطا امام مالک، کتاب وقوت الصلوٰۃ، باب وقوت الصلوٰۃ:۱؛ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوٰۃ، باب مواقیت الصلوۃ: ۵۲۱؛ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس: ۱۳۸۰۔

[2] جامع ترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ما جاء انه لا صلاۃ الا بفاتحة الکتاب: ۲۴۷۔

پروردگار کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان، چرند ہوں کہ پرند، پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم، بادشاہ ہوں یا گدا، کالے ہوں یا گورے، عرب ہوں یا عجم، کل مخلوقات خلقت کی برادری کی حیثیت سے یکساں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو رحمٰن ورحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے انتہا رحمت، بے پایاں شفقت، غیر محدود بخشش اور ناقابل بیان کیف، محبت کا سمندر دل کے کوزہ میں موجیں مارنے لگتا ہے۔ روز جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے باخبر اور خدا کے جلال وجبروت سے مرعوب کر دیتا ہے۔ ''ہم تجھی کو پوجتے ہیں'' کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ وبن سے اکھاڑ دیتے ہیں ''ہم تجھی سے مدد مانگتے ہیں'' بول کر ہم تمام دنیاوی سہاروں اور بھروسوں کو ناچیز سمجھتے اور صرف خدا کی طاقت کا سہارا ڈھونڈھتے اور سب سے بے نیاز ہو کر اسی ایک کے نیاز مند بن جاتے ہیں۔ سب سے آخر میں ہم اس سے سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ یہ سیدھی راہ (راہ مستقیم) کیا ہے؟ اس کی شریعت کے احکام ہیں:

﴿ قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۚ وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَاِيَّاهُمْ ۚ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۚ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِيْ حَرَّمَ اللّٰهُ اِلَّا بِالْحَقِّ ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ وَلَا تَقْرَبُوْا مَالَ الْيَتِيْمِ اِلَّا بِالَّتِيْ هِىَ اَحْسَنُ حَتّٰى يَبْلُغَ اَشُدَّهٗ ۚ وَاَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيْزَانَ بِالْقِسْطِ ۚ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۚ وَاِذَا قُلْتُمْ فَاعْدِلُوْا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبٰى ۚ وَبِعَهْدِ اللّٰهِ اَوْفُوْا ۭ ذٰلِكُمْ وَصّٰىكُمْ بِهٖ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِيْ مُسْتَقِيْمًا فَاتَّبِعُوْهُ ۚ ﴾

(٦/ الانعام: ١٥١-١٥٣)

''کہہ دے (اے پیغمبر) آؤ میں تم کو پڑھ کر سناؤں جو تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہ کہ اس کے ساتھ شرک نہ کرو، ماں باپ کے ساتھ نیکی کرو، غربت کے سبب اپنی اولاد کو قتل مت کرو، ہم تم کو اور ان کو روزی دیتے ہیں، بے حیائی کی باتوں کے نزدیک نہ جاؤ، خواہ وہ ظاہر میں (فحش) ہوں یا باطن میں، جس جان کو خدا نے محترم کیا ہے اس کو مت مارو، لیکن انصاف کے ساتھ، یہ وہ باتیں ہیں جن کا حکم خدا نے تم کو دیا ہے۔ شاید کہ تم سمجھو اور یتیم کے مال کے پاس مت جاؤ، لیکن اچھی نیت سے یہاں تک کہ وہ اپنی قوت کو پہنچ جائے اور ناپ اور تول کو انصاف کے ساتھ پورا رکھو، ہم کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ کا حکم نہیں دیتے۔ جب تم بات بولو تو انصاف کی گو تمہارا عزیز ہی کیوں نہ ہو اور خدا کے عہد کو پورا کرو یہ وہ باتیں ہیں جن کا خدا نے تم کو حکم دیا ہے تاکہ تم نصیحت پکڑو اور بے شبہ یہی ہے میرا سیدھا راستہ (صراط مستقیم) تو تم

اسی کی پیروی کرو۔''

ان آیات نے واضح کر دیا کہ وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں صراط مستقیم کیا ہے، یعنی شرک نہ کرنا، ماں باپ کے ساتھ نیک سلوک، اولاد کے ساتھ اچھا برتاؤ، ظاہری و باطنی ہر قسم کی برائیوں سے بچنا، معصوم اور بے گناہ جانوں کی عزت کرنا (ناحق قتل نہ کرنا)، یتیم کے ساتھ احسان، ناپ تول میں ایمانداری، بلا رورعایت سچ بولنا اور عہد کا پورا کرنا، یہ وہ صفات عالیہ ہیں جن کو صراطِ مستقیم کی مختصر سی ترکیب توصیفی میں ہم خدا سے روزانہ مانگتے ہیں، جو اخلاق کا جوہر اور نیکی کی روح ہیں۔

یہی وہ صفاتِ حسنہ ہیں جن سے خدا کے وہ خاص بندے متصف تھے۔ جن پر اس کا فضل و انعام ہوا۔ یہ خاص بندے کون ہیں؟ قرآن پاک نے اس کی تشریح بھی خود کر دی ہے:

﴿ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا ﴾ (٤/ النسآء:٦٩)

''اور جو خدا اور رسول کے حکم پر چلتے ہیں تو وہ ان لوگوں کے ساتھ ہیں، جن پر خدا کا فضل اور انعام ہوا یعنی نبی، صدیق، شہید اور صالح لوگ ان کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔''

اس بنا پر ہر نمازی جس صراط مستقیم اور راہ راست کے لیے دعا کرتا ہے، وہ نیکی کی وہ شاہراہ ہے جس پر خدا کے تمام نیک بندے (انبیا، صدیقین، شہدا اور صالحین) علیٰ قدر مراتب چل سکے۔

سیدھے راستہ سے ہٹنا دو طرح سے ہوتا ہے (۱) افراط (زیادتی) کے سبب سے اور (۲) تفریط (کمی) کے سبب سے، افراط یہ ہے کہ خدا کی شریعت میں ہم اپنی طرف سے بدعتوں کا اضافہ کریں یہ گمراہی ہے اور تفریط یہ ہے کہ خدا کے احکام پر عمل چھوڑ دیں، اس سے خدا کا غضب قوم پر نازل ہوتا ہے اور ہر قسم کا انعام و اکرام چھین لیا جاتا ہے۔ پہلی صورت کی مثال نصاریٰ ہیں، جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے ہزاروں باتیں اضافہ کر دیں۔ دوسری کا نمونہ یہود ہیں، جنہوں نے احکامِ الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور ہر قسم کے انعام و اکرام سے محروم ہو گئے۔ مسلمانوں کی دعا یہ ہے کہ الٰہی ہم کو ان دونوں غلط راستوں سے بچانا اور اعتدال کی شاہراہ پر قائم رکھنا۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ اسلام کی یہ دعا (سورۂ فاتحہ) دین و دنیا کی دعاؤں کی جامع، جسم و روح کی نیکیوں پر مشتمل اور اخلاق و ایمان کی تعلیمات کو محیط ہے۔ اس میں خدا کی حمد بھی ہے اور بندے کی التجا بھی۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے اس کی نسبت فرمایا:

''جو نماز میں اس سورہ کو نہ پڑھے، اس کی نماز ناقص اور نامکمل ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ نماز میرے اور میرے بندے کے درمیان دو حصوں میں بٹی ہوئی ہے۔ آدھی میرے لیے ہے اور آدھی اس کے لیے، بندہ

جب ﴿ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (حمد ہو سارے جہانوں کے پروردگار کی) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری ستائش کی پھر جب وہ ﴿ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۝ ﴾ (مہربان رحم والا) کہتا ہے تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری تعریف کی۔ پھر وہ کہتا ہے: ﴿ مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ (نیک و بد کی جزا کے دن کا مالک) تو خدا فرماتا ہے: میرے بندہ نے میری بڑائی ظاہر کی۔ اتنا میرا حصہ ہے اور میرے اور میرے بندہ کے درمیان مشترک یہ ہے کہ ﴿ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝ ﴾ ۔ (ہم تجھی کو پوجتے ہیں اور تجھی سے مدد چاہتے ہیں) اس کے بعد آخر تک (کہ ہم کو صراط مستقیم دکھا) میرے بندہ کی دعا ہے اور میرے بندہ نے جو مانگا وہ اس کو ملا۔ ❶

اس حدیث قدسی کے آئینہ میں اسلامی نماز کی اس دعا کا جو دلکش و دلفریب نظارہ نظر آتا ہے، وہ روح میں نشاط اور دل میں سرور پیدا کرتا ہے۔ یہ وہ کیفیت ہے جس کا ایک دھندلا سا تصور ایک عیسائی یورپین فاضل اے جی وینسنک (A-G-Wensinck) کو بھی جس نے انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں اسلامی نماز پر ایک پُر معلومات مضمون لکھا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہو جاتا ہے، وہ لکھتا ہے:

''(اسلام کی رو سے) نماز حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہونی چاہیے۔ ایک دفعہ محمد ﷺ نے ایک پُر نقش و نگار کپڑے کو اس لیے اتار دیا کہ اس سے نماز میں توجہ بٹتی ہے۔ یہ واقعہ کہ نماز صرف ظاہری رسوم ادا کرنے کا نام نہیں، بلکہ اس میں دلی خضوع و خشوع کی بھی ضرورت ہے۔ اس حدیث سے ثابت ہوتا ہے جس میں محمد ﷺ نے کہا ہے کہ مجھے تمہاری دنیا کی دو چیزیں پسند ہیں، خوشبو اور عورت اور میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز ہے۔ محمد ﷺ پر نمازوں میں گریہ طاری ہو جانا بھی بعض اوقات منقول ہے۔ نماز کی ایک سب سے اعلیٰ خصوصیت وہ ہے جس کو ہم ان دو حدیثوں میں پاتے ہیں، جن میں بیان ہے کہ ''نماز خدا سے سرگوشی اور مکالمہ ہے۔'' اور اس کی تشریح ہم کو اس حدیث قدسی میں ملتی ہے کہ سورۂ الحمد میرے اور میرے بندہ کے درمیان بٹی ہوئی ہے۔ ❷

اس دعائے محمد ﷺ کا موازنہ دوسرے انبیا علیہم السلام کی منصوص دعاؤں سے

دنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس کو نماز کا حکم نہ دیا گیا ہو اور نماز میں پڑھنے کے لیے کوئی دعا تعلیم نہ کی گئی ہو۔ کوہ طور پر جلوۂ ربانی کے وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام نے نماز میں جو دعا پڑھی تھی وہ توراۃ کی کتاب خروج میں موجود ہے۔ زبور تو شروع سے آخر تک دعاؤں کا مجموعہ ہی ہے، مگر اس میں ایک خاص دعا پر یہ عنوان بھی لکھا نظر آتا ہے کہ ''داؤد کی نماز'' انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی وداعی شب میں حواریوں کو ایک خاص دعا کی تعلیم دیتے ہیں جو آج تک عیسائیوں کی نماز کا اصلی جزو ہے۔ ان دعاؤں کو سامنے رکھ کر محمد رسول

❶ جامع ترمذی، ابواب التفسیر، باب ومن سورة فاتحة الكتاب: ٢٩٥٣ ومسند احمد، ج ٢، ص: ٤٦٠۔

❷ یہ حدیث اوپر گزر چکی ہے۔

اللہ ﷺ کی زبان وحی ترجمان کے ذریعہ سے آئی ہوئی دعا کی تاثیری کیفیت، حسنِ تعبیر، جامعیت، پاکیزگی اور اختصار کا اندازہ ہوگا اور پتہ چلے گا کہ اس کی کیا بے مثالی ہے، جس کے سبب سے نمازوں میں پڑھنے کے لیے اسی کا انتخاب ہوا؟ اسی لیے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے اس کی نسبت اپنے ایک صحابی حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے فرمایا تھا کہ ''نماز میں جو سورہ تم پڑھتے ہو یعنی ام القرآن، قسم ہے، اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ وہ نہ توراۃ میں اتری نہ انجیل میں نہ زبور میں اور نہ اس کے مثل کوئی دوسری چیز خود قرآن میں موجود ہے۔'' [1] اس حدیث کی صحت اور صداقت کا یقین خود ان دعاؤں پر ایک نظر ڈالنے سے ہوگا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نماز کی دعا

توراۃ کی کتاب الخروج میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام توراۃ لینے اور ربانی تجلی کا ایک تماشا دیکھنے کے لیے کوہ طور پر چڑھے اور تجلی نظر آئی تو فوراً خدا کا نام لیتے ہوئے سجدہ میں گر پڑے۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ دعا تعلیم کی:

> ''خداوند، خداوند، خدا، رحیم اور مہربان، قہر میں دھیما اور رب الفیض و وفا، ہزار پشتوں کے لیے فضل رکھنے والا، گناہ اور تقصیر اور خطا کا بخشنے والا، لیکن وہ ہر حال میں معاف نہ کرے گا، بلکہ باپوں کے گناہ کا بدلہ ان کے فرزندوں سے اور فرزندوں کے فرزندوں سے تیسری اور چوتھی پشت تک لے گا''۔ (۳۴-۶)

اس دعا کے ابتدائی فقرے اگرچہ نہایت موثر ہیں، لیکن خاتمہ نہایت مایوس کن ہے۔ پہلے فضل و رحمت کی امید دلا کر آخر میں بابِ اجابت پر قفل چڑھا دیا ہے۔

زبور میں حضرت داؤد علیہ السلام کی نماز کی دعا: زبور باب ۸۶۔

---

[1] جامع ترمذی، ابواب فضائل القرآن، باب ماجاء فی فضل فاتحة الكتاب: ۲۸۷۵۔

داؤد علیہ السلام کی نماز

"اے خداوند! اپنا کان جھکا اور میری سن کہ میں پریشان اور مسکین ہوں، میری جان کی حفاظت کر کہ میں دین دار ہوں، اے تو کہ میرا خدا ہے اپنے بندہ کو کہ جس کا توکل تجھ پر ہے رہائی دے۔ اے خداوند! مجھ پر رحم کر کہ میں تمام دن تیرے آگے نالہ کرتا ہوں اپنے بندہ کے جی کو خوش کر کہ اے خداوند! میں اپنے دل کو تیری طرف اٹھاتا ہوں، کیونکہ تو اے خداوند بھلا ہے اور بخشنے والا ہے اور تیری رحمت ان سب پر جو تجھ کو پکارتے ہیں وافر ہے۔ اے خداوند! میری دعا سن اور میری مناجات کی آواز پر کان دھر، میں اپنے بپت کے دن تجھ کو پکاروں گا کہ تو میری سنے گا معبودوں کے درمیان اے خداوند! تجھ سا کوئی نہیں اور تیری صفتیں کہیں نہیں۔ اے خداوند! ساری قومیں جنھیں تو نے خلق کیا آئیں گی اور تیرے آگے سجدہ کریں گی اور تیرے نام کی بزرگی کریں گی کہ تو بزرگ ہے اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

اے خداوند! مجھ کو اپنی راہ بتا میں تیری سچائی میں چلوں گا، میرے دل کو یک طرفہ کر تا کہ میں تیرے نام سے ڈروں اے خداوند! میرے خدا میں اپنے سارے دل سے تیری ستائش کروں گا اور ابد تک تیرے نام کی بزرگی کروں گا کہ تیری رحمت مجھ پر بہت ہے اور میری روح کو اسفل پاتال سے نجات دلا۔

اے خدا! مغروروں نے مجھ پر چڑھائی کی ہے اور کٹر لوگوں کی جماعت میری جان کے پیچھے پڑی ہے اور انہوں نے مجھ کو اپنی آنکھوں کے سامنے نہیں رکھا لیکن تو اے خداوند! خدا رحیم و کریم اور برداشت کرنے والا ہے اور شفقت اور وفا میں بڑھ کر ہے، میری طرف متوجہ ہو اور مجھ پر رحم کر، اپنے بندہ کو اپنی توانائی بخش اور اپنی لونڈی کے بیٹے کو نجات دے، مجھے بھلائی کا کوئی نشان دکھا تا کہ وہ جو میرا کینہ رکھتے ہیں، دیکھیں اور شرمندہ ہوں، کیوں کہ تو نے اے خداوند میری مدد کی اور مجھے تسلی دی۔"

اس دعا میں بھی وہی خدا کی حمد وصفت اور توحید وعبادت کا ذکر، راہ راست کی ہدایت کی طلب اور شریروں اور گمراہوں سے بچائے جانے کی درخواست ہے، لیکن طول تکرار اور دعا مانگنے والے کی شخصیت کا رنگ غالب ہونے کے سبب سے یہ ہر انسان کی دعا نہیں بن سکتی اور نہ اس کا طول اس کو ہر وقت کی نماز میں پڑھے جانے کی سفارش کرتا ہے۔

انجیل میں نماز کی دعا

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام حواریوں کو دعا اور نماز کے آداب بتا کر یہ دعا تعلیم کرتے ہیں:

"اے ہمارے باپ جو آسمان پر ہے تیرا نام مقدس ہو، تیری بادشاہت آئے، تیری مرضی جیسی آسمان پر ہے زمین پر بھی پوری ہو، ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے اور ہمارے قرض ہمیں

معاف کر جیسے ہم بھی اپنے قرض داروں کو معاف کرتے ہیں اور ہمیں آزمائش میں مت ڈال بلکہ برائی سے بچا، کیوں کہ بادشاہت اور قدرت اور جلال ہمیشہ تیرا ہی ہے۔ آمین''

نام کی تقدیس ''خدا کی حمد'' ہے بادشاہت کے آنے سے مقصود شاید قیامت اور اعمال کے فیصلہ کا دن ہے، جو دعائے قرآنی میں ﴿ مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ۝ ﴾ کے لفظ سے ادا ہوا ہے۔ نیز استعارہ کی زبان میں روز کی روٹی سے مراد دنیاوی روٹی نہ لی جائے۔ بلکہ روح کی غذا یا صراط مستقیم لی جائے اور قرض سے مراد فرائض اور حقوق لئے جائیں، جو خدا کی طرف سے انسانوں پر عائد ہیں، آزمائش میں نہ پڑنے اور برائی سے بچنے کے معنی وہی لئے جا سکتے ہیں جو اسلامی دعا کے خاتمہ میں مذکور ہے کہ ''یہ ان کا راستہ ہے جن پر تیرا غضب آیا اور جو سیدھے راستہ سے بہک گئے ہیں۔'' اس تشریح سے مقصود یہ ہے کہ یہ چاروں دعائیں جو چار اولوالعزم پیغمبروں کی زبانِ نبوت سے ادا ہوئیں، کسی قدر معنوی اشتراک کی وجہ سے باہم وہی نسبت رکھتی ہیں جو تکمیل دین کے مختلف مدارج میں کسی کو نظر آ سکتی ہے۔ دعائے محمدی ﷺ تکمیلی شکل کی آئینہ دار ہے، وہ مختصر ہے، تاثیر سے لبریز ہے خدا کی تمام صفات کاملہ کا مرقع ہے، تمام مقاصد اور احکام شریعت کی جامع ہے، اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں ہر انسان کے دل کی نمائندگی کر سکتی ہے، وہ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں اور خدا کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہیں۔ نیز وہ خدا کی رحمت عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے، جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے خدا کی وہ تین صفتیں جن کا تصور کیے بغیر خدا کا تصور پورا نہیں ہو سکتا۔ (یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت) یہ سورہ ان سب کی جامع ہے، ربوبیت میں وہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ رحمت اس کی وہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام جمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے اور پوری سورہ دعا کے اغراض ثلاثہ حمد اچھائیوں کے لئے درخواست اور برائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے۔ طرز بیان خدا اور بندہ کے شایان شان ہے۔ درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں۔ اوصاف الٰہی وہی ہیں جو ایک دعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دعا میں عموم ہے، وہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے، اس لئے دنیاوی چیزوں کا ذکر نظر انداز کیا گیا ہے۔ خدا کے اوصاف اور بندہ کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے۔ یعنی دونوں حصوں نے مناسبت کے ساتھ جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے، خدا کے عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندہ کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع مختصر اور پر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا اور کہاں مل سکتا ہے۔

نماز کے لیے تعینِ اوقات کی ضرورت

نماز کے سلسلہ میں اسلام کا ایک اور تکمیلی کارنامہ اوقات نماز کی تعیین ہے، ظاہر ہے کہ دنیا کا کوئی کام وقت اور زمانہ کی قید سے آزاد نہیں ہو سکتا، اس لیے کسی کام کے کرنے کے لیے وقت سے بے نیازی ممکن نہیں، اب سوال یہ ہے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس دین کامل کو لے کر مبعوث ہوئے اس کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ وہ عملی ہے، محض نظری نہیں، اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں، بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے، انسان کی نفسی (سائیکولوجیکل) خصوصیت یہ ہے کہ جو کام مداومت کے ساتھ اس کو کرنا ہوتا ہے، جب تک وہ اس کے اوقات نہ مقرر کر لے، کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلا ناغہ انجام نہیں دے سکتا اسی لیے ہر منظم باقاعدہ اور دائمی عمل کے لیے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے، اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو وہ ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے، یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آ جاتا ہے، اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے ہیں۔

اوقاتِ نماز کے تقرر میں وہ چیز بھی مدنظر ہے جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے، یعنی اصول وحدت جو اسلام کا اصلی رمز اور شعار ہے۔ مسلمان مختلف شہروں، ملکوں اور اقلیتوں میں ہزاروں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں، مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرۂ ہوا میں لگی ہوئی دور بین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں، کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع میں، ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی منظر آنکھوں کے سامنے رہے گا، مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے، جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اس وقت وہاں ادا ہوتا ہے۔ یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی، اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ارضی تو کجا ایک محلہ، ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نظر نہیں آ سکتے تھے۔

نماز کے اوقات دوسرے مذہبوں میں

اسی لیے اوقات کے تقرر اور تعین کی اس مصلحت کو دنیا کے تمام مذہبوں نے یکساں تسلیم کیا ہے اور اپنے اپنے نظریوں اور اصولوں کے مطابق عبادتوں کے مختلف اوقات مقرر کر رکھے ہیں، ہندو آفتاب کے طلوع و غروب کے وقت پوجا پاٹ کرتے ہیں، زردشتی صرف طلوع آفتاب کے وقت زمزمہ خواں ہوتے ہیں، رومن کیتھولک عیسائی صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے، پھر شام کو، پھر رات کو سوتے وقت دعا مانگتے ہیں، یہودیوں میں تین وقت کی نمازیں ہیں جن کو "تیفلاً" کہتے ہیں، دانیال نبی کی کتاب میں ہے:

"جب دانیال کو معلوم ہوا کہ نوشتہ پر دستخط ہو گئے تو وہ اپنے گھر آیا اور اپنی کوٹھڑی کا دروازہ جو بیت المقدس کی طرف تھا، کھول کر اور دن بھر میں تین مرتبہ گھٹنے ٹیک کر خدا کے حضور میں جس طرح سے پہلے کرتا تھا، دعا اور شکر گزاری (حمد) کرتا رہا...... پر ہر روز وہ تین بار دعا مانگتا ہے۔"

(۶۔۱۰ تا ۱۴)

حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور میں ان تین وقتوں کی تعیین ان لفظوں میں ملتی ہے:

"پر میں خدا کو پکاروں گا، تب خدا مجھے بچا لے گا، شام کو اور صبح کو اور دوپہر کو میں فریاد کروں گا اور نالہ کروں گا، سو وہ میری آواز سن لے گا۔" (۵۵۔۱۶۔۱۷)

اسلامی اصطلاح میں ہم ان کو فجر، ظہر اور مغرب کی نمازیں کہہ سکتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دعاؤں اور نمازوں کی اہمیت اور زیادہ بڑھائی، لوقا کی انجیل میں ہے:

"پھر اس نے (حضرت عیسیٰ نے) اس لیے کہ ان کو ہمیشہ دعا میں لگے رہنا اور سستی نہ کرنا، ضرور ہے ایک تمثیل کہی۔" (۱۸۔۱)

حواریوں کے اعمال سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں بھی نماز کے کچھ اوقات وہی تھے جو یہودیوں میں تھے اور کچھ اور زیادہ تھے، ظہر کی نماز ان کے ہاں بھی تھی، چنانچہ اعمال میں ہے:

"پطرس دوپہر کے قریب کوٹھے پر دعا مانگنے گیا۔" (اعمال ۱۰۔۹)

لیکن ان کے علاوہ بعض اوقات بڑھائے بھی گئے۔ ایک جگہ ہے:

"پس پطرس اور یوحنا ایک ساتھ دعا کے وقت تیسرے پہر ہیکل کو چلے۔" (اعمال ۳۔۱)

یونانی میں تیسرے پہر کی بجائے نویں گھڑی کو لکھا ہے جس کو ہم عصر کہتے ہیں، پھر اسی وقت کی نماز کا ذکر اعمال ۱۰۔۳ میں بھی ہے۔

ایک دفعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کسی شاگرد نے نماز کی خاص دعا دریافت کی، آپ نے بتائی اور فرمایا کہ دعا کا بہترین وقت آدھی رات ہے۔

اور ایسا ہوا کہ وہ ایک جگہ دعا مانگ رہا تھا جب مانگ چکا، ایک نے اس کے شاگردوں میں سے اس سے کہا کہ اے خداوند! ہم کو دعا مانگنا سکھا، جیسا کہ یوحنا (حضرت یحییٰ علیہ السلام) نے اپنے شاگردوں کو سکھایا اس نے ان سے کہا، جب تم دعا مانگو تو کہو...... اس نے ان سے کہا، تم میں سے کون ہے، جس کا ایک دوست ہو اور وہ آدھی رات کو اس کے پاس آ کر کہے، اے دوست! مجھے تین روٹی ادھار دے۔'' (لوقا۔۱۱)

اس تمثیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے رات کی نماز کی تعلیم دی ہے، چنانچہ جس شب کو انہیں گرفتار کیا گیا وہ ایک جماعت کے ساتھ اسی نماز تہجد میں مصروف تھے۔ (لوقا۔۲۲۔۳۹)

صبح کی نماز کا ذکر بھی انجیل میں موجود ہے، مرقس کے پہلے باب کی ۳۵ آیت میں ہے: ''اور بڑے تڑکے پو پھٹنے سے پہلے وہ اٹھ کے نکلا اور ایک ویران جگہ میں گیا اور وہاں دعا مانگی۔'' [1] بلکہ عربی ترجمہ سے جو براہ راست یونانی سے ہوا ہے۔ [2] یہ ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام دواما اس وقت نماز پڑھا کرتے تھے، چنانچہ اس میں اس آیت کا عربی ترجمہ یہ ہے: ''وفی الصبح باکرا جدا قام وخرج ومضی الی موضع خلاء وکان یصلی هُنَاكَ'' یعنی وہ وہاں نماز پڑھا کرتے تھے۔ اب ان اوقات کو جو یہودی اور عیسوی کتابوں میں مذکور ہیں ہم جمع کرلیں، تو وہی اسلامی نماز کے اوقات ہو جائیں گے جن میں سے صبح (فجر) دوپہر (ظہر) اور شام (مغرب) کا ذکر زبور (۵۵۔۱۶۔۱۷) میں، صبح کا مرقس (۱۔۳۵) میں عصر کا اعمال (۳۔۱، ۱۰، ۳۔۳۰) میں ہے اور عشاء (رات) کی نماز کا لوقا (۱۱، ۲۲، ۳۹) میں۔

نماز کے لیے مناسب فطری اوقات

اصل یہ ہے کہ حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دعا و نماز میں مصروف رہتا، مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب سے ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا، اس لیے شریعت نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے، ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے، صبح کو بیدار ہوتا ہے، دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے، پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں دل بہلاتا ہے، شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے، اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے، تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں، نور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حی علی الصلوٰۃ کا نغمہ جانفزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے عالم کے صانع کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی

[1] مطبوعہ لندن ۱۸۶۵ء۔ [2] مطبوعہ مطبع ادبیہ بیروت ۱۸۸۶ء و مطبع آکسفورڈ ۱۸۹۰ء۔

نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیاۃ امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے، اس لیے مناسب ہے کہ اس دن کے، کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدۂ نیاز کا طغرا نقش ہو، اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے، دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کر کے آدمی تھوڑی دیر کے لیے آرام کرتا ہے، اس موقع پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیرو خوبی ختم ہو گیا، پھر سہ پہر کے بعد جب اپنے اس دن کا کام ختم کر کے سیر و تفریح اور ذاتی آرام کے کام شروع ہوتے ہیں۔ تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے، اس کے بعد شام ہوتی ہے اور دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے، دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام وسکون کا دور شروع ہوتا ہے، اس لیے ضرور ہے کہ اس کا سرنامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو، پھر سوتے وقت جب انسان اپنی با احساس زندگی سے کچھ دیر کے لیے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس جہان سے بے خبر ہو، کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی ان بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں، اسی لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی، اسی طرح عشا سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے، یہ وقت صرف خوابِ راحت کے لیے موزوں ہے، ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں، انھیں کام کے اوقات کے شروع میں نمازِ پنجگانہ مقرر ہوئی ہے۔

اسلامی اوقاتِ نماز میں ایک نکتہ

اوقاتِ نماز کی تعیین میں اسلام کے لیے ایک اور اصول کو بھی پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے، دنیا کے مشرکانہ مذاہب کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے شرک کا سب سے بڑا مظہر جسدِ کائنات کا سب سے زیادہ تابناک چہرہ (آفتاب) ہے ہندوستان، ایران، بابل، عرب، مصر، شام، روم، یونان ہر جگہ سورج کی پرستش کی جاتی تھی، جس کی روشنی قلوبِ انسانی کی تاریکی کا سب سے بڑا سبب بنتی تھی، آفتاب پرست قوموں میں آفتاب کی پرستش کے خاص اوقات تھے، جب وہ صبح کو اپنے شاہانہ جاہ وجلال کے ساتھ نمودار ہوتا ہے، پھر جب وہ آہستہ آہستہ مملکت نیمروز کو فتح کر کے دنیا پر اپنے فاتحانہ تسلط کا اعلان کرتا ہے، پھر شام کو جب وہ عالمِ کائنات سے رخصت ہو کر نقابِ شب میں اپنا چہرہ چھپا لیتا ہے۔ سب سے پہلا موحد جس نے آفتاب پرستی کو گل کیا [1] حضرت ابراہیم خلیل اللہ تھے۔ ملتِ ابراہیمی میں نماز کے وہ اوقات مقرر کیے گئے، جب ستارہ پرستوں کے خدائے اعظم (آفتاب) کے ظہور اور عروج کا نہیں بلکہ اس کے زوال اور غروب کا وقت ہوتا ہے، تاکہ یہ اوقات خود زبان حال سے شہادت دیں کہ یہ آفتاب پرستی کے باطل عقیدہ کے خلاف اس خدائے برحق

[1] ٦/ الانعام: ٧٩۔

کی عبادت ہے، جس کے آستانہ کمال کے سجدہ سے خود آفتاب کی پیشانی بھی داغدار ہے، دینِ محمدی، ملتِ ابراہیمی کا دوسرا نام ہے، اس لیے اس میں بھی نماز کے اوقات وہی رکھے گئے جو ملتِ ابراہیمی میں تھے، دن نکلنے سے پہلے جب باطل پرستی کا یہ دیوتا (آفتاب) پردۂ عدم میں روپوش ہوتا ہے، دوپہر کے بعد جب یہ اپنے انتہائی عروج کو پہنچ کر انحطاط اور تنزل کی طرف جھکتا ہے، اس انحطاط اور تنزل کے بھی دو تین دور ہوتے ہیں جب سر (سمت الراس) سے نیچے اُترتا ہے، جس کو زوال کہتے ہیں، جب آنکھوں کے دائرہ تقابل سے نیچے اترتا ہے جس کو عصر کہتے ہیں اور پھر جب دائرہ نظر (افق) سے نیچے گرتا ہے جس کو مغرب کہتے ہیں، آفتاب کے ان تینوں اوقاتِ انحطاط میں ایک نماز اور ہوتی ہے، خوب اچھی طرح ڈوبنے کے بعد جب وہ تاریکی کی قبر میں مدفون ہو جاتا ہے، اس وقت عشاء کی نماز ادا کی جاتی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں نماز کے اوقات کے ذکر میں آفتاب کے ڈھلنے اور تاریک ہونے کا خاص طور سے ذکر آیا ہے:

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۷۸)

''نماز کھڑی کر آفتاب کے انحطاط کے وقت، رات کی تاریکی تک، (ظہر، عصر، مغرب، عشاء) اور فجر کی نماز۔''

تفصیل آگے آتی ہے۔

غرض یہی سبب ہے کہ اسلام میں کوئی فرض نماز صبح سے دوپہر تک نہیں رکھی گئی کہ یہ آفتاب کے عروج کا وقت ہے، بلکہ تمام نمازیں آفتاب کے ہر تدریجی انحطاط، تنزل اور روپوشی کے اوقات میں ہیں، نیز یہی سبب ہے کہ اسلام میں آفتاب نکلتے وقت، اس کے عروج و کمال کے وقت اور اس کے ٹھیک ٹھیک غروب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے [1] کہ یہ آفتاب پرستوں کی عبادت کے خاص اوقات ہیں۔

اسلام میں طریق و اوقاتِ نماز

نماز کس طرح اور کن کن اوقات میں ادا کرے اور کتنی کتنی رکعتیں کر کے پڑھنی چاہیے اور اس کے کیا آداب و شرائط ہیں، ان سب کے لیے قرآن پاک میں ایک جامع آیت ہے جو لڑائی کی حالت میں نماز ادا کرنے کی تفصیل کے سلسلہ میں مذکور ہے:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۗ وَقُوْمُوْا لِلّٰهِ قٰنِتِيْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُكْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَمَا عَلَّمَكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۳۸۔۲۳۹)

''نمازوں پر اور بیچ کی نماز پر پابندی کرو اللہ کے لیے (نماز میں) ادب سے کھڑے ہو، پھر اگر

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب الاوقات التی نهی عن الصلوة فيها: ۱۹۲۰تا۱۹۲٦۔

دشمنوں کا خوف ہو یا تو پیادہ ہو کر یا سوار ہو کر (نماز پڑھو) پھر جب تم کو امن ہو جائے تو خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے تم کو سکھایا جس سے تم پہلے واقف نہ تھے۔''

اس آیت پاک سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے کہ ان باتوں کی کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے، خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے جس طرح خود قرآن پاک کی، اس اجمال کی تفصیل سنت نبوی کے ذریعہ احادیث میں تحریر، اور مسلمانوں کے نسلاً بعد نسلِ متفقہ تواتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

نمازوں کی پابندی ونگرانی

اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ہم نمازوں کو پابندی سے ادا کریں، ان کی نگہداشت رکھیں، اور ان پر مداومت کریں۔ قرآنِ پاک میں نماز کی پابندی، نگہداشت اور مداومت کے لیے ایک خاص لفظ ''محافظت'' کا استعمال کیا گیا ہے جس کے لفظی معنی نگرانی کے ہیں اور جس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں۔ فرمایا:

﴿ حٰفِظُوْا عَلَى الصَّلَوٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

''نمازوں کی نگرانی رکھو۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (۷۰/ المعارج:۳٤)

''اور جو اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔''

﴿ وَالَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَوٰتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (۲۳/ المؤمنون:۹)

''اور جو لوگ اپنی نمازوں کی نگرانی رکھتے ہیں۔''

﴿ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ﴾ (٦/ الانعام:۹۲)

''اور وہ اپنی نماز کی نگرانی رکھتے ہیں۔''

ایک آیت میں یہ بھی فرمایا:

﴿ الَّذِيْنَ هُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ دَآئِمُوْنَ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۳)

''جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں۔''

ان آیتوں سے ثابت ہوا کہ نماز ایسا فرض ہے جو کسی مسلمان سے کسی حال میں معاف نہیں ہو سکتا اور اس کو ہمیشہ پابندی کے ساتھ وقت پر اور اس کے سارے شرائط کے ساتھ ادا کرنا چاہیے۔

نماز کے اوقات مقرر ہیں

اس کے بعد یہ مسئلہ ہے کہ نماز کے لیے اللہ تعالیٰ نے کچھ اوقات مخصوص فرمائے ہیں۔ ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ كِتٰبًا مَّوْقُوْتًا۝ ﴾ (٤/ النسآء:١٠٣)

''بے شبہ نماز مسلمانوں پر مقررہ اوقات میں فرض ہے۔''

اس آیت پاک سے معلوم ہوا کہ ہماری فرض نمازوں کے لیے اوقات مخصوص ہیں۔

وہ اوقات کیا ہیں؟

ادائے نماز کے لیے قرآن نے زیادہ تر تین لفظ استعمال کیے ہیں صلوٰۃ یا اقامتِ صلوٰۃ، تسبیح اور ذکر اللہ۔ پہلا لفظ اقامتِ صلوٰۃ نماز کے لیے مخصوص ہے، لیکن دوسرا اور تیسرا لفظ عام تسبیح وتحمید اور یادِ الٰہی کے لیے بولا جاتا ہے، جس کا جزو اعظم تسبیح وتحمید ہے، احادیث میں بھی تسبیح کے معنی نماز پڑھنے کے ہیں۔ [1] اور اشعار عرب [2] ولغت عرب [3] سے بھی اس کا ثبوت ملتا ہے۔ قرآن میں جب اس لفظ (تسبیح) کے ساتھ وقت کی تخصیص ہوگی تو اس سے کسی شبہ کے بغیر نماز کے علاوہ کوئی اور چیز مراد نہیں ہوسکتی، کیونکہ وقتِ مخصوص کے ساتھ اسلام میں نماز کے علاوہ کوئی عام تسبیح فرض نہیں ہے البتہ اوقات کی تخصیص کے بغیر قرآن نے جہاں تسبیح کا حکم دیا ہے، اس سے خدا کی عام یاد و توصیف مراد ہوسکتی ہے۔ اس تمہید کے بعد حسب ذیل آیتوں پر نظر کرنی چاہیے:

1. ﴿ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا۝ نِّصْفَهٗۤ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا۝ ﴾ (٧٣/ المزمل:٢-٤)

''رات کو کھڑا رہا کر مگر کچھ کم یا آدھی رات یا اس سے کچھ گھٹا دے یا بڑھا لے اور قرآن (اس میں) ٹھہر ٹھہر کر پڑھ۔''

2. ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ۝ ﴾ (٤٠/ المؤمن:٥٥)

''اور اپنے رب کی حمد سہ پہر اور صبح کو کر۔''

3. ﴿ وَّسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۝ ﴾ (٣٣/ الاحزاب:٤٢)

''اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو کیا کرو۔''

4. ﴿ وَتُسَبِّحُوْهُ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا۝ ﴾ (٤٨/ الفتح:٩)

''اور تم اس کی پاکی صبح کو اور سہ پہر کو بیان کرو۔''

5. ﴿ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ۝ ﴾ (٧/ الاعراف:٢٠٥)

---

[1] صحیح مسلم، باب استحباب صلوٰۃ الضحٰی:١٦٦٢ "ما رایت رسول اللّٰہ ﷺ یصلی سبحۃ الضحٰی قط وانی لا سبحھا" نیز صحیح مسلم، باب جواز صلاۃ النافلۃ علی الدابۃ، ١٦١٠، ١٦١٨، ١٦١٩؛ مسند احمد، ٦/ ١١٨۔ [2] اعشی وائل کا شعر ہے: وسبح علی حین العشیات والضحیٰ۔ ولا تحمد الشیطان واللّٰہ فاحمدا (شعراء الجاھلیۃ ج٣، ص: ٣٦٥ وکتاب شعراء النصرانیۃ (قسم ثالث فی شعراء بکر بن وائل من بنی عدنان) ص: ٣٦٥ بیروت)۔ [3] لسان العرب، ج٢، ص: ٨٢، مصر۔

''اور تو اپنے پروردگار کو اپنے دل میں گڑگڑا کر اور پست آواز میں، صبح کو اور دوپہر کو یاد کر اور بھولنے والوں میں سے نہ ہو۔''

6 ﴿ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ (٦/ الانعام:٥٢)

''اے رسول! ان کومت نکال جو اپنے پروردگار کو صبح کو اور سہ پہر کو پکارتے ہیں۔''

7 ﴿ فِيْ بُيُوْتٍ اَذِنَ اللّٰهُ اَنْ تُرْفَعَ وَيُذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ ۙ يُسَبِّحُ لَهٗ فِيْهَا بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ ۙ﴾

(٢٤/ النور:٣٦)

''ان گھروں میں جن کو بلند کرنے کا حکم خدا نے دیا ہے اور ان میں خدا کا نام لیا جاتا ہے اور ان میں وہ لوگ جن کو دنیا کا کاروبار خدا سے غافل نہیں کرتا، صبح اور سہ پہر کو خدا کی پاکی بیان کرتے ہیں۔''

8 ﴿ وَاصْبِرْ نَفْسَكَ مَعَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ ﴾ (١٨/ الكهف:٢٨)

''اور تو (اے رسول) اپنے کو ان لوگوں کے ساتھ روکے رہ جو اپنے پروردگار کو صبح اور سہ پہر کے وقت پکارتے ہیں۔''

9 ﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِيْنَ تَقُوْمُ ۙ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاِدْبَارَ النُّجُوْمِ ؏﴾

(٥٢/ الطور:٤٨ـ٤٩)

''اور تو اپنے پروردگار کی حمد کی پاکی بیان کر، جب تو اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔''

10 ﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ؕ﴾ (١١/ هود:١١٤)

''اور نماز کو قائم کر دن کے دونوں کناروں میں اور رات کے کچھ ٹکڑوں میں۔''

11 ﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ﴾ (١٧/ بني اسرآئيل:٧٨ـ٧٩)

''نماز قائم کر آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی ابتدائی تاریکی تک اور فجر کا پڑھنا، بیشک فجر کا پڑھنا پُرحضور ہے اور رات کو کچھ دیر جاگ کر مزید نماز پڑھ (تہجد)۔''

12 ﴿ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهٗ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيْلًا ۝﴾

(٧٦/ الدهر:٢٥ـ٢٦)

''اور اپنے پروردگار کا نام یاد کر صبح کو اور سہ پہر کو اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور بڑی رات تک اس کی تسبیح کر۔''

13 ﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ

آنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَأَطْرَافَ النَّهَارِ لَعَلَّكَ تَرْضٰى﴾ (۲۰/ طٰہٰ:۱۳۰)

’’کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس کے ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ حصوں میں اس کی تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں تاکہ تو خوش رہے۔‘‘

14 ﴿فَسُبْحٰنَ اللّٰهِ حِيْنَ تُمْسُوْنَ وَحِيْنَ تُصْبِحُوْنَ ۝ وَلَهُ الْحَمْدُ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَعَشِيًّا وَّحِيْنَ تُظْهِرُوْنَ ۝﴾ (۳۰/ الروم:۱۷۔۱۸)

’’تو خدا کی تسبیح پڑھو، جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں اور دوپہر کو اور جب تم دوپہر کرو۔‘‘

15 ﴿فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَأَدْبَارَ السُّجُوْدِ ۝﴾ (۵۰/ ق:۳۹)

’’تو ان کافروں کے کہے پر صبر کر اور اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور ڈوبنے سے پہلے اور کچھ رات میں تسبیح پڑھ اور ڈوبنے کے بعد۔‘‘ [1]

16 ﴿مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ وَحِيْنَ تَضَعُوْنَ ثِيَابَكُمْ مِّنَ الظَّهِيْرَةِ وَمِنْ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ﴾

(۲۴/ النور:۵۸)

’’فجر کی نماز سے پہلے اور جب دوپہر کی گرمی کے سبب سے کپڑے اتارتے ہو اور عشا کی نماز کے بعد۔‘‘

ان اوپر کی آیتوں میں نماز کے مختلف اوقات کا ذکر ہے، ان میں سے بعض مکرر ہیں اور بعض نہیں۔ مکرر اوقات کو ملا دینے کے بعد یہ وہی پانچ وقت ہو جاتے ہیں، جن میں رسول اللہ ﷺ تمام عمر نماز ادا فرماتے رہے اور آپ کے بعد آپ کے صحابہ اور اس وقت سے لے کر آج تک تمام روئے زمین کے مسلمان نسلاً بعد نسلٍ ادا کرتے آئے ہیں اور جن کے مشہور نام، فجر، ظہر، عصر، مغرب، عشاء ہیں، غدو ، غداة ، بكرة ، فجر، قبل طلوع شمس اور حين تصبحون کے معنی صبح کی نماز، اصیل ، عشی اور قبل غروب الشمس سے مراد عصر، دلوك الشمس (زوال) اور حين تظهرون (جب دوپہر کرو) سے مقصد ظہر، طرف النهار دن کا کنارہ اور تمسون (جب شام کرو) سے مراد مغرب اور من آناء الليل (کچھ رات گزرے) غسق الليل (رات کی ابتدائی تاریکی) اور صلوٰة العشاء سے مقصود عشاء کی نماز ہے اور یہی نماز کے پانچ اوقات ہیں، جن میں خدا کی یاد اور تسبیح وتحمید کا ہم کو حکم دیا گیا ہے۔

[1] جمہور کے نزدیک اس کا ترجمہ ہوگا سجدہ کے بعد اور عام اہل تفسیر نے اس سے فرض نمازوں کے بعد کی تسبیح وتہلیل مراد لی ہے۔

اوقات کی تکمیل

نمازوں کے اوقات کی تدریجی تکمیل

اسلام کا آغاز سب کو معلوم ہے کہ کس غربت ،مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا تھا ،اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی ،لوگ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھا کرتے تھے۔سورۂ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے ،یہ آیتیں ہیں:

﴿ يَاأَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا ۝ نِصْفَهُ أَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيلًا ۝ أَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيلًا ۝ إِنَّا سَنُلْقِي عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيلًا ۝ إِنَّ نَاشِئَةَ اللَّيْلِ هِيَ أَشَدُّ وَطْئًا وَأَقْوَمُ قِيلًا ۝ إِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيلًا ۝ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱_۷)

''اے کملی اوڑھ کر سونے والے ،تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھا کر ،آدھی رات تک یا اس سے کچھ کم یا اس سے (کچھ) زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ہم تجھ پر عنقریب ایک بھاری بات ڈالنے والے ہیں۔یعنی (شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں) بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیتِ قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لیے زیادہ مناسب ہے ،بے شبہ تجھ کو دن کے وقت آرام کی فرصت حاصل ہے۔''

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی ،کیونکہ جہاں

﴿ وَأَنْذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۱٤)

''اپنے قریب کے اہل خاندان کو ہشیار کرو۔''

کے ذریعہ سے دعوت کے اعلان کا حکم آیا ہے ،وہیں یہ بھی اسی کے بعد مذکور ہے:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ ﴾ (۲۶/ الشعرآء:۲۱۷_۲۲۰)

''اور غالب مہربان پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو اس وقت دیکھتا ہے جب تو (نماز کے لیے) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیرا پھرنا (دیکھتا ہے) بے شک وہی سنتا اور جانتا ہے۔''

اس کا مقصد یہ ہے کہ اعلانِ دعوت کا حکم ملنے سے پہلے آنحضرت ﷺ ان دشمنوں کے بیچ میں راتوں کو اٹھ کر خود نماز پڑھتے تھے اور مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے کہ کون نماز میں مصروف ہے اور کون سویا ہوا ہے جس کو نماز کے لیے جگانا چاہیے۔ایسی پرخطر حالت میں آپ کا راتوں کو تن تنہا یہ فرض انجام دینے کے لیے نکلنا اس اعتماد پر تھا کہ خدا آپ ﷺ کو خود دیکھ رہا ہے اور آپ کی حفاظت کر رہا ہے ،اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز (تہجد) کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشاء) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک نماز

(فجر) اضافہ کی گئی۔

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَإِدْبَارَ النُّجُومِ ۝ ﴾ (٥٢/ الطور:٤٨-٤٩)

''اور اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کھینچ، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور اپنے رب کی تعریف کی تسبیح کر جب تو (رات کو تہجد کے وقت) اٹھتا ہے اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کے پیٹھ پھیرتے وقت۔''

یہ آیت سورۂ طور کے آخر میں ہے اور سورۂ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی [1] اور شاید اس وقت جب قریش نے آنحضرت ﷺ کو ایذا دینا شروع کر دیا تھا۔ کیونکہ اسی سورہ میں اس آیت سے پہلے آپ کے مصائب اور ان پر صبر کرنے اور فیصلہ الٰہی کے انتظار کا حکم اور آپ کی ہر قسم کی حفاظت کی خوشخبری ہے، ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق ہے۔ سورۂ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۂ طور کے بعد اتری ہے، انہی معنوں کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جس کو عصر کہیے اور بڑھتی ہے:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ آثِمًا أَوْ كَفُورًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَأَصِيلًا ۝ وَمِنَ اللَّيْلِ فَاسْجُدْ لَهُ وَسَبِّحْهُ لَيْلًا طَوِيلًا ۝ ﴾ (٧٦/ الدهر .٢٤-٢٧)

''تو اپنے پروردگار کے فیصلہ کا انتظار کر اور ان مخالفوں میں سے کسی گناہ گار یا اللہ کے ناشکر گزار کا کہنا نہ مان اور صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کیا کر۔''

اب رات کی دیر تک کی نمازِ تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے، یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ہنوز اصیل [2] میں ظہر و عصر اور من الیل (رات) میں مغرب اور عشاء کی تفریق نہیں ہوئی تھی، کیوں کہ کل تین نمازیں تھیں ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو، اسی لیے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا، جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے۔

اب یہ ان تین وقتوں کی تسبیح و تحمید با قاعدہ نماز کا قالب اختیار کرتی ہے حکم ہوتا ہے:

﴿ وَأَقِمِ الصَّلَاةَ طَرَفَيِ [3] النَّهَارِ وَزُلَفًا مِنَ اللَّيْلِ ﴾ (١١/ هود:١١٤)

---

[1] صحیح بخاری، تفسیر طور واقعة جبیر بن مطعم:٤٨٥٤۔

[2] اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں، عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہو اس کو اصیل کہتے ہیں، لسان العرب میں اصیل کے معنی عشی لکھے ہیں، جو عصر کے لیے سورۂ روم میں استعمال ہوا ہے۔

[3] طرفی النهار کو مختلف طریقوں سے قرآن مجید میں ادا کیا گیا ہے قبل طلوع الشمس وقبل غروبها ، بالعشی والابکار بالغدو والاصال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرۃ اور غدو ہے دوسرا طرف عصر عشی اور اصیل ہے۔

''دن کے دونوں کناروں میں (یعنی فجر اور عصر) اور رات کے ایک ٹکڑے میں نماز پڑھا کر۔''

یہ آیت سورۂ ہود کی ہے جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں اکثر انبیا علیہم السلام کے متعلق یہ بیان کر کے کہ انہوں نے اپنی اپنی امت کو خدائے برحق کی عبادت کی دعوت دی۔ آنحضرت ﷺ کو بھی نماز کی اقامت کا حکم دیا گیا ہے اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلہ میں یہ پہلی آیت ہے۔ جس میں تسبیح کی بجائے باقاعدہ صلوٰۃ کی اقامت کا حکم آیا ہے، اس وقت مسلمانوں کی خاصی تعداد تھی جیسا کہ اس سے پہلے کی آیت سے ظاہر ہوتا ہے:

﴿ فَاسْتَقِمْ كَمَآ اُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ﴾ (۱۱/ ھود :۱۱۲)

''پس تو سیدھا چلا چل جیسا کہ تجھ کو حکم دیا گیا ہے اور وہ جنھوں نے تیرے ساتھ توبہ کی (وہ بھی سیدھے چلیں) اور تم لوگ حد سے آگے نہ بڑھو۔''

اب رات کی طویل نماز کو چھوڑ کر تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوتی ہیں۔ ایک دن کے ایک کنارہ میں یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت، دوسری دن کے دوسرے کنارے میں دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصہ میں۔ پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی جس کو پہلے اصیل کہا گیا تھا اور تیسری سے عشاء کی نماز مراد ہے۔ ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال اور ابہام تھا، دوسری میں ظہر وعصر اور تیسری میں مغرب وعشاء کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں۔ اب رات کی نمازیں سب سے پہلے علیحدہ ہوتی ہیں۔ سورۂ ق میں جو مکی سورہ ہے۔ اللہ تعالیٰ اپنے اوقاتِ خلق کو بیان کرنے کے بعد فرماتا ہے:

﴿ فَاصْبِرْ عَلٰى مَا يَقُوْلُوْنَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ ۚ وَمِنَ الَّيْلِ فَسَبِّحْهُ وَاَدْبَارَ السُّجُوْدِ ﴾ (۵۰/ ق:۳۹)

''پس ان (مخالفوں) کے کہنے پر (اے رسول) صبر کر اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے (صبح) اور اس کے ڈوبنے سے پہلے (عصر) اپنے پروردگار کی حمد وتسبیح کر اور کچھ رات گئے پر (عشاء) اس کی تسبیح کر اور (آفتاب کے) [1] سجدہ کرنے کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کر۔''

صبر کی تلقین سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ حکم اس وقت کا ہے جب کفار قریش ہنوز آپ کی ایذا وتحقیر کے درپے تھے۔ اس آیت پاک میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشاء کی تعیین کر دی گئی۔ ایک کی

[1] آفتاب کا لفظ چونکہ پہلے آچکا ہے، اس لیے ادبار السجود سے ادبار الشمس مراد ہے۔ جیسا کہ قبل الغروب سے قبل غروب الشمس مقصود ہے۔ آفتاب کے سجدہ کرنے سے مراد اس کا ڈوب جانا ہے۔ جیسا کہ صحیح بخاری وغیرہ کی احادیث میں ہے کہ ''غروب کے بعد آفتاب خدا کو سجدہ کرتا ہے۔'' چونکہ آفتاب کے ڈوبنے کے لیے غروب کا لفظ پہلے آچکا تھا۔ اس لیے کلام کی فصاحت کا اقتضا یہ تھا کہ اب اس کے لیے دوسرا لفظ لایا جائے۔ چنانچہ اس معنی کے لیے سجود کا لفظ استعارۃً لایا گیا۔ سجود اصل میں زمین پر پیشانی رکھنے کو کہتے ہیں اور غروب کے وقت آفتاب کی یہی حالت ہوتی ہے، اس طرز ادا سے آفتاب پرستوں کی تردید مقصود ہے۔ اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے نماز کے لیے سجود شمس کا ذکر کیا کہ جس وقت آفتاب کا سر خالق کے آگے سجدہ میں ہو، تم بھی اپنا سر اپنے خالق کے آگے جھکاؤ۔ تفسیروں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایتیں ہیں کہ اس سے مراد مغرب کی نماز کے بعد کی دو رکعتیں ہیں۔

نسبت کہا گیا﴿ وَمِنَ الَّیۡلِ ﴾ (کچھ رات گئے) اور دوسری کی نسبت کہا گیا:﴿ وَاَدۡبَارَ السُّجُوۡدِ ﴾ (آفتاب کے ڈوبنے پر) اوقات نماز کی تفصیل کے سلسلہ میں رات سے آغاز اس لیے کیا گیا کہ یہ نسبتہً کفار سے محفوظ رہنے کا وقت تھا۔ زوال کے بعد سے غروب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار (دن کے دونوں کناروں میں) اور یہاں قبلِ غروب کی نماز کہا گیا ہے۔ ہنوز تفصیل طلب ہے جس کے اندر ظہر وعصر دونوں نمازیں داخل ہیں۔ چنانچہ سورۂ روم میں جو مکہ میں نازل ہوئی ہے۔ اس کی تفصیل کی گئی ہے۔ اس سورہ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی شکستِ کامل کے بعد جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں چھٹے سال سے لے کر آٹھویں نویں سال تک ہے۔

﴿ فَسُبۡحٰنَ اللّٰہِ حِیۡنَ تُمۡسُوۡنَ وَحِیۡنَ تُصۡبِحُوۡنَ ۝ وَلَہُ الۡحَمۡدُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَعَشِیًّا وَّحِیۡنَ تُظۡہِرُوۡنَ ۝ ﴾ (۳۰/ الروم:۱۷۔۱۸)

’’اللہ کی تسبیح کرو، جب شام (یارات) کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمان اور زمین میں ہے اور اخیر دن کو اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔‘‘

اس آیت پاک میں زوال کے بعد (ظہر) اور غروب سے قبل (عصر) کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ایک کو عشی (عصر) اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔ تمام آیتوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، طور، دہر، ہود، قٓ، روم اور نور میں۔ ظہر کا بالا جمال، دہر، قٓ، طٰہٰ اور اسراء میں اور بالتصریح اسراء اور روم میں، عصر کا بقرہ، دہر ہود، طٰہٰ، قٓ اور روم میں، مغرب کا بالا جمال ہود، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح قٓ میں عشاء کا بصورتِ صلوٰۃ اللیل مزمل، طور اور دہر میں اور بصورت عشاء بالا جمال طٰہٰ، ہود اور روم میں اور بالتصریح قٓ اور ہود میں ہے۔ تمام نمازوں کا بالا جمال تذکرہ بقرہ اسراء، اور طٰہٰ میں ہے۔ طور سے فجر اور عشاء دو وقتوں کی نماز اسراء، ہود اور طٰہٰ سے کم از کم بظاہر تین وقتوں کی، روم سے چار وقتوں کی (اگر مساء سے صرف مغرب مراد لیں) اور طٰہٰ اور روم سے پانچ وقتوں کی نماز ثابت ہے۔

ایک نکتہ

جمع بین الصلوتین

اوپر کی آیتوں پر غور کی نظر ڈالنے سے ایک عجیب نکتہ حل ہوتا ہے۔ پہلی آیتوں میں ظہر اور عصر کی نمازیں مجمل ہیں، یعنی دونوں کو ایک لفظ قبل الغروب یا اصیل یا طرفی النہار کے ذریعہ سے بیان کیا گیا ہے، آخر آیت میں جو سورۂ روم کی ہے ظہر وعصر کی نمازوں کا نام تصریح کے ساتھ آیا ہے۔ مگر شام کی نماز میں اجمال ہے۔ یعنی مغرب وعشاء دونوں کو ﴿حین تمسون﴾ (جب رات کرو) کے ذریعہ سے ادا کر دیا گیا ہے۔ اس سے اس جانب ایک لطیف اشارہ نکلتا ہے کہ یہ دونوں مل کر ایک بھی ہیں اور علیحدہ بھی ہیں، اسی بنا پر کسی اشد ضرورت اور سفر کی بے اطمینانی کے وقت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر بھی ادا کر سکتے ہیں [1] اور صبح کی نماز چونکہ ہر آیت میں ہمیشہ علیحدہ ذکر کی گئی ہے۔ اس لیے اس کا کسی دوسری نماز سے ملانا جائز نہیں ہے۔ احادیث میں جمع بین الصلوتین کے عنوان سے آنحضرت ﷺ کی عملی مثالیں اس نکتہ قرآنی کی تشریح میں موجود ہیں۔

اوقات پنجگانہ اور آیتِ اسراء

محدثین اور مؤرخین کا اتفاق عام ہے کہ نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعیین معراج میں ہوئی ہے۔ جو ہماری تحقیق کے مطابق بعثت کے بارہویں سال اور ہجرت سے ایک سال پہلے واقع ہوئی تھی۔ گو اوقات پنجگانہ کا ذکر سورۂ ق اور روم میں موجود ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن اقامتِ صلوٰۃ کے امر کے ساتھ سب سے پہلے اسی سورۂ اسراء (معراج) میں نماز پنجگانہ کا حکم ہوتا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ نماز پنجگانہ کی تکمیل بصورتِ صلوۃ اسی معراج میں ہوئی۔ جس طرح وضو پر عمل گو پہلے سے تھا، مگر اس کا حکم قرآن میں مدنی سورتوں کے اندر نازل ہوا ہے۔ سورۂ اسراء (معراج) کی وہ آیت جس میں نماز پنجگانہ کا ذکر ہے، حسب ذیل ہے:

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب قصر الصلاة فى السفر، باب الجمع بين الصلوتين فى السفر والحضر: ۳۲۹، ۳۳۰؛ مسلم، كتاب صلاة المسافرين، باب جواز الجمع بين الصلوتين فى السفر: ۱۶۲۱ تا ۱۶۲۷؛ ترمذى، باب ما جاء فى الجمع بين الصلوتين ۵۵۳ ۔بعض مستشرقین کو جمع بین الصلوتین کی حدیثیں دیکھ کر یہ شبہ پیدا ہوا ہے کہ زمانہ نبوی میں شاید تین وقت کی نمازیں ادا ہوتی تھیں۔ (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام میں فاضل وینسک کو بھی یہی شبہ ہوا ہے دیکھو اس کا مضمون صلوٰۃ) مگر حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ نمازیں ہمیشہ پانچ وقتوں کی ہوتی ہیں البتہ بضرورت ظہر وعصر کو ایک ساتھ اور مغرب وعشاء کو ایک ساتھ ملا کر پڑھ لیتے تھے۔ رکعتیں اتنی ہی رہتی تھیں۔ صرف وقت میں کمی ہو جاتی تھی۔ فقہا میں باہم اس کے متعلق اختلاف ہے کہ دو دو نمازوں کو یکجا کن صورتوں میں پڑھا جا سکتا ہے۔ احناف کے نزدیک حقیقی طور سے صرف ایک موقع پر حج میں عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو ظہر اور عصر دونوں ظہر کے وقت ادا کی جاتی ہیں۔ کیونکہ اس دن عصر کا وقت خاص حج کی دعاؤں کے لیے ہے۔ بقیہ نمازوں میں حنفیہ کے نزدیک حقیقی یکجا نہیں بلکہ محض صورۃً دو دو نمازیں ایک ساتھ ادا کی جا سکتی ہیں۔ اس کی صورت یہ ہے کہ ایک نماز اخیر وقت میں اور دوسری اول وقت میں پڑھی جائے حنفیہ کے علاوہ دوسرے فقہا کے نزدیک سفر میں حقیقۃً دو نمازیں یکجا ایک وقت میں پڑھی جا سکتی ہیں اور آنحضرت ﷺ نے ایسا کیا ہے۔ شیعوں میں دو دو نمازوں کے ایک ساتھ پڑھنے کا عام رواج ہے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآءیل:۷۸)

''آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور فجر کی قراءت قائم کر بے شک فجر کی قراءت میں حضور ہوتا ہے۔''

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح بیان کرتی ہے۔ اس میں سب سے اہم اور تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے، دلـوك کے اصلی معنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں، لیکن تحقیق طلب یہ ہے کہ دلوك الشمس یعنی آفتاب کے جھکنے سے کیا مراد ہے؟ اور اہلِ عرب اس کو کن معنوں میں بولتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ عربی میں اس لفظ کا اطلاق تین اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر، مقابل نقطۂ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلـوك (جھکاؤ) پر نماز پڑھو، تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم آئی۔ غرض یہ ہے کہ اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین دلوک یا جھکاؤ ہوتے ہیں۔ ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطۂ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے، پہلا ظہر کا وقت ہے، دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا اور اس کے ہر دلوک یعنی انحطاط پر اس کی خدائی کی نفی و تردید اور خدائے برحق کی الوہیت کے اقرار و اعلان کے لیے ایک ایک نماز رکھی گئی ہے، اس طرح "دلــوك" کے لفظ کے اندر تین نمازوں کے وقت بتائے گئے ہیں، چوتھی نماز کا وقت غسق الليل (رات کی تاریکی) ہے، یہ عشاء کی نماز ہے اور اس کو حقیقت میں نصف شب کو ادا ہونا چاہیے، جب آفتاب کا چہرہ نورانی تو بر تو حجابات ظلمت میں چھپ جاتا ہے۔ لیکن لوگوں کی تکلیف کے خیال سے وہ سونے سے پہلے رکھی گئی، تاکہ خواب کی غفلت کی تلافی اس سے ہو جائے اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر (صبح کا پڑھنا) بتایا گیا ہے، یہ آفتاب کے طلوع سے پہلے اس لیے ادا کی جاتی ہے کہ عنقریب وہ ظاہر ہو کر اپنے پرستاروں کو اپنی طرف متوجہ کرے گا، اس لیے ضروری ہے کہ دنیا اس کے طلوع سے پہلے ہی خالقِ اکبر کا نام لے اور اس باطل پرستی سے جس میں آفتاب پرست عنقریب مبتلا ہونے والے ہیں۔ تبری ظاہر کرے۔ غرض اس آیت پاک سے اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اب ہم کو یہ دکھانا ہے کہ کلام عرب میں آفتاب کے ان تینوں جھکاؤ یا میلانات پر دلوک کا اطلاق ہوتا ہے۔ اگر کلام عرب سے یہ ثابت ہو جائے تو اس آیت سے اوقات پنجگانہ کی تشریح کے قبول کرنے میں کسی کو عذر نہ ہوگا۔

دلوک کی تحقیق

مفسرین میں سے بعض نے دلوک سے زوال کا وقت اور بعض نے غروب کا وقت مراد لیا ہے اور اہل لغت نے بھی اس کے یہ دونوں معنی لکھے ہیں اور ایک تیسرے معنی اور بھی بیان کیے ہیں، یعنی مقابل نقطۂ نگاہ

سے ہٹ جانا اور اس کے ثبوت میں ایک جاہلی شاعر کا شعر بھی پیش کیا ہے۔ چنانچہ لسان العرب میں ہے:

ودلكت الشمس تدلك دلوكًا غربت وقيل: اصفرت ومالت للغروب وفي التنزيل العزيز ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ وقد دلكت زالت عن كبدالسماء ـــ وقال الفراء عن ابن عباس فى دلوك الشمس انه زوالها الظهر قال ورأيت العرب يذهبون بالدلوك الى غياب الشمس قال الشاعر:

هــذا مــقــام قــدمــى ربــاح
ذبــب حتــى دلــكــت بــراح

يعنى الشمس قال ابومنصور: وقد روينا عن ابن مسعود انه قال دلوك الشمس غروبها وروى ابن هانىء عن الا خفش انه قال: دلوك الشمس من زوالها الى غروبها. وقال الزجاج: دلوك الشمس زوالهافى وقت الظهرو ذالك ميلها للغروب وهو دلوكها ايضًا يقال قد دلكت براح و براح اى قدمالت للزوال حتى كادالناظر يحتاج اذاتبصر ها ان يكسر الشعاع عن بصره براحته ... فان قيل مامعنى الدلوك فى كلام العرب قيل الدلوك الزوال و لذالك قيل للشمس اذازالت نصف النهار دالكة و قيل لها اذا افلت دالكة لا نها فى الحالتين زائلة ـــ قال الفراء فى قوله براح جمع راحة و هى الكف يقول يضع كفه على عينيه ينظر هل غربت الشمس بعد۔ [1]

”آفتاب کا دلوک ہوا یعنی وہ (۱) غروب ہوا اور کہا گیا ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ (۲) آفتاب زرد ہو گیا اور غروب کے لیے جھک گیا اور قرآن میں ہے کہ دلوک شمس کے وقت رات کی تاریکی تک نماز کھڑی کر اور آفتاب کو دلوک ہوا یعنی (۳) وہ آسمان کے بیچ سے ہٹ گیا... اور فراء نے کہا کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ دلوکِ شمس کے معنی ظہر کے وقت آفتاب کے زوال کے ہیں اور اس نے بیان کیا کہ میں نے اہلِ عرب کو دلوک سے آفتاب کا غروب مراد لیتے دیکھا ہے، شاعر کہتا ہے: یہ وہ جگہ ہے جہاں لڑائی میں رباح کے دونوں قدم جمے تھے، اس نے دشمنوں سے اپنی عزت کی حفاظت کی، یہاں تک کہ سورج ہتھیلی سے جھک گیا، ابومنصور نے کہا کہ ہم نے ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ دلوک شمس آفتاب کا غروب ہے اور ابن ہانی نے اخفش سے نقل کیا کہ دلوکِ شمس ظہر کے وقت آفتاب کا زوال ہے اور اس کے معنی غروب کے لیے جھکنا بھی ہیں اور یہ بھی اس کا دلوک ہے۔ محاورہ میں کہا جاتا ہے کہ دلکت براح و براح یعنی آفتاب زوال کے لیے جھک گیا۔ یہاں تک کہ دیکھنے والا

[1] لسان العرب، ج۱، ص:۱۰۰۵۔

جب اس کی کو دیکھنا چاہے تو اس کرن کی شدت کو توڑنے کے لیے اس کو آنکھ پر ہتھیلی رکھنے کی ضرورت ہے..... تو اگر کہا جائے کہ عرب کے محاورہ میں دلوک کے کیا معنی ہیں؟ تو جواب دیا جائے گا کہ دلوک کے معنی زوال کے ہیں اور اسی لیے آفتاب کو دالـــکۃ کہتے ہیں۔ جب وہ دوپہر کو جھک جائے اور جب آفتاب ڈوب جاتا ہے تب بھی اس کو دالـکۃ کہتے ہیں کیوں کہ ان دونوں حالتوں میں وہ جھک جاتا ہے۔ فراء نے کہا کہ اس قول (شعر یا محاورہ) میں جو براح کا لفظ ہے، یہ راحۃ کی جمع ہے جس کے معنی ہتھیلی کے ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں آنکھوں پر ہتھیلی رکھ کر دیکھتا ہے کہ آفتاب ابھی غروب ہوا یا نہیں۔"

شعرائے عرب نے آفتاب کے ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آ جانے کے وقت آنکھوں پر ہتھیلی رکھنے کا اکثر ذکر کیا ہے۔ عجاج کہتا ہے:

والشمس قد كادت تكون دلفا ادفعها بالراح كي تزحلفا [1]

"اور آفتاب قریب تھا کہ بیمار ہو کر دبلا ہو جائے میں اس کو ہتھیلی سے ہٹاتا تھا، تاکہ وہ ہٹ جائے۔"

اس دوسرے شعر سے پہلے شعر کے معنی کھل جاتے ہیں کہ اس میں دلوک سے زوال اور غروب کے بجائے وہ وقت مراد ہے، جب آفتاب ڈھل کر آنکھوں کے سامنے آ جاتا ہے اور یہ عصر کا وقت ہوتا ہے۔ الغرض دلوک کا لفظ آفتاب کے ہر جھکاؤ پر برابر بولا جاتا ہے، اس کا پہلا جھکاؤ زوال کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت الراس سے ہٹتا ہے دوسرا جھکاؤ عصر کے وقت ہوتا ہے جب وہ مقابل کی سمت نظر سے ہٹتا ہے اور مغرب کی طرف چلنے والوں کی آنکھوں کے سامنے پڑتا ہے، اس وقت شعاعوں کی تیزی سے بچنے کے لیے آدمی کو آنکھوں کے اوپر ہتھیلی رکھنے یا کسی اور چیز سے آڑ کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور اس کا تیسرا جھکاؤ غروب کے وقت ہوتا ہے، جب وہ سمت افق سے نیچے ہو کر ڈوب جاتا ہے۔ ان ہی تین مسلسل اوقات کی وجہ سے جو زوال سے لے کر غروب تک کے زمانہ پر مشتمل ہیں، بعض اہل لغت نے جیسا کہ اوپر گزرا تسامحاً یہ کہہ دیا ہے کہ دلوک زوال سے غروب تک کے وقت کو کہتے ہیں حالانکہ اس کا اطلاق تحقیقی طور سے آفتاب کے تین میلانات پر کیا جاتا ہے اول اس میلان پر جو سمت الراس سے ہوتا ہے، پھر اس میلان پر جو سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور بالآخر اس کامل میلان پر جو سمت افق سے ہوتا ہے اور یہ اوقات زوال سے غروب تک مسلسل یکے بعد دیگرے چند چند گھنٹوں کے بعد آتے ہیں، اس تمام بحث کا نتیجہ یہ ہے کہ

﴿ أَقِمِ الصَّلَوٰةَ لِدُلُوكِ الشَّمْسِ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۷۸)

"آفتاب کے دلوک کے وقت نماز کھڑی کر۔"

---

[1] یہ شعر تفسیر طبری میں آیت مذکورہ کے تحت میں اور لسان العرب میں دلف ج ۱۲ ص: ۱۰۱۹ اور زحلف، ج ۲ ص: ۱۶ کے تحت میں مذکور ہے۔

سے مراد تین نمازیں ہیں، کیوں کہ تین دلوک ہوتے ہیں: ظہر (۱) جب آفتاب کا دلوک (جھکاؤ) سمت الراس سے ہوتا ہے، (۲) عصر جب اس کا دلوک سمتِ نظر سے ہوتا ہے اور مغرب (۳) جب اس کا کامل دلوک سمتِ افق سے ہوتا ہے [1] اس کے بعد غسق اللیل (رات کی تاریکی) اور قرآن الفجر (فجر کی قراءت) سے ظاہر ہے کہ عشا اور فجر کی نمازیں مراد ہیں، اس طرح اس آیت سے جو سورۂ اسراء میں واقع ہے اوقات پنجگانہ میں اقامتِ صلوٰۃ کے اوقات کی تشریح ہو جاتی ہے۔

اوقاتِ نماز کا ایک اور راز

اس آیت کریمہ کو ایک دفعہ اور پڑھو تو معلوم ہوگا کہ نماز کے اوقات کا آغاز ظہر (میلان اول آفتاب) سے ہوتا ہے اور یہی اس حدیث سے بھی ثابت ہے، جس میں بذریعہ جبریل نماز کے اوقات پنجگانہ کی تعلیم کا ذکر [2] ہے اس میں پہلے ظہر کا نام آتا ہے پھر بہ ترتیب اور چاروں نمازوں کا، ظہر کے بعد عصر پھر مغرب پھر سونے سے پہلے عشاء یہ چار نمازیں تقریباً دو تین گھنٹوں کے فاصلہ سے ہیں، اس کے بعد صبح کی نماز ہے، جو عشاء سے تقریباً سات آٹھ گھنٹوں کا فصل رکھتی ہے اور پھر صبح سے ظہر تک تقریباً اس قدر فصل ہے۔ چنانچہ اس آیت میں ظہر سے عشاء تک ایک ساتھ نماز کا مسلسل حکم ہے، چند گھنٹے ٹھہر کر صبح کا حکم ہوتا ہے، پھر خاموشی ہو جاتی ہے یہاں تک کہ آفتاب طلوع ہو کر ایک لمبے وقفے کے بعد پھر ظہر کا وقت آتا ہے اور اسی طرح دور قائم ہو جاتا ہے غرض ظہر سے عصر، عصر سے مغرب اور مغرب سے عشاء تک مسلسل نمازیں ہیں، پھر صبح تک استراحت کا طویل وقفہ ہے، صبح اٹھ کر خدا کی یاد ہوتی ہے اور پھر انسانی کاروبار کے لیے ایک طویل وقفہ رکھا گیا ہے، جو صبح سے ظہر تک ہے اور اس میں کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی ہے۔

اوقاتِ پنجگانہ کی ایک اور آیت

سورۂ اسراء کی آیت کی طرح سورۂ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں اوقات پنجگانہ کی تفصیل ہے، وہ یہ ہے:

﴿ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوْعِ الشَّمْسِ وَقَبْلَ غُرُوْبِهَا ۚ وَمِنْ اٰنَآئِ الَّيْلِ فَسَبِّحْ وَاَطْرَافَ النَّهَارِ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۳۰)

''اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح پڑھ آفتاب نکلنے سے پہلے اور اس (آفتاب کے) ڈوبنے سے پہلے اور رات کے کچھ وقت میں تسبیح پڑھ اور دن کے کناروں میں۔''

---

[1] تفسیروں میں بھی صحابہ کی روایتوں سے انہیں نمازوں کا باختلافِ روایت مراد ہونا مذکور ہے۔ حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ دلوک سے غروب آفتاب اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما زوالِ آفتاب مراد لیتے ہیں۔ اسی طرح غسق اللیل کو بعض لوگ مغرب اور بعض عشاء سمجھتے ہیں اور فیصلہ یہ کرتے ہیں کہ دلوک شمس سے ظہر اور عصر اور غسق اللیل سے مغرب اور عشاء اور قرآن الفجر سے نمازِ صبح مراد ہے اور اس طرح ان کے نزدیک بھی یہ آیت اوقاتِ پنجگانہ کو بتاتی ہے۔

[2] سیرت ابن ہشام، باب ابتداء فرضیت صلوۃ، ج ۱، ص: ۱۵۶۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر ہے، رات کے کچھ وقت سے عشاء مراد ہے اور دن کے کناروں میں ظہر اور مغرب ہے۔

اطراف النہار کی تحقیق

یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اطراف کا لفظ جمع ہے، جو کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے، اس بنا پر دن کے تین طرف (کنارے) ہونے چاہئیں، دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں، صبح اور شام یا تین ہیں، اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے۔یعنی صبح دوپہر اور شام۔پہلی شق لی جائے تو صبح کا ذکر مکرر ہو جاتا ہے اور ظہر غائب ہو جاتی ہے، دوسری شق اختیار کی جائے تو گو ظہر آجاتی ہے، مگر پھر بھی صبح مکرر ہی رہتی ہے۔

اس لفظی اعتراض کا جواب یہ ہے کہ اطراف گو جمع ہے، مگر کلام عرب میں تثنیہ یعنی دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے اور خود قرآن مجید میں اس کے استعمالات موجود ہیں، مثلاً: ایک جگہ مشرقین اور مغربین دو مشرق اور دو مغرب ہے۔دوسری جگہ انہیں کو مشارق اور مغارب کہا گیا ہے سورۂ تحریم میں ہے ﴿فَقَدْ صَغَتْ قُلُوْبُكُمَا﴾ (تم دونوں کے قلوب) ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو قلب ہوں گے، قلوب (بصیغہ جمع) نہیں ہوسکتا، مگر یہ زبان کا محاورہ اور بول چال ہے۔اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں، اس بنا پر اطراف سے مراد صرف دو طرف ہیں۔یہ سب کے نزدیک مسلم ہے کہ دن کے دو ہی ممتاز حصے ہیں، ایک صبح سے دوپہر تک اور دوسرا دوپہر سے شام تک، اطراف سے انہیں دونوں حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں۔صبح سے مراد دوپہر تک کے حصہ کا آخری کنارا ظہر ہے اور دوپہر سے غروب تک کے حصہ کا آخری کنارا عصر یا مغرب ہے، لیکن چونکہ عصر کا ذکر قبل غروبھا کے اندر مستقل موجود ہے، اس لیے متعین ہوگیا کہ یہاں اس سے مراد مغرب ہے۔

ایک اور طریقۂ ثبوت

اگر ہم قرآن پاک کی علیحدہ علیحدہ آیتوں سے اوقات پنجگانہ پر استدلال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔مثلاً:

1. ﴿أَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۷۸)

"زوال آفتاب کے وقت نماز کھڑی کر۔"

یہ ظہر کی نماز ہے۔

2. ﴿وَقَبْلَ الْغُرُوْبِ﴾ (۵۰/ ق: ۳۹)

"اور غروب آفتاب سے پہلے خدا کی تسبیح کرو۔"

﴿وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ بُكْرَةً وَّاَصِيْلًا﴾ (۷۶/ الدھر: ۲۵)

"اپنے پروردگار کا نام لو صبح کو اور عصر [1] کو۔"

---

[1] الاصيل الوقت بعد العصر الى المغرب (صحاح جوہری ولسان العرب، ج ۱، ص: ۶۹)۔

یہ عصر کی نماز ہوئی اور اسی کو

﴿ وَالصَّلٰوةِ الْوُسْطٰى ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۸)

''بیچ کی نماز۔''

سورۂ بقرہ میں اس لیے کہا گیا ہے کہ یہ دن کی نمازوں میں ظہر اور مغرب کے بیچ میں واقع ہے۔

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ النَّهَارِ ﴾ (۱۱/ ھود:۱۱٤)

''اور دن کے دونوں (ابتدائی اور انتہائی) کناروں میں نماز کھڑی کر۔''

دن کا ابتدائی کنارہ صبح اور انتہائی کنارہ مغرب ہے۔

سورۂ نور میں ہے کہ صبح کی نماز سے پہلے بے پکارے زنانہ کمرہ یا مکان میں نہ جایا کرو۔

﴿ مِنْ قَبْلِ صَلٰوةِ الْفَجْرِ ﴾ (۲٤/ النور:۵۸)

''صبح کی نماز سے پہلے۔''

اس سے نمازِ صبح کا عملی ثبوت بھی ملا، پھر اسی میں اسی موقع پر ہے۔

﴿ وَمِنْۢ بَعْدِ صَلٰوةِ الْعِشَآءِ ۛ ﴾ (۲٤/ النور:۵۸)

''اور عشاء کی نماز کے بعد۔''

اس کی رو سے مسلمانوں کو عشاء کی نماز کے بعد جو سونے اور کپڑے اُتار دینے کا وقت ہے، کسی کے مکان میں بلا اجازت اندر جانے کا حکم نہیں، یہ بھی نماز عشاء کا عملی ثبوت ہے اور یہی پانچوں اوقاتِ نماز ہیں۔

نماز پنجگانہ احادیث وسنت میں

تمام انبیا علیہم السلام میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص تفوق وامتیاز حاصل ہے، وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آئے، اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے مبہم اور مجمل رہی، بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل فرما کر اور اپنے تمام پیرووں سے اس کی تعمیل کروا کر اس کے متعلق ہر قسم کے پیدا ہونے والے شک وشبہ کی جڑ کاٹ دی۔ اسلام نے جس روزانہ طریق عبادت کو پیش کیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان وآداب وشرائط واوقات وتعداد کی پوری تشریح فرما دی اور ان میں سے ہر چیز ناقابل شک قولی وعملی تواتر کے ذریعہ سے ہم تک پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے؟ اس میں کیا کیا پڑھنا چاہیے؟ کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیے؟ کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں؟ ان میں سے ہر چیز کی آپ نے زبانی تشریح فرمائی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکمِ نماز کے بعد گزری ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے رہے۔ یہاں تک کہ مرض الموت میں بھی اس میں تخلف نہ ہوا اور

آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ مدینہ کی مسجدِ نبوی اور تمام اسلامی مسجدوں میں پنج وقتہ اعلانِ نماز کی آوازیں بلند ہوئیں اور ہر روز پانچ دفعہ ہر جگہ جہاں اسلام کا کلمہ پڑھا جاتا تھا، یہ فرض ادا ہوتا تھا آپ کے بعد تمام خلفائے راشدین اور تمام پیروانِ محمدی جہاں بھی رہے اور جہاں بھی پہنچے، اسی طرح دن میں پانچ بار علی الاشہاد سفر وحضر میں تمام عمر ادا کرتے رہے۔ کیا ایسی مستمر علی الاعلان متواتر اور دوامی چیز میں کسی کو شک واقع ہوسکتا ہے، یہ اہتمام، یہ علانیہ استمرار اور یہ تاکید بلیغ اس لیے فرمائی، تاکہ جس طرح دوسرے پیغمبروں کا طریق عبادت بعد کے پیروؤں کے ترک عمل سے مشتبہ اور عدم صحت نقل سے مشکوک ہوگیا۔ خاتم الانبیا ﷺ کی شریعتِ آخرین کا طریق عبادت اس سے محفوظ رہے، کیوں کہ اگر اب اس شریعت میں شک پڑ جاتا تو پھر کوئی دوسری نبوت آ کر اس کی تجدید و اصلاح کرنے والی نہ تھی۔ چنانچہ اسی بنا پر آج تک تمام پیروانِ محمدی ﷺ میں آپ کی یہ نماز اور اس کے ضروری اور اہم متعلقہ ارکان و شرائط و احکام روایۃً متواتر اور عملاً محفوظ و قائم ہیں۔ نماز وہ فریضۂ الٰہی ہے جس کی فرضیتِ خمسہ کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس ساعت سعید میں دیا، جب آنحضرت ﷺ معراج کے تقربِ خاص سے ممتاز ہوئے۔ حکم ہوا کہ شب و روز میں پانچ نمازیں تم پر اور تمہاری امت پر لکھی گئیں جو پچاس نمازوں کے حکم میں ہیں۔ ❶ قرآن پاک سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ارشاد ہے کہ ﴿مَن جَآءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا﴾ (٦/ الانعام: ١٦٠) یعنی ''جو ایک نیکی کرے گا اس کو دس گنا ثواب ملے گا۔'' اس لیے پانچ نمازیں یقیناً پچاس کے حکم میں ہیں۔ نماز کی فرضیت کے بعد فرشتۂ الٰہی نے اتر کر خود نماز کے طریقِ ادا اور اس کے اوقات خمسہ کی تعلیم کی اور ہر وقت کی ابتدا اور انتہا پر ایک ایک نماز پڑھا کر عملاً ہر چیز کی تلقین کی ❷ اور وہی آپ نے اپنے پیروؤں کو بتایا اور اس پر ان سے عمل کرایا۔ چنانچہ آپ نے شیوعِ اسلام کے بعد ہر جگہ احکامِ شریعت کی تبلیغ و اعلان کے مبلغ جب متعین فرمائے تو ایک بدوی نے جو نجد کے دور دراز راستہ سے سفر کر کے آیا تھا، خدمتِ اقدس میں آ کر عرض کی، یارسول اللہ! آپ کے قاصد نے بتایا ہے کہ دن رات میں پانچ نمازیں فرض ہیں کیا یہ سچ ہے؟ فرمایا: ''ہاں سچ ہے۔'' عرض کی کہ اس ذات کی قسم جس نے آپ کو پیغمبر بنا کر بھیجا کیا خدا نے آپ کو اس کا حکم دیا ہے؟ فرمایا: ''ہاں''۔ ❸

خود آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ ''جبریل اترے اور انہوں نے میری امامت کی تو میں نے ان کے ساتھ نماز پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی، پھر پڑھی یہ فقرے منہ سے کہتے جاتے تھے اور انگلی سے ایک دو تین چار پانچ گنتے جاتے تھے۔'' ❹ ایک دفعہ صحابہ کو خطاب کر کے فرمایا کہ ''اگر کسی کے گھر کے

❶ صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب کیف فرضت الصلوۃ فی الاسراء: ٣٤٩؛ مسلم، کتاب الایمان، باب الاسراء برسول اللّٰہ: ٤١١۔ ❷ صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلوۃ، باب مواقیت الصلوۃ وفضلها: ٥٢١؛ مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس: ١٣٨٠۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب الزکوۃ من الاسلام: ٤٦ وکتاب العلم: ٦٣؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان: ١٠٢۔

❹ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب أوقات الصلوات الخمس: ١٣٧٩۔

سامنے کوئی صاف شفاف نہر جاری ہو اور وہ اس میں دن میں پانچ دفعہ نہاتا ہو تو کیا اس کے بدن پر کچھ میل رہ سکتا ہے؟'' سب نے عرض کی نہیں، نہیں رہے گا فرمایا: ''تو یہی مثال پانچوں وقت کی نمازوں کی ہے کہ ان سے اللہ تعالیٰ گناہوں کو دھو دیتا ہے۔'' ❶ اوقات کی تعیین میں فرمایا کہ'' جب صبح کی نماز پڑھو تو اس کا وقت اس وقت تک ہے جب تک سورج کی پہلی کرن نہ نکل آئے، پھر جب ظہر پڑھو تو اس وقت تک اس کا وقت ہے جب تک عصر کا وقت نہ آ جائے، پھر جب عصر کی نماز پڑھو تو اس کا موقع اس وقت تک ہے کہ آفتاب زرد پڑ جائے۔ پھر جب مغرب پڑھو تو شفق ڈوب جانے تک اس کا وقت ہے، پھر جب عشاء پڑھو تو آدھی رات تک اس کا وقت ہے۔'' ❷ ابو برزہ رضی اللہ عنہ ایک صحابی کہتے ہیں کہ حضور صبح کی نماز میں ساٹھ سے سو آیتیں تک قراءت کرتے تھے اور ظہر زوال کے بعد ادا کرتے تھے اور عصر اس وقت پڑھتے تھے کہ ایک آدمی مدینہ کے آخری کنارہ تک جا کر لوٹ آتا تھا، پھر بھی آفتاب میں جان رہتی تھی، مغرب کی بابت راوی کو سنا ہوا بیان یاد نہیں رہا اور عشاء کو تہائی رات تک ادا کرنے میں آپ تامل نہیں فرماتے تھے ❸ حضرت جابر رضی اللہ عنہ دوسرے صحابی سے نقل کرتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ ظہر کی نماز دوپہر میں پڑھا کرتے تھے اور عصر اس وقت جب سورج باقی رہتا تھا اور مغرب جب سورج ڈوب جاتا تھا اور عشاء میں کبھی دیر کرتے اور کبھی عجلت اور صبح اندھیرے میں پڑھتے تھے۔ ❹ صحابہ کہتے ہیں کہ حضور ظہر اور عصر کی نمازوں کی دو پہلی رکعتوں میں آہستہ آہستہ سورۂ فاتحہ کے ساتھ سورہ پڑھتے تھے کبھی کبھی کوئی آیت سنائی بھی دیتی تھی۔ مغرب میں سورۃ المرسلت پڑھی اور کبھی سورۂ طور پڑھی۔ عشاء میں ﴿اذا السماء انشقت﴾ اور ﴿والتين و الزيتون﴾ قراءت کی ہے اور صبح میں سورۂ طور پڑھی ہے۔ ❺ اس قسم کی اور بیسیوں روایتیں ہیں اور روایتوں پر کیا موقوف ہے، اس وقت سے آج تک تمام اتباعِ محمد رسول اللہ ﷺ کا عملی تواتر دوست و دشمن سب کے نزدیک ناقابل تردید حجت ہے۔ ❻

تہجد اب نفل ہو گئی لیکن کیوں؟

ان نماز پنجگانہ کی تکمیل کے بعد صلوٰۃ اللیل (تہجد کی نماز) جو پہلے فرض تھی، عام امت کے لیے نفل ہو گئی، چنانچہ پوری آیت یہ ہے:

❶ صحيح بخاري، كتاب الصلوة، باب الصلوات الخمس كفارة: ٥٢٨۔

❷ صحيح مسلم، كتاب المساجد ومواضع الصلوٰة، باب اوقات صلوات الخمس: ١٣٨٦۔

❸ صحيح بخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب وقت الظهر عندالزوال: ٥٤١۔

❹ صحيح بخاري، كتاب مواقيت الصلاة، باب وقت العشاء اذا اجتمع الناس اوتأخروا: ٥٦٥۔

❺ صحيح بخاري، كتاب الاذان، باب القراءة في الظهر والعصر والمغرب والعشاء والفجر بروايات متعددة: ٧٥٨ تا ٧٧١۔

❻ چونکہ بعض مستشرقین نے (انسائیکلوپیڈیا آف اسلام لفظ صلوٰۃ) دانستہ یا نادانستہ طور پر اوقاتِ نماز میں غلط فہمی پھیلائی چاہی ہے۔ اس لیے اتنی تفصیل کی ضرورت پڑی، تاکہ ان کی غلط فہمی دور ہو جائے۔

﴿ اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ؕ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰۤى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝ ﴾

(۱۷/ بنی اسرآءیل:۷۸۔۷۹)

''نماز کو آفتاب کے جھکاؤ کے بعد کھڑی کر (ظہر عصر مغرب) رات کی تاریکی تک اور صبح کی قراءت قائم کر، بے شک صبح کی قراءت میں حضور ہوتا ہے اور رات کے حصہ میں تو اٹھ کر (اوقات مقررہ سے) زیادہ نماز پڑھ شاید کہ تجھ کو تیرا رب قابل تعریف مقام میں اٹھائے۔''

غور کرو کہ جب تک اوقات مقرر نہ ہوئے تھے، رات کو دیر تک نماز اور نماز میں جتنا زیادہ قرآن پڑھا جا سکے، پڑھنے کا حکم تھا، گویا یہ پانچوں وقت کی ایک ہی وقت میں نماز تھی یعنی نماز کی پانچ پتیوں والا پھول ابھی تک غنچہ کی طرح ورق بر ورق تھا، جب دو اور تین وقتوں کی نمازیں الگ الگ ہوئیں تو ان کے بقدر رات کی طویل نماز میں تخفیف ہوگئی اور حکم آیا کہ ﴿ فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ؕ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰) یعنی ''قرآن سے اس قدر حصہ پڑھو جتنا آسانی سے پڑھ سکو۔'' [1] اس کے بعد اس آیت پاک میں جب اقامت صلوٰۃ کے اوقات پنجگانہ کا ذکر آیا تو رات کی نماز تہجد کی فرضیت ساقط ہوگئی۔ یہاں ایک قابل ذکر بات اور بھی ہے اور وہ یہ کہ شاید یہ آیت پاک اوقات نماز کی تکمیل کی آخری اطلاع ہے، کیوں کہ اس کے نازل ہونے سے پیشتر قدیم فرض نماز تہجد نفل نہ تھی اور اب نفل ہوگئی۔

قبلہ

انسان کا کوئی کام جس طرح زمانہ سے خالی نہیں ہوسکتا۔ جس کی بنا پر اوقات نماز کی تعیین کی گئی ہے، اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہوسکتا۔ جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ہو گا۔ اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدت صوری قائم نہ رہتی بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب، کوئی پچھم کوئی اتر اور کوئی دکھن رخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ وحدت نظام کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصہ مضحکہ انگیز تماشا بن جاتا، اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت خاص کر لی گئی ہے۔ صابی (ستارہ پرست) قطب شمالی کی طرف منہ کرتے تھے کہ ستاروں میں وہی ہے، جو نظر آنے کے باوجود اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرتا، بلکہ برقرار رہتا ہے۔ [2] آفتاب پرست سورج کی طرف منہ کرتے ہیں، آتش پرست آگ کو سامنے رکھتے ہیں اور بت پرست کوئی نہ کوئی بت آگے رکھ لیتے ہیں۔ اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رخ کرتی تھیں۔ یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ

[1] صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ: ۸۸۵، نیز دیکھو فتح الباری، ج ۱، ص: ۳۹۳۔

[2] الرد علی المنطقیین لابن تیمیۃ ومجموع فتاویٰ شیخ الاسلام ابن تیمیہ، ج۹، ص:۲۱۶۔

الیسینی نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنالیا تھا۔شامی عیسائی بھی اسی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے [1] بنی اسرائیل میں بھی قبلہ ضروری تھا، توراۃ سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحٰق اور حضرت یعقوب علیہم السلام کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے، اس جگہ کو چند پتھروں سے گھیر کر خدا کا گھر ''بیت ایل'' [2] بنالیتے تھے قرآن مجید میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعہ سے ان کو حکم ہوا تھا کہ گھروں کو قبلہ رخ بنائیں اور نماز ادا کریں:

﴿ وَّاجْعَلُوْا بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (۱۰/ یونس:۸۷)

''اور اپنے گھروں کو قبلہ رخ کرلو اور نماز کھڑی کرو۔''

بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہد قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے۔حضرت داؤد علیہ السلام کے زبور میں ہے۔

''لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیری مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔''(۵۔۷)

سلاطین اوّل میں ہے:

''جب تیرا گروہ لڑائی کے لیے اپنے دشمن کے برخلاف نکلے، جہاں کہیں تو انہیں بھیج دے اور خداوند کے آگے دعا مانگے ، اس شہر کی طرف جس کو تو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے میں نے تیرے نام کے لیے بنایا۔''(۷۔۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے:

''اور اس زمین کی طرف جس کو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تو نے چن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا تجھ سے دعا مانگیں۔''(۴۸)

اہل عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی ، اس لیے اہل عرب کا قبلہ کعبہ تھا، اس تمام تفصیل سے قرآن مجید کی اس آیت کی تشریح ہوتی ہے:

﴿ وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۸)

''اور ہر ایک امت کا ایک قبلہ ہے، جدھر وہ منہ پھیرتی ہے،تو اے مسلمانو! نیکیوں کی طرف دوڑو۔''

اوپر کے بیان سے واضح ہوا ہوگا کہ دنیا کے تین مذاہب میں تین قسم کے قبلے تھے،ستارہ پرست یا ستارہ پرستی سے متاثر، پرستش کے لیے کسی وقت کسی ستارہ کو قبلہ بناتے تھے، مثلاً: آفتاب پرست آفتاب کے طلوع کے رخ یعنی مشرق کو اور صابئ (ستارہ پرست) قطب شمالی کو،عناصر پرست یا بت پرست اپنی پرستش کے عنصر

[1] یہ تفصیلات انسائیکلو پیڈیا آف اسلام لفظ ''قبلہ'' میں ہیں ج ۲۸ ،ص:۹۸۵۔

[2] سفر تکوین باب:۱۲۔۸عہد نامہ قدیم ،ص:۱۹و۱۳۔۴و۲۸۔۱۷، ۱۸۔۱۹ ایضا ،ص:۳۵و۳۱۔۱۳۔

یعنی آگ یا کسی دریا یا کسی بت کو قبلہ قرار دیتے تھے، موحدین اپنی مرکزی مسجد کو قبلہ سمجھتے تھے۔
ابراہیمی قوموں میں اسی قسم کی مرکزی مسجدیں دو تھیں، مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) اور مسجد حرام (خانہ کعبہ) پہلی مسجد کی تولیت حضرت اسحاق اور ان کی اولاد کے سپرد ہوئی تھی، اس لیے وہ ان کا قبلہ تھی۔ دوسری مسجد کے متولی حضرت اسمٰعیل علیہ السلام اور ان کے بیٹے تھے، جنہوں نے اس قبلہ کو بنایا تھا۔ آنحضرت ﷺ جب تک مکہ معظمہ میں رہے، خانہ کعبہ کی طرف اس طرح منہ کر کے کھڑے ہوتے تھے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے پڑ جاتے تھے، لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ تھی، کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا، تاہم کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک چونکہ اجازت نازل نہیں ہوئی تھی، آپ ﷺ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے تھے، کہ وہی انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ گاہ تھا لیکن آپ ﷺ کی طبعی خواہش یہ تھی کہ اس تازہ ملت ابراہیمی کے لیے وہی ابراہیمی مسجد (خانہ کعبہ) قبلہ قرار پائے، جس کی تولیت اس کے بانی (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کی طرف سے بنی اسماعیل کے سپرد ہوئی تھی، چنانچہ سورۂ بقرہ کے وسط میں اس کے متعلق احکام نازل ہوئے جن میں سب سے پہلے بتایا گیا کہ خدا کو کسی جہت اور سمت سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہ بے سمت ہے اور سب سمتیں اسی کی ہیں:

﴿ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۱۵)

’’اور خدا ہی کے لیے ہے پورب اور پچھم، تو جدھر رخ کرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے، بیشک اللہ بڑی گنجائش، اور وسعت والا اور بڑے علم والا ہے۔‘‘

اس کی گنجائش اور وسعت میں ہر سمت داخل ہے اور ہر جہت کی اس کو خبر ہے، یہ آیت کریمہ قبلہ کے تعین کی کسی ایسی تشریح کو جس سے شرک کا شائبہ پیدا ہو سکے قطعاً غلط قرار دیتی ہے اور دوسری آیت میں بھی یہی مضمون ادا ہوا ہے:

﴿ سَيَقُوْلُ السُّفَهَاۗءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰىهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِىْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۭ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۭ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۲)

’’بے وقوف لوگ کہیں گے کہ ان (مسلمانوں) کو ان کے اس قبلہ سے کس نے ہٹا دیا، جس پر وہ تھے، کہہ دے کہ پورب اور پچھم دونوں خدا کے ہیں، وہ جس کو چاہتا ہے سیدھا راستہ دکھاتا ہے۔‘‘

یہود جن کو سب سے زیادہ اعتراض یہ تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر، مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا، ان کو خطاب کر کے فرمایا:

﴿ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۖ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (٢/ البقرة ١٧٧)

''نیکی یہ نہیں کہ تم اپنے منہ مشرق اور مغرب کی طرف پھیر، والبتہ نیکی یہ ہے کہ خدا، قیامت، فرشتوں، کتابوں اور پیغمبروں پر ایمان لائے اور اپنی دولت کو اس کی محبت کے باوجود (یا خدا کی محبت پر) رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں، سائلوں اور غلاموں کو (آزاد کرانے میں) دے اور نماز پڑھے اور زکوۃ دے اور (نیکی یہ ہے) جو اپنے وعدہ کو پورا کرتے ہیں اور سختی اور تکلیف اور جنگ میں صبر کرتے ہیں، یہی وہ ہیں جو سچے ہوئے اور یہی پرہیز گار ہیں۔''

اس تصریح سے یہ اچھی طرح ثابت ہو جاتا ہے کہ اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے، قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رخ کیا جائے، عبادت کے لیے کوئی ضروری چیز نہیں ہے، لیکن چونکہ نمازوں میں امت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رخ کی تخصیص کی حاجت تھی، اسی لیے ۲ھ میں خانہ کعبہ کے قبلہ بنانے کا حکم ہوا:

﴿ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ ۭ ﴾

(٢/ البقرة:١٤٤)

''پس تو اپنا منہ مسجد حرام (خانہ کعبہ) کی طرف پھیر اور تم لوگ جہاں بھی ہو اسی کی طرف اپنے منہ پھیرو۔''

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں، بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا، جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں سے نماز پڑھی جا سکے، اس طرح مشرق، مغرب، جنوب، شمال، سب بہ یک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہیں، جس سے ایک لطیف رمز یہ نکلتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے اور اس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ سمت کے تعین سے اس سمت کی مرکزی چیز (مثلاً: آفتاب یا قطب شمالی وغیرہ) کی مسجودیت اور معبودیت کا جو تخیل پیدا ہوتا تھا اور جس سے بت پرستی اور ستارہ پرستی کا رواج ہو گیا تھا اس کا کلیتہ خاتمہ ہو گیا۔

لیکن یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کی بجائے مسجد حرام (کعبہ) قرار دی گئی، جس میں بہت سی مصلحتیں تھیں:

❶ یہ ضرور تھا کہ کوئی ایسی چیز ہو جس کی طرف ہر شخص ہر جگہ سے ہر ملک میں منہ پھیر سکے، ایسی چیز یا تو کوئی

مصنوعی شے ہوسکتی تھی، مثلاً: چراغ، کوئی موی شمع، کوئی تصویر، کوئی مجسمہ، کوئی کتاب، جیسا کہ اوپر گزرا بعض اہل مذاہب ان چیزوں کو سامنے رکھتے تھے جن کی وہ پرستش کرتے تھے، مثلاً: بت، مجسمہ، آگ، پانی، آفتاب، وغیرہ اشیاء وعناصر کو اب، ظاہر ہے کہ اسلام اگر ایسا کرتا تو وہ بھی کھلی ہوئی بت پرستی میں گرفتار ہو جاتا، دوسری صورت یہ تھی کہ اشیاء کو نہیں بلکہ سمت کو خاص کیا جاتا مثلاً: شمال یا مشرق کہ پہلی سمت میں جگہ سے نہ ٹلنے والا قطب تھا اور دوسری چہرہ خورشید کا مطلع اور بیاض سحر کا دیباچہ تھی، دین توحید کے لیے یہ بالکل ناممکن تھا کہ ستارہ پرستی کے ابطال کے ساتھ ساتھ ستارہ پرستی کے علامات اور امتیازات کو قائم رکھے۔

❷ یہ کہنا ممکن ہے کہ شمال اور مشرق کو چھوڑ کر جن کی طرف منہ کرنا ستارہ پرستی ہوتی، کسی اور سمت کا انتخاب کیا جاسکتا تھا مگر یہ کھلی ہوئی بات ہے کہ چار سمتوں میں سے کسی ایک کا انتخاب کسی نہ کسی مرجح سبب ہی کی بنا پر ہو سکتا ہے، ورنہ خدا کے لحاظ سے تو ہر سمت برابر تھی اب جو بھی سمت اختیار کی جاتی اس کے لیے ضروری تھا کہ اس کی تخصیص کی کوئی مناسب وجہ بھی ہوتی، سمت کی تعیین آفتاب یا دوسرے ممتاز ستاروں کا طلوع وغروب کا لحاظ کیے بغیر ممکن ہی نہیں، کیونکہ ہر سمت میں کوئی نہ کوئی مشہور ستارہ ہے، جس کی سیدھ سے وہ سمت متعین کی گئی ہے، اس لیے جو سمت بھی اختیار کی جاتی اس سے اس سمت کا خاص ستارہ کے تعلق وجوہ ترجیح کا پیدا کرنا ضروری تھا اور اس ترجیح سے دین توحید کا دین شرک بن جانا لازمی تھا۔

❸ اسی لیے ملت ابراہیمی نے ان صورتوں کو چھوڑ کر ہمیشہ کسی قربان گاہ یا مسجد کو اپنا قبلہ بنایا، تاکہ شرک کے ہر قسم کے شائبہ سے اس کی نماز محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا، ایک بیت المقدس جس کو حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے تیار کرایا اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ بنی، دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔

❹ اسلام کا دعویٰ ہے کہ خانہ کعبہ، بیت المقدس سے پہلے بنا تھا، وہ دنیا میں پہلا گھر تھا جو خدا کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا اور اس کے معمار خود حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا ﴾ (۳/ آل عمران:۹۶)

''بے شک سب سے پہلا مبارک گھر جو انسانوں کے لیے (خدا کا) بنا، وہ ہے جو مکہ میں ہے۔''

﴿ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۷)

''اور جبکہ ابراہیم اور اسماعیل بیت اللہ کے کھمبے اٹھا رہے تھے۔''

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار عہد اسلام کے یہود کو بھی نہ تھا، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۴)

''اور جن کو کتاب دی گئی وہ جانتے ہیں کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا حق ہے (اور وہ) ان کے پروردگار کی طرف سے (ہے)۔''

پولوس (پال) ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے لکھتا ہے:

کہ یہ لکھا ہے ابرہام (حضرت ابراہیم علیہ السلام) کے دو بیٹے تھے، ایک لونڈی (ہاجرہ) سے دوسرا آزاد (سارہ) سے، پر وہ جو لونڈی سے تھا (اسماعیل علیہ السلام) جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا (اسحٰق علیہ السلام) سو وعدہ کے طور پر یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں، اس لیے کہ یہ عورتیں وہ عہد ہیں، ایک تو سینا پہاڑ (حضرت ہاجرہ مصری تھیں اور سینا مصر کے راستہ میں ہے) پر سے جو ہوا وہ نرے غلام جنتی ہیں، یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم (بیت المقدس) کا جواب ہے اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے۔ (گلیتوں کے نام ۲۲۔۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے یہ واضح ہوگا کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے آگاہ تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں ''اب کے یروشلم'' سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا، یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد تھیں، یعنی ان کی اولاد کے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے خدا نے دو وعدے کیے تھے، ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا، جب وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں سینا پڑتا تھا، اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک مرکزی گھر تعمیر کیا تھا اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے متولی ہوگئے، یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا، سارہ کے وعدہ کا یہاں ذکر نہیں ہے، لیکن یہ معلوم ہے کہ بیت المقدس کی تولیت بنی اسرائیل کو عطا ہوئی تھی، گویا حضور انور ﷺ کے پیشتر تک خدا کا عہد بیت المقدس اور بنی اسرائیل کے ساتھ تھا، چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، تمرد، سرکشی، اور قساوت کے سبب سے اس عہد کو توڑ دیا تھا، اس لیے آنحضرت ﷺ کی بعثت کے بعد خدا نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء کی آیتوں میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کچھ اثر نہ ہوا تو خدا نے ان سے اپنا عہد توڑ کر اسماعیل کا وہ عہد شروع کیا جو سینا پر ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔

معراج میں آنحضرت ﷺ کا بیت المقدس (مسجد اقصیٰ) میں نماز ادا کرنا اور اس سے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا، گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا کا اعلان تھا، جیسا کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں بسلسلہ معراج:

﴿ سُبْحٰنَ الَّذِیْٓ اَسْرٰی بِعَبْدِہٖ لَیْلًا مِّنَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اِلَی الْمَسْجِدِ الْاَقْصَا الَّذِیْ بٰرَکْنَا حَوْلَہٗ ﴾ (۱۷/ بنی اسرآئیل: ۱)

''پاک ہے وہ خدا جو اپنے بندہ کو رات کے وقت مسجد حرام (خانہ کعبہ) سے اس مسجد اقصیٰ (بیت المقدس) تک لے گیا جس کے چاروں طرف ہم نے برکت دی ہے۔''

کی تفسیر میں لکھا گیا ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ بیت المقدس جو عہد اسرائیل کا نشان تھا، اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی، بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وہ مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہد اسماعیل سے تھا (یعنی خانہ کعبہ) وہ عہد کیا تھا؟ اس کی تفصیل یہ ہے:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ قَالَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِىْ ۭ قَالَ لَا يَنَالُ عَهْدِي الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۵)

''اور جب خدا نے چند باتوں میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو آزمایا تو اس نے ان باتوں کو پورا کیا۔ خدا نے کہا: میں تجھ کو لوگوں کا پیشوا بنانے والا ہوں (ابراہیم نے) کہا: اور میری نسل میں سے (خدا نے) فرمایا: میرا عہد ظالموں کو شامل نہ ہوگا اور جب ہم نے گھر (کعبہ) کو لوگوں کے اجتماع کی جگہ اور امن بنایا اور تم ابراہیم علیہ السلام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز پڑھنے کی جگہ بناؤ اور ہم نے ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام سے عہد کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں، اعتکاف کرنے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک رکھو۔''

غرض یہ رمز الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسول اللہ ﷺ کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے خانہ کعبہ قرار پایا، جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر تھا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے توحید کی آواز بلند کی تھی اور دنیا میں اس لحاظ سے خدا کا سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا، جو اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس تھا، اس لیے حکم ہوا:

﴿ وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۹)

''اور تو جہاں بھی نکلے مسجد حرام ہی کی طرف منہ کر۔''

درحقیقت ہر مسلمان کا فرض یہ ہے کہ وہ بھی اسی طرح کھڑا ہو کر فریضۂ عبودیت ادا کرے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کھڑے ہوئے تھے، لیکن چونکہ ہر مسلمان کو ہر جگہ اور ہر وقت ایسا کرنا ممکن نہیں تو کم از کم نماز کے وقت ادھر رخ ہی کر لے، ورنہ ظاہر ہے کہ خدا کی رحمت اور اس کی توجہ ہر طرف برابر ہے، اسی لیے قبلہ

کی تعیین کے موقع پر فرمایا:

﴿ فَاَیۡنَمَا تُوَلُّوۡا فَثَمَّ وَجۡہُ اللّٰہِ ؕ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۱۵)

''پس جدھر منہ پھیرو ادھر ہی خدا کا منہ ہے۔''

خانہ کعبہ کی دیواریں اور اس کی چھت کسی مسلمان کا معبود و مسجود نہیں، نہ مشرکوں، بت پرستوں اور ستارہ پرستوں کی طرح نماز و دعا میں قبلہ سے خطاب ہوتا ہے، نہ اس سے کچھ مانگا جاتا ہے، نہ اس کی دہائی دی جاتی ہے نہ اس کو خدا سمجھا جاتا ہے اور نہ یہ خیال کیا جاتا ہے کہ خدا اس کے اندر بیٹھا ہے، خانہ کعبہ کی دیواریں اگر (بالفرض) ٹوٹ جائیں، اس کی چھت گر جائے اور صرف فضا باقی رہ جائے تب بھی کعبہ قبلہ رہے گا، اسی طرح خود خانہ کعبہ کے اندر جا کر بلکہ اس کی چھت پر کھڑے ہو کر بھی نماز پڑھی جا سکتی ہے، اگر سمت قبلہ کا پتہ نہ لگ سکے تو جدھر قبلہ کا گمان ہو ادھر ہی نماز پڑھی جا سکتی ہے۔ [1] سواری میں نفل نماز ہر سمت جدھر سواری جا رہی ہو پڑھ سکتے ہیں، گھمسان کی لڑائیوں میں بھی ایسا کیا جا سکتا ہے یہ باتیں ان تمام مشرکانہ غلط فہمیوں کی جو خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے پیدا ہو سکتی ہیں، قطعی تردید کرتی ہیں اور یہی اس باب میں دین محمدی ﷺ کی تکمیلی حیثیت ہے۔

یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملت ابراہیمی کے پیرو ہونے کا عملی ثبوت، دنیا کے قدیم موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ ﷺ کے پیرو ہونے کا شعار اور مسلمانان عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے اس کی طرف رخ کرنے کو قبولِ اسلام کی علامت قرار دیا اور فرمایا کہ جو ہمارے قبلہ کی طرف رخ کر کے نماز پڑھے اور ہمارے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھائے، وہ مسلمان [2] ہے، اگر خیال کے پر پرواز سے اڑ کر اور فضائے آسمانی کی نیلگوں سطح پر کھڑے ہو کر دنیا کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں کوئی شخص دیکھے تو نظر آئے گا کہ قبلہ ایک مرکزی نقطہ ہے، جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرہ کی صورت میں خدا کے آگے صف بستہ اور سربسجود ہیں۔

رکعتوں کی تعداد

ایک قیام، اس کے بعد رکوع، پھر سجدہ، اس مرتب صورت کا نام ایک رکعت ہے، نماز میں کم از کم دو رکعتیں اور زیادہ سے زیادہ چار مقرر کی گئیں، صبح کو دو، ظہر، عصر، اور عشاء کے وقت چار چار اور مغرب میں تین، ایک رکعت کی مستقل نماز نہیں رکھی گئی اور نہ چار سے زیادہ رکعتیں رکھی گئیں، کیونکہ مصلحت یہ تھی کہ نماز نہ اتنی مختصر ہو کہ دل میں ذرا اثر بھی پیدا نہ ہو کر سکے، نہ اتنی لمبی کہ انسان کو بددل بنا دے، ایک رکعت کی نماز اتنی مختصر تھی کہ اس سے قلب میں خضوع و خشوع پیدا نہ ہوتا، کیونکہ صرف چند سیکنڈ میں تمام ہو جاتی اور چار سے زیادہ رکعتوں کی نماز بددلی کا باعث ہوتی، کیونکہ دیر لگنے کی وجہ سے جی گھبراتا، اس لیے فرض نماز کی رکعتیں دو سے

---

[1] صحیح بخاری، کتاب التفسیر، تفسیر سورۃ بقرۃ: ٤٥٣٥۔

[2] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب فضل استقبال القبلۃ:۳۹۱۔

زیادہ نہیں رکھی گئیں۔

مکہ میں مسلمانوں کو جو بے اطمینانی اور بے سروسامانی تھی اور جس طرح کفار کے ڈر سے چھپ کر وہ نماز پڑھتے تھے، اس لحاظ سے اسوقت نماز میں زیادہ رکعتیں ہونا ممکن نہ تھا، اسی لیے مکہ معظمہ میں ہر نماز صرف دو رکعتوں کی تھی، جب مدینہ آ کر اطمینان نصیب ہوا تو ظہر، عصر اور عشاء کی چار چار رکعتیں، کر دی گئیں لیکن مسافر کے لیے وہی دو رکعتیں [1] قائم رہیں، کیونکہ اس کی عارضی پریشان حالی باقی رہتی ہے، جو اس تخفیف کی علت تھی، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی روایت کا خلاصہ یہ ہے کہ مقیم کے لیے چار رکعتیں ہیں، مسافر کے لیے دو اور بحالت خوف ایک [2] اس سے ظاہر ہوا کہ اطمینان کی زیادتی اور کمی کی بنا پر ان رکعتوں کی تعداد گھٹتی اور بڑھتی ہے۔

مغرب اور صبح کی نمازیں قیام وسفر دونوں حالتوں میں یکساں ہیں، مغرب کی تین رکعتوں کا آدھا ممکن نہیں اور صبح میں کچھ دو رکعتیں ہیں ان میں کیا کمی ہو سکتی ہے؟ لیکن مغرب اور صبح میں یہ تین اور دو رکعتیں کیوں ہیں؟ اس کی گرہ کشائی ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے فرمائی ہے: ''مغرب میں تین اس لیے ہیں کہ وہ دن کا وتر ہے اور صبح میں دو اس لیے کہ اس میں دو رکعتوں کے بڑھانے کے بجائے قراءت لمبی کر دی گئی ہے۔'' [3]

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ارشاد میں تھوڑی سی تفصیل کی ضرورت ہے۔ گزر چکا ہے عین طلوع اور غروب کے وقت نماز کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ یہ کفار (آفتاب پرستوں) کی عبادت کا وقت تھا [4] مغرب کی نماز غروب آفتاب کے بعد فوراً ہوتی ہے، اس لیے ضرورت ہے کہ اہل توحید آفتاب پرستی کے شرک سے پوری براءت ظاہر کریں اسی لیے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد وہ رہ گئی جس سے خدا کے واحد اور وتر ہونے کا ثبوت مل سکے۔ [5] یہ عدد واحد تو ہو نہیں سکتا کہ اس سے خضوع وخشوع اور تاثر کا مقصد فوت ہوتا، دو کا عدد بھی نہیں ہو سکتا کہ یہ زوج اور جوڑا ہے، طاق نہیں، بنا بریں توحید کا رمز آشکارا کرنے والا سب سے قریب ترین طاق عدد تین ہی ہے، جس سے خدا کا واحد ہونا اور وتر ہونا دونوں باتیں ثابت ہوتی ہیں، نیز نماز کے خشوع وخضوع کا کمال بھی فوت نہیں ہوتا جو ایک رکعت ہونے میں فوت ہو جاتا ہے، اس لیے مغرب میں رکعتوں کی تعداد تین رکھی گئی اور چونکہ آفتاب کا کامل زوال وانحطاط جس کو غروب کہتے ہیں، اسی وقت ہوتا ہے، اس لیے اس توحید کے رمز کو اسی وقت آشکارا ہونا چاہیے، اس مفہوم کی تشریح اس حدیث کے الفاظ سے بھی ہوتی ہے جس میں آنحضرت ﷺ نے وتر نماز کی تاکید فرمائی ہے:

---

[1] صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب هجرة النبی : ۳۹۳۵؛ صحیح مسلم، کتاب صلوٰة المسافرین: ۱۵۷۰، ۱۵۷۱؛ مسند احمد، ج٦، ص: ۲٤۱ وابن خزیمة وابن حبان والبیهقی (فتح الباری، ج۱، ص: ۳۹۳)۔

[2] صحیح مسلم، کتاب صلوٰة المسافرین: ۱۵۷۵۔ [3] مسند احمد بن حنبل، ج٦، ص: ۲٤۱۔

[4] صحیح مسلم، کتاب صلوة المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة: ۱۹۳۰۔

[5] عشاء کے بعد وتر نماز کو بھی وتر اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ طاق ہوتی ہے یعنی جورات کی نماز ہے۔

((اوتروا یا اھل القرآن فان اللّٰہ وتر یحب الوتر)) ❶

''اے قرآن والو! وتر (طاق) پڑھا کرو، کیونکہ خدا بھی وتر (طاق) ہے اور وہ وتر (طاق) کو پسند کرتا ہے۔''

صبح کا وقت وہ دلکش وقت ہے جب انسان پورے آرام وسکون کے بعد بیدار ہوتا ہے، یہ بڑا سہانا وقت ہوتا ہے، طبیعت موزوں ہوتی ہے، دل مطمئن ہوتا ہے، تمام عالم اس وقت سراپا اثر مجسم کیف نظر آتا ہے، اس لیے یہ وقت نماز ودعا کے لیے خاص طرح سے موزوں ہے اور قرآن مجید میں اس کے اس خاص امتیاز کا ذکر ان لفظوں میں کیا گیا ہے:

﴿ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا۝ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآئیل: ۷۸)

''صبح کی نماز کی قراءت کا وقت حضوری کا ہوتا ہے۔''

اس بنا پر شریعت محمدیہ ﷺ نے اس وقت کی نماز میں رکعتوں کی تعداد کے بجائے اس کی اصل کیفیت کو پیش نظر رکھا، یعنی رکعتیں تو دو ہی رہیں، مگر حکم دیا گیا کہ قرأت لمبی کردی جائے اور سورتیں بڑی بڑی پڑھی جائیں، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ اور نمازوں میں ایک رکعت میں تقریباً پندرہ آیتیں تلاوت فرماتے تھے، مگر صبح کی نماز میں ساٹھ آیتوں سے لیکر سو آیتوں تک قراءت کرتے تھے ❷ اور اسی نسبت سے رکوع وسجود بھی ہوتا تھا۔ ❸ رکعتوں کی تعداد اگرچہ آنحضرت ﷺ اور صحابہ کی سنتِ متواترہ سے ثابت ہے اور تمام مسلمان اس تواتر پر بلا استثنا عامل بھی ہیں، تاہم اس کا عملی اشارہ قرآن پاک میں نمازِ خوف سے ظاہر ہوتا ہے، جس میں یہ حکم ہے کہ اسلامی فوج کے دو حصے ہوجائیں، پہلے اگلا حصہ امام کے پیچھے کھڑا ہوکر ایک رکعت ادا کرے او ردوسرا دشمن کے مقابل کھڑا رہے، پھر اگلا حصہ امام کے سامنے کھڑا ہوجائے اور دوسرا امام کے پیچھے آکر ایک رکعت ادا کرے، اس طرح امام کی دو رکعتیں ہوجاتی ہیں اور مقتدیوں کی جماعت کے ساتھ ایک ایک اور اگر دوسری رکعت کا موقع ملتا ہے، تو وہ ارکان کے ساتھ اور یہ ممکن نہ ہو تو اشاروں سے علیحدہ علیحدہ ادا کرتے ہیں، ❹ جب نمازِ خوف میں قصر کی دو رکعتیں ثابت ہوئیں تو اصل رکعتیں چار ہوں گی، اس سے یہ بھی ظاہر ہوا کہ قصر چار ہی رکعت والی نمازوں میں ہے، نمازِ قصر کی آیات سورۂ نساء کے پندرھویں رکوع میں ہیں۔

نماز کے آداب باطنی

قرآن پاک اور احادیث نبویہ میں نماز کے لیے متعدد لفظ آئے ہیں۔ مثلاً صلوٰۃ، دعا، تسبیح اور ذکر الٰہی

❶ ابوداود، کتاب الوتر، باب استحباب الوتر: ۱٤۱٦۔ ❷ صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب القراءۃ فی الصبح: ۱۰۳۲۔ ❸ صحیح مسلم، کتاب الصلوۃ، باب اعتدال ارکان الصلوٰۃ: ۱۰۵۸۔

❹ حدیث میں نمازخوف کی بہت سی صورتیں ہیں جن میں سے ہر مجتہد نے اپنی اپنی دلیل کی رو سے ایک ایک صورت کو مخصوص کرلیا ہے۔ مگر محدثین میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ سب صورتیں جائز ہیں، میرا ناقص خیال یہ ہے کہ یہ سب مختلف صورتیں لڑائی کے مختلف حالات کی بنا پر ہیں۔ جب جیسی صورت پیش آئی اس کے مطابق نماز ادا کی گئی۔ جنگ میں اشاروں سے نماز ادا کرنے کا مسئلہ امام بخاری اور بعض محدثین کا ہے۔

اور یہ الفاظ خود نماز کے روحانی خصوصیات وآداب ظاہر کرتے ہیں۔ نماز جسم وروح دونوں کی عبادت ہے، اگر اس میں جسم کی حرکت کے ساتھ دل کی جنبش شامل نہ ہو اور روح میں اہتزاز پیدا نہ ہو جائے تو ایسی نماز گلِ بے رنگ اور شرابِ بے کیف سے زیادہ نہ ہوگی۔

اقامت صلوٰۃ

نماز پڑھنے کے لیے قرآن پاک میں جا بجا اقامت صلوٰۃ (نماز کو قائم کرنا) کا لفظ استعمال ہوا ہے، جس کے معنی صرف نماز پڑھنے کے نہیں، بلکہ نماز کو اس کے آداب اور ارکان وسنن کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں چنانچہ خوف کی حالت میں جہاں نماز کے بعض آداب وارکان وشرائط کو معاف کر دیا گیا ہے، اس کے بعد ہی یہ کہا گیا ہے: ﴿ فَاِذَا اطۡمَاۡنَنۡتُمۡ فَاَقِيۡمُوا الصَّلٰوةَ ﴾ (٤/ النساء:١٠٣) ''پھر جب تم کو اطمینان ہو جائے تو نماز کو قائم کرو۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اقامت صلوٰۃ یعنی نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے آداب وارکان وشرائط کے ساتھ بجالایا جائے، اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہیے، جس کے بغیر نماز ناقص رہتی ہے۔

قنوت

نماز کے آداب باطنی میں دوسری چیز قنوت ہے، اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿ وَقُوۡمُوۡا لِلّٰهِ قٰنِتِيۡنَ ۝ ﴾ (٢/ البقرۃ:٢٣٨)

''اور خدا کے سامنے ادب سے کھڑے ہو۔''

صحابہ کہتے ہیں کہ ہم لوگ پہلے نماز میں باتیں کر لیا کرتے تھے، لیکن جب یہ آیت اتری تو آنحضرت ﷺ نے اس سے منع فرما دیا کہ یہ یکسوئی اور نماز کے باطنی آداب کے خلاف تھا۔ قرآن پاک میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے، وہ عجیب جامع لفظ ہے، لغت میں (دیکھو لسان العرب) اس کے حسب ذیل معنی ہیں: چپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا، نماز کے جس قنوت کا اس آیت میں ذکر ہے اس کے متعدد معنوں میں سے ہر معنی نماز میں مقصود ہے، کیوں کہ نماز میں ذکر وقراءت تسبیح واستغفار سلام وتشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے، وہ خدا کی بندگی بھی ہے، دعا بھی ہے، عبادت بھی ہے، اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی بھی کسی نماز میں کم ہو تو اس قدر نماز کے اوصاف میں بھی کمی ہو جائے گی۔

خشوع

تیسری چیز خشوع ہے، چنانچہ قرآن پاک میں نمازیوں کی یہ صفت آئی ہے:

﴿ الَّذِيۡنَ هُمۡ فِىۡ صَلَاتِهِمۡ خٰشِعُوۡنَ ۝ ﴾ (٢٣/ المؤمنون:٢)

''(وہ مومنین کامیاب ہیں) جو اپنی نماز میں خشوع وخضوع کرتے ہیں۔''

خشوع کے لغوی معنی یہ ہیں: بدن جھکا ہونا، آواز پست ہونا، آنکھیں نیچی ہونا یعنی ہر ادا سے مسکنت عاجزی اور تواضع ظاہر ہونا (لسان العرب) اس لیے نماز خدا کے سامنے اپنی مسکینی، بیچارگی اور افتادگی کا اظہار ہے، اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو تو گویا نماز کی اصلی غرض فوت ہوگئی۔

تبتل

تبتل کے اصلی معنی کٹ جانے کے ہیں اور اس کے اصطلاحی معنی ہیں خدا کے سوا ہر چیز سے کٹ کر صرف خدا کا ہو جانا۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک مسلمان کی زندگی کا حقیقی نصب العین ہے۔ مگر قرآن پاک میں جہاں اس کا حکم ہے۔ سیاق وسباق سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کی حالت سے متعلق ہے، چنانچہ سورۂ مزمل میں ہے:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝ اِنَّا سَنُلْقِيْ عَلَيْكَ قَوْلًا ثَقِيْلًا ۝ اِنَّ نَاشِئَةَ الَّيْلِ هِيَ اَشَدُّ وَطْاً وَّاَقْوَمُ قِيْلًا ۝ اِنَّ لَكَ فِي النَّهَارِ سَبْحًا طَوِيْلًا ۝ وَاذْكُرِ اسْمَ رَبِّكَ وَتَبَتَّلْ اِلَيْهِ تَبْتِيْلًا ۝ ﴾

(۷۳/ المزمل:۱۔۸)

''اے کملی اوڑھنے والے! تھوڑی دیر کے سوا تمام رات اٹھ کر نماز پڑھ، آدھی رات یا اس سے کچھ کم وبیش اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ، ہم تجھ پر ایک بھاری بات اتارنے والے ہیں بے شک رات کو اٹھ کر نماز پڑھنا نفس کو خوب زیر کرتا ہے اور موثر ہوتا ہے، تیرے لیے دن کو بڑی فرصت ہے اپنے پروردگار کا نام لے اور ہر چیز سے کٹ کر اس کی طرف ہو جا۔''

یعنی نماز کی حالت میں خدا کا ذکر کرتے وقت اس کی عظمت اور اپنی عاجزی کے سوا ذہن سے تمام خیالات نکل جانے چاہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرو بن عبسہ سلمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مجھے آنحضرت ﷺ نے جو نماز سکھائی اس کے متعلق یہ فرمایا کہ ''وضو کر کے جب کوئی نماز کے لیے کھڑا ہوا پھر خدا کی حمد کی، ثنا کی اور خدا کی اس بزرگی کا اظہار کیا، جس کا وہ سزاوار ہے اور اپنے دل کو خدا کے لیے ہر چیز سے خالی کر لیا (وَفَرَّغَ قَلْبَهٗ لِلّٰهِ) تو وہ نماز کے بعد ایسا ہو جاتا ہے، جیسے اس کی ماں نے اس کو اسی وقت [1] پیدا کیا ہو'' یہ حدیث گویا اسی آیت کی تفسیر ہے۔

تضرع

تضرع کے معنی زاری اور عاجزی اور عاجزی کے ساتھ درخواست کرنے کے ہیں (لسان العرب) نماز میں بندہ پر عاجزی، زاری اور عجز والحاح کے ساتھ سوال کرنے کی کیفیت طاری ہونی چاہیے، ورنہ اس حکم پر عمل نہ ہوگا:

﴿ اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ﴾ (۷/ الاعراف:۵۵)

[1] صحیح مسلم، کتاب صلوۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة:۱۹۳۰۔

"تم اپنے پروردگار کو مسکنت اور زاری کے ساتھ اور دھیمی آواز سے پکارو۔"

اخلاص

نماز کے باطنی سنن وآداب کا اصلی جوہر اخلاص ہے، یعنی یہ کہ نماز سے مقصود خدا کے سوا کوئی اور چیز نہ ہو، کیوں کہ اگر ایسا نہیں ہے تو نماز نماز نہیں بلکہ ریا اور نمائش ہوگی اور بعض اہلِ حق کے نزدیک شرک لازم آئے گا۔ فرمایا:

﴿ وَاَقِيْمُوْا وُجُوْهَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّادْعُوْهُ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ ﴾

(۷/ الاعراف :۲۹)

"اور تم ہر نماز کے وقت اپنے رخ کو ٹھیک رکھو اور خدا کو اخلاص کے ساتھ پکارو۔"

اس سے معلوم ہوا کہ نماز میں اخلاص کا پیدا کرنا اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے۔

ذکر

نماز خدا کی یاد کے لیے ہے، اگر دل میں کچھ اور زبان پر کچھ، ہو تو خدا کی حقیقی یاد نہ ہوگی۔ اس لیے فرمایا:

﴿ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴾ (۲۰/ طٰہٰ :۱٤)

"میری یاد کے لیے نماز کھڑی کر۔"

ظاہر ہے کہ یاد صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں ہے، اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیے اور یہی نماز کی بڑی غرض ہے۔

فہم وتدبر

نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بے پروائی کی وجہ سے معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا، اسی لیے نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت کی گئی ہے کہ اس حالت میں سمجھنے والا دل شرابی کے پہلو میں نہیں۔ فرمایا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (٤/ النسآء :٤٣)

"نماز کے قریب نہ جاؤ، جب تم نشہ میں ہو، یہاں تک کہ (اتنا ہوش آ جائے کہ) جو تم کہو اس کو سمجھو۔"

اس آیت پاک نے یہ واضح کیا کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی بھی ضرورت ہے، اسی بنا پر آپ نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم اور تدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ "نماز میں جب تم پر نیند غالب آئے تو سو جاؤ، کیوں کہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا

کہنے لگو۔‘‘ ❶ دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا: ’’نمازی کو جب نیند آئے تو سو جانا چاہیے، تا کہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔‘‘ ❷ حاکم کی مستدرک میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ جو وہ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے، یہاں تک کہ نماز ختم کر لے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔‘‘ ❸

یہ نماز کے وہ باطنی آداب ہیں جن کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی، جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے، اسی طرح نماز کے ان باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی نماز سے غفلت ہے اور اس لیے اس آیت ذیل کے مصداق دونوں ہیں:

﴿ فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُوْنَ ۙ الَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ ۙ﴾

(۱۰۷/ الماعون: ۴۔۶)

’’پھٹکار ہو ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غفلت برتتے ہیں، جو دکھاوے کی نماز پڑھتے ہیں۔‘‘

ذرا ان الفاظ پر غور کیجیے ’’ان نمازیوں پر جو اپنی نماز سے غافل ہیں پھٹکار ہو‘‘ نمازی ہونے کے باوجود نماز سے غافل ہونے کے یہی معنی ہیں کہ نماز کے لیے جو ظاہری آداب مثلاً: وقت کا لحاظ اور ادائے ارکان میں اعتدال وغیرہ اور جو باطنی آداب مثلاً: خشوع وخضوع، تضرع وزاری اور فہم وتدبر وغیرہ ضروری ہیں، ان سے نماز میں تغافل برتا جائے۔ نماز کے گزشتہ آداب کے مطابق آنحضرت ﷺ کی ہدایات، تعلیمات اور عملی مثالیں ہیں، جن میں آپ نے نماز کی اصلی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔ ایک دفعہ مسجد نبوی ﷺ میں ایک شخص نے آ کر نہایت عجلت میں نماز پڑھی آپ ﷺ نے فرمایا: ’’اے شخص اپنی نماز پھر پڑھ کیوں کہ تو نے نماز نہیں پڑھی۔‘‘ اس نے دوبارہ اسی طرح نماز ادا کی آپ نے پھر وہی ارشاد فرمایا جب تیسری دفعہ بھی ایسا ہی ہوا تو اس نے عرض کی، یارسول اللہ ﷺ! کیسے نماز پڑھوں؟ فرمایا: ’’اس طرح کھڑے ہو، اس طرح قراءت کرو، اس طرح اطمینان وسکون کے ساتھ رکوع اور سجدہ کرو۔‘‘ ❹ نماز میں نظر اٹھا کر ادھر ادھر دیکھنا خشوع کے خلاف ہے اس سے انسان کی توجہ بٹتی اور حضور قلب میں خلل پڑتا ہے، اس لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ’’نماز میں ادھر ادھر نہ دیکھا کرو، کیا تمہیں یہ ڈر نہیں کہ تمہاری نظر واپس نہ آ سکے۔‘‘ ❺ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ ’’جب

---

❶ مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب امر من نعس فی صلاتہ: ۱۸۳۵۔

❷ بخاری، کتاب الصلوۃ، باب الوضوء من النوم: ۲۱۳۔

❸ مستدرک، کتاب الطھارۃ، ج۱، ص:۱۳۱ (ترغیب وترھیب حافظ منذری، ج۱، ص: ۷۳ مصر) اس سے ان مسلمانوں کو جو عربی زبان نہیں سمجھتے عبرت حاصل کرنی چاہیے ورنہ چاہیے کہ نماز میں جو سورتیں اور دعائیں وہ پڑھتے ہیں ان کے معنی ذہن نشین کر لیں اور یہ ہر مسلمان کے لیے بہت آسانی سے ممکن ہے۔ بشرطیکہ وہ تھوڑی توجہ کرے۔

❹ صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب وجوب القراءۃ للامام والمأموم فی الصلوات: ۷۵۷؛ صحیح مسلم، کتاب الصلاۃ، باب وجوب قراءۃ الفاتحۃ فی کل رکعۃ: ۸۸۵؛ ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب صلوۃ من لا یقیم صلبہ فی الرکوع والسجود: ۸۵۶۔ ❺ مسند احمد عن جابر بن سمرۃ، ج۵، ص: ۹۳۔

تک بندہ نماز میں دوسری طرف ملتفت نہیں ہوتا خدا اس کی طرف ملتفت رہتا ہے اور جب وہ خدا کی طرف سے منہ پھیر لیتا ہے تو خدا بھی اپنا منہ اس کی طرف سے پھیر لیتا ہے۔'' [1] طبرانی میں ہے کہ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جب تم میں سے کوئی شخص نماز کے لیے کھڑا ہو تو وہ خدا کی طرف پوری طرح متوجہ رہے، یہاں تک کہ نماز سے فارغ ہو جائے اور نماز میں منہ پھیر کر ادھر ادھر نہ دیکھو کیوں کہ جب تک تم نماز میں ہو خدا سے باتیں کر رہے ہو۔'' [2] مسند بزار میں ہے کہ ''جب بندہ نماز میں ادھر ادھر دیکھتا ہے تو خدا فرماتا ہے تو کدھر دیکھتا ہے؟ کیا تیرے نزدیک مجھ سے بھی بہتر کوئی چیز ہے تو میری طرف دیکھ دوسری دفعہ بھی خدا یہی فرماتا ہے پھر تیسری دفعہ جب اس سے یہ حرکت صادر ہوتی ہے تو خدا اس کی طرف سے اپنا منہ پھیر لیتا ہے۔'' [3]

ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''سب سے بڑا چور وہ ہے جو نماز کی چوری کرتا ہے۔'' صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ! نماز کی چوری کیا ہے؟ فرمایا: ''رکوع اور سجدہ اچھی طرح نہ کرنا اور خشوع نہ ہونا۔'' [4] ایک دفعہ آپ نے نماز سے فارغ ہو کر آخری صف کے ایک شخص کو آواز دی کہ ''اے فلاں تو خدا سے نہیں ڈرتا کس طرح نماز پڑھتا ہے، جب کوئی شخص نماز پڑھنے کھڑا ہوتا ہے تو اپنے رب سے باتیں کرتا ہے، پس سوچنا چاہیے کہ اس سے کس طرح باتیں کرے۔'' [5] صحیح مسلم میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''کیا تو نماز بھی اچھی طرح نہیں پڑھتا کیا نماز پڑھنے والا جب نماز پڑھتا ہے تو نہیں سمجھتا کہ وہ کس طرح نماز پڑھ رہا ہے، تو اپنے ہی فائدہ کے لیے نماز پڑھتا ہے۔'' [6] نماز کی حالت میں تھوکنا اور خصوصاً سامنے تھوکنا ادب کے خلاف ہے۔ آپ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ ''نماز کی حالت میں خدا تمہارے سامنے ہوتا ہے تو کیا تم پسند کرتے ہو کہ تم اس کے سامنے تھوکو۔'' [7] دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں کوئی شخص سامنے نہ تھوکے کہ اس وقت وہ خدا سے باتیں کرتا ہوتا ہے۔'' [8] مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''نماز میں خدا تمہارے منہ کے سامنے ہوتا ہے۔'' [9]

نماز میں سکون اور اطمینان پیدا کرنے کی بھی آپ نے ہدایتیں فرمائی ہیں ارشاد ہوا کہ ''جب نماز ہو رہی ہو اور تم باہر سے آؤ تو دوڑ کر مت آؤ بلکہ اس طرح آؤ کہ تم پر سکون ہو اور وقار طاری ہو۔'' [10] اس سے

---

[1] مسند احمد، ج ۵، ص: ۱۷۲؛ ابوداود، باب الالتفات فی الصلوٰۃ: ۹۰۹؛ مستدرک، ج ۱، ص: ۲۳۶۔
[2] طبرانی فی الاوسط عن ابی ہریرۃ بحوالہ کنزالعمال، ج ۴، ص: ۱۰۸۔ [3] کنز العمال، ج ۴، ص: ۱۰۸۔
[4] مسند احمد، ج ۵، ص: ۳۱۰ ودارمی، کتاب الصلاۃ، باب من لایتم الرکوع والسجود: ۱۳۲۸ وابن ابی شیبۃ وابن خزیمۃ وابن حبان وعبد بن حمید وعبدالرزاق وطبرانی فی الاوسط آخری لفظ بعض روایتوں میں نہیں ہے۔
[5] مستدرک حاکم، ج ۱، ص: ۲۳۶ (علی شرط مسلم)۔ [6] صحیح مسلم، کتاب الصلوٰۃ، باب الامر بتحسین الصلوٰۃ: ۹۵۷۔ [7] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب النہی عن البصاق فیہا: ۱۲۲۳ وحاکم فی المستدرک، ج ۱، ص: ۲۵۷؛ ابوداود، باب کراہیۃ البزاق فی المسجد: ۴۷۸۔
[8] صحیح بخاری، کتاب مواقیت الصلاۃ، باب المصلی یناجی ربہ: ۵۳۱؛ مسلم، کتاب المساجد: ۱۲۳۰۔
[9] مسلم، باب النہی عن البصاق فیہا: ۱۲۲۳۔ [10] صحیح مسلم، باب استحباب اتیان الصلوٰۃ بوقار: ۱۳۵۹۔

اول تو یہ مقصود ہے کہ خود اس شخص پر سکون واطمینان طاری رہے، دوسرے یہ کہ اس کی دوڑ یا چال سے دوسرے نمازیوں کے سکون میں خلل نہ آئے، اسی طرح بے اطمینانی کے اگر طبعی اسباب ہوں تو نماز سے پہلے ان سے بھی فراغت کر لی جائے۔ مثلاً: بھوک ہو اور کھانا رکھا ہو اور ادھر جماعت کھڑی ہو رہی ہو تو پہلے کھانا کھالینا چاہیے، تاکہ نماز اطمینان سے ادا ہو۔ [1] اسی طرح اگر استنجا یا قضائے حاجت کی ضرورت ہو تو پہلے اس سے فراغت کر لی جائے تب نماز پڑھی جائے۔ [2]

آغاز اسلام میں لوگ نماز کی حالت میں ہاتھ اٹھا کر سلام کا جواب دیتے تھے۔ لیکن مدینہ آ کر یہ اجازت منسوخ ہو گئی، ایک صحابی نے جن کو اس کی خبر نہ تھی۔ آنحضرت ﷺ کو کوئی دفعہ نماز میں سلام کیا اور جب آپ نے جواب نہ دیا تو نماز کے بعد انہوں نے اس کا ذکر کیا فرمایا: [3]

((ان فی الصلوٰۃ لشغلا))

''نماز میں اور ہی مصروفیت ہوتی ہے۔''

نماز پڑھتے وقت ایسے کپڑے پہننا یا سامنے ایسا پردہ لٹکانا جن کے نقش ونگار میں دل محو ہو جائے اور توجہ ہٹ جائے، مکروہ ہے، ایک دفعہ آنحضرت ﷺ نے گل بوٹوں کی ایک چادر اوڑھ کر نماز پڑھی پھر فرمایا: ''اس کے گل بوٹوں نے مجھے اپنی طرف متوجہ کر لیا اس کو ابوجہم (تاجر کا نام) کے پاس لے جاؤ اور انبجانی سادہ چادر لے آؤ۔'' [4] اسی طرح ایک دفعہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے سامنے دیوار پر ایک منقش پردہ لٹکا دیا تھا، آپ نے نماز پڑھی تو خیالات میں یکسوئی نہ رہی، آپ نے اس کو اتروا دیا۔ [5]

نماز کے اوقات کی تعیین میں بھی یہ اصول مدنظر رکھا گیا ہے کہ وہ ایسے ہونے چاہئیں جن میں نسبتاً سکون میسر ہوتا ہو، اسی لیے ظہر کی نماز کا اصلی وقت اگرچہ فوراً بعد زوال ہونا چاہیے، تاہم چونکہ اس وقت گرمی سخت ہوتی ہے، اس لیے توقف کا حکم دیا گیا۔ گرمی کے دنوں میں چونکہ اور بھی زیادہ شدت ہوتی ہے، اس لیے فرمایا کہ یہ دوپہر کی گرمی (گویا) جہنم کی آگ ہے، اس لیے ذرا ٹھنڈک کے بعد ظہر کی نماز پڑھو۔

((فان الصلوٰۃ مشھودۃ محضورۃ)) [6]

''کیونکہ نماز میں حضور ہوتا ہے۔'' [7]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا حضر الطعام واقیمت الصلوۃ: ۶۷۱ تا ۶۷۴؛ صحیح مسلم، باب کراھة الصلوۃ بحضرۃ الطعام: ۱۲۴۱؛ ابوداود، کتاب الطھارۃ: ۸۹؛ ترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ماجاء اذا حضر...... : ۳۵۳۔ [2] مسلم، کتاب المساجد، ایضاً: ۱۲۴۶؛ ابوداود، باب یصلی الرجل وھو حاقن: ۱۰، ۹۱؛ موطا امام مالك، النھی عن الصلوۃ والانسان یرید ...: ۳۸۰۔ [3] صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب تحریم الکلام فی الصلوٰۃ: ۱۲۰۱۔ [4] صحیح مسلم، باب کراھة الصلوٰۃ فی ثوب له اعلام: ۱۲۳۸۔

[5] صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب الأکسیة والخمائص: ۵۸۱۷ ومسلم کتاب اللباس، باب تحریم تصویر...... : ۵۵۲۹۔ [6] صحیح مسلم، کتاب صلاۃ المسافرین، باب اسلام عمرو بن عبسة: ۱۹۳۰۔

[7] محدثین نے اس حضور سے فرشتوں کا حاضر ہونا مراد لیا ہے۔

نماز کی روحانی کیفیت کا سب سے اعلیٰ منظر یہ ہے کہ انسان پر ایسی حالت طاری ہو جائے کہ اسے معلوم ہو کہ وہ اس وقت خدا کے سامنے کھڑا ہے۔ گزر چکا ہے کہ ایک شخص نے آپ سے دریافت کیا تھا کہ احسان کیا ہے؟ فرمایا: ''یہ ہے کہ جب تم عبادت کرو تو تم کو یہ معلوم ہو کہ تم خدا کو دیکھ رہے ہو۔ کیوں کہ اگر تم خدا کو نہیں دیکھ رہے ہو تو وہ تو تم کو بہر حال دیکھ رہا ہے۔'' [1] کبھی کبھی آنحضرت ﷺ پر نماز میں رقت طاری ہو جاتی تھی اور چشم مبارک سے آنسو نکلنے لگتے تھے۔ ایک صحابی جنھوں نے آنحضرت ﷺ کی اس کیفیت کو ایک دفعہ دیکھا تھا، کہتے ہیں کہ میں نے دیکھا کہ آنحضرت ﷺ نماز میں ہیں، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، روتے روتے ہچکیاں بندھ گئی ہیں، ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گویا چکی چل رہی ہے یا ہانڈی ابل رہی ہے۔ [2] رات کی نمازوں میں آنحضرت ﷺ پر عجیب ذوق وشوق کا عالم طاری ہوتا تھا۔ قرآن پڑھتے چلے جاتے، جب خدا کی عظمت و کبریائی کا ذکر آتا پناہ مانگتے، جب رحم وکرم کی آیتیں آتیں تو دعا کرتے۔ [3] آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''نماز دو دو رکعت کر کے ہے اور ہر دوسری رکعت میں تشہد ہے اور تضرع وزاری ہے، خشوع اور خضوع ہے، عاجزی اور مسکنت ہے اور ہاتھ اٹھا کر اے رب، اے رب کہنا ہے، جس نے ایسا نہ کیا تو اس کی نماز ناقص ہے۔'' [4]

ایک دفعہ آپ اعتکاف میں تھے اور لوگ مسجد میں زور زور سے قراءت کر رہے تھے آپ ﷺ نے فرمایا: ''لوگو تم میں سے ہر ایک خدا سے مناجات کر رہا ہے تو وہ سمجھے کہ وہ کیا کہہ رہا ہے اور ایک دوسرے کی مناجات میں اپنی آواز سے خلل انداز نہ ہو۔'' [5]

ایک صحابی نے درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ! مجھے کچھ ہدایت فرمایئے ارشاد ہوا کہ ''جب تم نماز کے لیے کھڑے ہو تو تمہاری نماز ایسی ہونی چاہیے کہ یہ معلوم ہو کہ تم اس وقت مر رہے ہو اور دنیا کو چھوڑ رہے ہو۔'' [6] تمہاری نماز کی اس کیفیت کا کوئی شخص اندازہ کر سکتا ہے؟ اس پوری تفصیل سے ظاہر ہو گا کہ اسلام کی نماز کیا ہے؟ قرآن کس نماز کو لے کر اترا ہے اور محمد رسول اللہ ﷺ نے کس نماز کی تعلیم دی ہے؟ اور اس کی اصلی کیفیتیں کیا کیا ہیں؟ اور اگر نماز یہ نماز ہو تو وہ انسان کی روحانی اور اخلاقی اصلاحات کا کتنا مؤثر ذریعہ ہے۔ اسی لیے قرآن پاک نے نماز کی محافظت یعنی پابندی اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کو ایمان کا نتیجہ بتایا ہے:

﴿ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝ ﴾

(٦/ الانعام: ٩٢)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب سؤال جبرئیل النبی ﷺ: ٥٠۔ [2] ترمذی فی "الشمائل": ٣٢١ وابوداود، کتاب الصلاۃ، باب البکاء فی الصلوٰۃ: ٩٠٥۔ [3] مسند احمد بن حنبل، ج ٦، ص: ٩٢۔
[4] ابوداود، کتاب التطوع، باب صلوٰۃ النہار: ١٢٩٦ وترمذی، ابواب الصلاۃ، باب ما جاء فی التخشع فی الصلوٰۃ: ٣٨٥۔ [5] ابوداود، کتاب التطوع، باب رفع الصوت...: ١٣٣٢۔
[6] مسند احمد، ج ٥، ص: ٤١٢ عن ابی ایوب۔

"اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ قرآن کو مانتے ہیں اور وہ اپنی نماز کی نگہداشت کرتے ہیں۔"

نماز کی اس نگہداشت اور محافظت کے دو معنی ہیں اور دونوں یہاں مقصود ہیں، یعنی ایک تو اس کے ظاہری شرائط کی تعمیل اور دوسرے اس کے باطنی آداب کی رعایت۔

نماز کے اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی فائدے

نماز تو درحقیقت ایمان کا ذائقہ، روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ وہ مسلمانوں کے اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی کارگر آلہ ہے، آنحضرت ﷺ کے ذریعہ سے اخلاق وتمدن ومعاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں، ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا، اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسے بدوی، وحشی اور غیر متمدن ملک کو جس کو پہننے اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا، چند سال میں ادب وتہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا، اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے، تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف مذہب کے اثر سے، مہذب ومتمدن ہو جاتا ہے، متمدن قوموں میں جب وہ پہنچ جاتا ہے، تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر، پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا دیتا ہے اور ان کو اخلاص کی وہ تعلیم دیتا ہے، جس کے سبب سے ان کا وہی کام جو پہلے مٹی تھا، اب اکسیر بن جاتا ہے۔

❶ **ستر پوشی:** نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز ستر پوشی کا خیال ہے، انسان کا شرم وحیا کی نگہداشت کے لیے، اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے، عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے، بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے، یہاں تک کہ غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھی اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں، اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا، یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں، آیت نازل ہوئی:

﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷/ الاعراف: ۳۱)

"ہر نماز کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔"

مردوں کے لیے کم از کم ناف سے گھٹنے تک اور عورتوں کے لیے پیشانی سے لے کر پاؤں تک چھپانا نماز میں ضروری قرار پایا، اس تعلیم نے جاہل اور وحشی عربوں کو اور جہاں جہاں اسلام گیا، وہاں کے برہنہ باشندوں کو ستر عورت پر مجبور کیا، اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ دفعہ ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے ان کو ستر پوش بنا دیا، افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے، دوسری طرف متمدن قومیں، زیب وزینت اور حسن وآرائش اور تمدن کی بے اعتدالی سے بے حیائی پر اتر آتی

ہیں، مرد گھٹنوں سے اونچا لباس اور عورتیں نیم برہنہ یا نہایت باریک لباس پہنتی ہیں، نماز ان کی بھی اصلاح کرتی ہے اور ان متمدن قوموں کو اعتدال سے تجاوز نہیں کرنے دیتی، چنانچہ عورتوں کو تیز خوشبو لگا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا اور بے حیائی کے کپڑوں کے پہننے سے عموماً روک دیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ ستر عورت کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

❷ طہارت: اس کے بعد تمدن کا دوسرا ابتدائی سبق طہارت اور پاکیزگی ہے، جو اسلام کے اولین احکام میں سے ہے، اقرأ کے بعد دوسری ہی وحی میں جو آنحضرت ﷺ پر نازل ہوئی اس میں یہ حکم تھا:

﴿ وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:۴)

''اور اپنے کپڑوں کو پاک رکھ۔''

چنانچہ اسلام نے اس طہارت اور پاکیزگی کے اصول مقرر کیے اور آنحضرت ﷺ نے اپنی تعلیمات سے اس کے حدود متعین فرمائے اور نماز کی درستی کے لیے یہ ضروری قرار دیا کہ انسان کا بدن، اس کے کپڑے اور اس کی نماز پڑھنے کی جگہ نجاستوں اور آلودگیوں سے پاک ہو، اہل عرب کو دوسری وحشی قوموں کی طرح طہارت ونظافت کی مطلق تمیز نہ تھی، یہاں تک کہ ایک بدو نے مسجد نبوی ﷺ میں آ کر سب کے سامنے بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہ رضی اللہ عنہم اس کو مارنے کو دوڑے، آپ نے ان کو روکا، اور اس بدو کو اپنے پاس بلا کر نہایت مہربانی سے فرمایا کہ ''یہ نماز پڑھنے کی جگہ ہے، اس قسم کی نجاستوں کے لیے یہ موزوں نہیں ہے۔'' اور صحابہ سے فرمایا کہ ''اس نجاست پر پانی بہادو۔'' ❶ ایک دفعہ ایک قبر کے پاس سے آپ گزرے تو فرمایا کہ ''اس قبر والے پر اس لیے عذاب ہو رہا ہے کہ یہ پیشاب کی چھینٹوں سے پرہیز نہیں کرتا تھا۔'' ❷ غرض اس تعلیم نے جو صرف نماز کے لیے تھی، اہل عرب اور عام مسلمانوں کو پاک وصاف رہنے کا خوگر بنایا، اور استنجا، بیت الخلا اور طہارت کے وہ آداب سکھائے جن سے آج کی بڑی بڑی متمدن قومیں بھی ناآشنا ہیں۔ نجاستوں سے اپنے بدن، کپڑے، اور مکان کو صاف رکھنے کی تعلیم دی، جو صحابہ طہارت کا اہتمام کرتے تھے، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ فِيهِ رِجَالٌ يُحِبُّونَ أَنْ يَتَطَهَّرُوا ۚ وَاللَّهُ يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِينَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

''اس مسجد میں کچھ لوگ ایسے ہیں جو پسند کرتے ہیں، کہ وہ پاک وصاف رہیں اور اللہ تعالیٰ پاک وصاف رہنے والوں کو پیار کرتا ہے۔''

جب اسلام نے طہارت و پاکیزگی کو خدا کے پیار کرنے کا ذریعہ ٹھہرایا تو اس نعمت سے محرومی کو کون پسند کرسکتا ہے؟

❸ صفائی: نماز کا تیسرا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو اپنے جسم اور اعضا کے پاک اور ستھرا رکھنے پر مجبور کرتی

---

❶ صحیح بخاري، کتاب الوضوء، باب صب الماء علی البول: ۲۲۰۔

❷ صحیح بخاري، کتاب الوضوء، باب من الکبائر ان لا یستتر من بوله: ۲۱۶۔

ہے، دن میں عموماً پانچ دفعہ ہر نمازی کو منہ ہاتھ پاؤں جو اکثر کھلے رہتے ہیں، ان کے دھونے کی ضرورت پیش آتی ہے، ناک میں پانی ڈال کر ناک صاف کرنی ہوتی ہے، ایک بڑے ڈاکٹر نے مجھ سے یہ کہا کہ آج کل کے جراثیم کے نظریہ کی بنا پر بہت سی بیماریاں ناک کی سانس کے ذریعہ جراثیم کے بدن کے اندر جانے سے پیدا ہوتی ہیں اور ناک کے نتھنوں کو پانی ڈال کر صاف کرنے سے یہ جراثیم دور ہوتے ہیں۔

دنیا میں اسلام کے سوا اور کوئی مذہب نہیں ہے جس نے ناک میں پانی ڈالنا ضروری قرار دیا ہو، حالانکہ طبی حیثیت سے یہ سب سے زیادہ ضروری چیز ہے، اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے احکام کس قدر طبی اصول پر مبنی ہیں، نمازیوں کو پنج وقتہ وضو کی ہدایت کی اہمیت اس وقت اور بڑھ جاتی ہے، جب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم نازل ہوا، اس ملک میں جہاں پانی سب سے زیادہ کمیاب ہے۔

اہل عرب اور خصوصاً بدو دانتوں کو بہت کم صاف کرتے ہیں، جس سے گندہ دہنی اور بدنمائی کے علاوہ طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہوتی ہیں، آنحضرت ﷺ نے ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کی اتنی تاکید فرمائی ہے کہ گویا وجوب کے قریب پہنچ گئی اور فرمایا کہ ''اگر میری امت پر یہ شاق نہ گزرتا تو میں اس کو ضروری قرار دیتا۔'' [1] اسی پانی کی کمی کی وجہ سے اہل عرب نہاتے کم تھے، ان کے کپڑے عموماً اون کے ہوا کرتے تھے، وہ محنت مزدوری کرتے تھے، جس سے پسینہ میں شرابور ہو جاتے تھے اور چونکہ ایک ایک کپڑے کو ہفتوں پہنے رکھتے تھے، اس لیے جب مسجد میں نماز پڑھنے آتے، تو ان کے بدن اور کپڑوں سے بدبو آتی تھی، اس بنا پر اسلام نے ہفتہ میں کم از کم ایک مرتبہ جمعہ کو نماز سے پہلے غسل کرنا اور نہانا سب پر واجب کر دیا آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((غسل يوم الجمعة واجب على كل محتلم)) [2]

''جمعہ کے دن نہانا ہر بالغ پر ضروری ہے۔''

اسی کے ساتھ اس دن دھلے ہوئے کپڑے پہننا، خوشبو ملنا اور صفائی و نظافت کے دوسرے امور کو مستحسن قرار دیا، بعض حالات میں غسل کرنا فرض قرار دیا، جس کے بغیر کوئی نماز ممکن ہی نہیں، فرمایا:

﴿ وَاِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوْا ﴾ (٥/ المآئدة:٦)

''اور اگر تم ناپاک ہو گئے ہو تو نہا کر اچھی طرح پاک ہو جاؤ۔''

4 پابندی وقت

انسان کی کامیاب عملی زندگی کا سب سے بڑا راز یہ ہے کہ اس کے تمام کام مقررہ اوقات پر انجام پائیں، انسان فطرتاً آرام پسند اور راحت طلب پیدا ہوا ہے، اس کو پابند اوقات بنانے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے

---

1 صحيح بخاري، كتاب الجمعة، باب السواك يوم الجمعة:٨٨٧۔

2 صحيح بخاري، كتاب الجمعة، باب فضل الغسل يوم الجمعة:٨٧٩۔

بعض کاموں کے اوقات جبراً مقرر کر دیے جائیں، جیسا کہ کاروبار کے کاموں میں آپ کو یہ اصول نظر آتا ہے، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنے دوسرے کاموں کے اوقات بھی ان کی خاطر مقرر کر لیتا ہے اور اس طرح اس کی زندگی باقاعدہ ہو جاتی ہے اور اس کا وقت فضول برباد نہیں ہوتا، نماز کے اوقات چونکہ مقرر ہیں، اس لیے وہ لوگ جو نماز کے پابند ہیں، خصوصاً نماز باجماعت کے، ان کے اوقات خود بخود منظم ہو جاتے ہیں، ان کے دن رات کے کام باقاعدہ انجام پاتے ہیں اور نماز کے اوقات ان کے کاموں کا معیار ہو جاتے ہیں، وقت پر سونا اور وقت پر اٹھنا ان کے لیے ضروری ہو جاتا ہے، مشہور صحابی حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ کا مقولہ ہے:

((الصلوة مكيال فمن اوفى اوفي به ومن طفف فقد علمتم ماللمطففين)) [1]

''نماز ایک پیمانہ ہے، جس نے اس کو پورا ناپا، اس کو پورا ناپ کر دیا جائے گا اور جس نے ناپنے میں کمی کی تو تمہیں کم ناپنے والوں کی سزا معلوم ہے۔''

اس قول کے جہاں اور مطلب ہو سکتے ہیں، یہ بھی ہو سکتا ہے کہ نماز ہر مسلمان کے کام کا پیمانہ ہے، اسی سے اس کی ہر چیز ناپی جا سکتی ہے۔

5 صبح خیزی

طب اور حفظان صحت کے اصول سے رات کو سویرے سونا اور صبح کو طلوع آفتاب سے پہلے بیدار ہونا جس درجہ ضروری ہے، وہ مخفی نہیں، جو لوگ نماز کے پابند ہیں، وہ اس اصول کی خلاف ورزی کبھی نہیں کر سکتے، جب تک رات کو وقت پر سویا نہ جائے گا، صبح کو وقت پر آنکھ نہیں کھل سکتی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے رات کو نماز عشاء کے بعد بے کار باتیں کرنے سے اور قصہ کہانی سے منع فرمایا ہے [2] تاکہ وقت پر سونے سے وقت پر آنکھ کھل سکے اور صبح خیزی مسلمانوں کی عادت ہو جائے اور صبح کو موذن کی پر تاثیر آواز۔

((اَلصَّلٰوةُ خَيْرٌ مِّنَ النَّوْمِ))

''سونے سے نماز بہتر ہے۔''

ان کو بے تابانہ اپنے خواب کے بستر سے اٹھا دے۔

6 اللہ کا خوف

ایک مسلمان جو نماز پڑھتا ہے، جب کبھی غلطی سے یا بشری کمزوری سے اس کا قدم ڈگمگاتا ہے، تو رحمت الٰہی اس کا ہاتھ تھام لیتی ہے، اس کو اپنے فعل پر ندامت ہوتی ہے، اس کو اپنے خدا کے سامنے جاتے ہوئے شرم آتی ہے، اس کا ضمیر اس کو ملامت کرتا ہے، وہ لوگوں سے اس بنا پر شرماتا ہے کہ وہ کہیں گے کہ یہ نمازی ہو کر اس قسم کے افعال کا مرتکب ہوتا ہے، کہ اس کے پاؤں بدی کے راستہ پر پڑتے وقت کانپتے ہیں، غرض نماز انسان

[1] كنز العمال مندوبات الصلوٰة، ج ٤، ص: ٢٣٠ بحواله مصنف عبدالرزاق۔

[2] بخاری، كتاب مواقيت الصلاة، باب مايكره من السمر بعد العشاء: ٥٩٩۔

کے اخلاقی حاسہ کو بیدار کرتی ہے اور برائیوں سے بچاتی ہے اور خود خدا نے نماز کا وصف یہ بیان کیا ہے:

﴿ اِنَّ الصَّلٰوةَ تَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ ﴾ (۲۹/ العنکبوت:۴۵)

''بے شک نماز بے حیائی اور بری باتوں سے روکتی ہے۔''

7 ہشیاری

نماز عقل، ہوش، بیداری اور آیاتِ الٰہی میں تدبر اور غور، خدا کی تسبیح و تہلیل اور اپنے لیے دعائے مغفرت کا نام ہے، اس لیے وہ تمام چیزیں جو انسان کی عقل و ہوش اور فہم اور احساس کو کھو دیں، نماز کی حقیقت کے منافی ہیں، اسی لیے اس وقت بھی جب شراب کی ممانعت نہیں ہوئی تھی، اس کو پی کر نشہ کی حالت میں نماز پڑھنا جائز نہ تھا:

﴿ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ﴾ (۴/ النسآء:۴۳)

''نشہ کی حالت میں تم نماز کے قریب نہ جاؤ، یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو جو کچھ کہتے ہو۔''

اس بنا پر ایک نماز کا پابند تمام ایسی چیزوں سے جو اس کی عقل و ہوش کو گم کر دیں، قطعاً پرہیز کرے گا۔

8 مسلمان کا امتیازی نشان

مذہبی بلکہ سیاسی حیثیت سے بھی اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی، قانون ان دونوں گروہوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا، احکام میں حج ایک ایسی چیز ہے، جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے، اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز تھی، خلائق کا اجتماع ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا، جو عرب کے تمدن کا ایک لازمی جزو تھا، فخر و امتیاز کے موقعے بھی اس میں حاصل ہو سکتے تھے، گو اسلام نے اس کی اصلاح کر دی، زکوۃ بھی کوئی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی، کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا بھی ذریعہ ہو سکتی تھی، اس کے ساتھ یہ عرب کی فیاض طبیعت پر بھی گراں نہیں ہو سکتی تھی، فقرا کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ بھی فطری ہے، صرف معمولی تحریک کی ضرورت تھی، روزہ بھی اس کا معیار نہیں قرار دیا جا سکتا، کیونکہ روزہ میں چھپے چوری کھا پی لینے کا موقع بہ آسانی حاصل ہو سکتا ہے، صرف نماز ایک ایسی چیز ہے، جو ان دونوں گروہوں میں حد فاصل ہو سکتی ہے، چنانچہ قرآن پاک نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص پہچان قرار دیا:

﴿ وَاِذَا قَامُوْٓا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ﴾ (۴/ النسآء:۱۴۳)

''اور جب وہ نماز پڑھنے کو اٹھتے ہیں تو کسل مندی کے ساتھ اٹھتے ہیں۔''

نیز فرمایا:

﴿ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''خضوع و خشوع والوں کے علاوہ نماز سب پر گراں ہے۔''

خصوصاً عشاء اور فجر کی نماز کی نسبت کہ یہ راحت کے اوقات ہیں، آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((لیس صلاۃ اثقل علی المنافقین من الفجر و العشاء)) [1]

''منافقین پر فجر و عشاء سے زیادہ کوئی نماز گراں نہیں ہے۔''

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ''جب ہم (صحابہ) کسی کو عشاء اور صبح کی نمازوں میں غیر حاضر پاتے تھے تو ہم اس سے بدگمان ہو جاتے تھے۔'' [2] مدینہ آ کر نماز میں قبلہ کی تبدیلی جہاں اور مصلحتوں سے تھی، وہاں ایک مصلحت یہ بھی تھی، کہ اس سے مخلصین اور منافقین کی تمیز ہو سکے، مکہ معظمہ کے لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے، بیت المقدس کی طرف منہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے، مدینہ میں یہود آباد تھے، جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے، وہ بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہیں کرتے تھے، اس لیے عرب منافقین کی پہچان بیت المقدس کے قبلہ بنانے سے اور یہود منافقین کی پہچان کعبہ قبلہ بنانے سے ہو سکتی تھی، چنانچہ قرآن پاک میں ہے:

﴿وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَن يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّن يَنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِن كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۴۳)

''اور جس قبلہ پر تم تھے اس کو ہم نے قبلہ نہیں بنایا، لیکن اس لیے، تاکہ ہم ان کو جو رسول کی پیروی کرتے ہیں، ان سے الگ کر دیں جو الٹے پاؤں پھر جائیں گے اور یہ قبلہ گراں ہوا، لیکن ان پر جن کو خدا نے راہ دکھائی۔''

یہ پہچان اور شناخت اب قیامت تک قائم رہے گی، اسی لیے آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''جس نے ہمارا ذبیحہ کھایا اور ہمارے قبلہ کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی، وہ مسلمان ہے۔'' [3]

9. باطل کی شکست اور حق کی خاطر لڑنا انسان کا فرض ہے، اس فرض کے انجام دینے کے لیے انسان کو ہر وقت تیار رہنا چاہیے، اس تیاری کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں ہیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

کان النبی ﷺ و جیوشه اذا علوا الثنا یا کبروا و اذا هبطوا سبحوا فوضعت الصلوۃ علی ذلك۔ [4]

''آنحضرت ﷺ اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تھا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تھا، تو تسبیح کہتا تھا، نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔''

---

[1] بخاری، کتاب الاذان، باب فضل صلاۃ العشاء فی الجماعۃ: ۶۵۷۔

[2] مستدرك حاکم (علی شرط الشیخین) ج ۱، ص: ۲۱۱۔

[3] بخاری، کتاب الصلاۃ، باب فضل استقبال القبلۃ: ۳۹۱۔

[4] ابوداود، کتاب الجهاد، باب ما یقول الرجل اذا سافر: ۲۵۹۹۔

صف بندی، ایک افسر (امام) کی اطاعت، تمام سپاہیوں (نمازیوں) کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پوری صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست مسلمانوں کو صفِ جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے، جاڑوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو جانا، عصر کے وقت لہو ولعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دعا وزاری کر لینا، صبح کو خواب سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمدِ باری میں مصروف ہونا، اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے میں پیدا کریں اور کام کی ضرورت کے وقت احساسِ فرض کے تقاضے کو بجالانا ضروری سمجھیں اور اس کے لیے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں، ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لیے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پُر آرام سے پُر آرام وقت میں ممکن تھا، مگر اس کے لیے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تا کہ اس اجتماع اور مظاہرہ میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں اور نماز جمعہ کا ہر پابند شہادت دے گا کہ اس کی اتنی سی یہ عادت مشکلات وقت کے اتفاقات میں اس کے لیے کس قدر ممدّ ثابت ہوتی ہے۔

⑩ تمام عبادات، بلکہ تمام مذاہب کا اصل مقصد تکمیل اخلاق ہے، لیکن اصلاح اخلاق کا سب سے بڑا ذریعہ یہ ہے کہ نفس ہر وقت بیدار اور اثر قبول کرنے کے لیے آمادہ رہے، تمام عبادات میں صرف نماز ہی ایک ایسی چیز ہے جو نفس کو بیدار رکھ سکتی ہے، روزہ، حج، زکوٰۃ اولاً تو ہر شخص پر فرض نہیں ہیں، اس کے ساتھ روزہ سال میں ایک بار فرض ہوتا ہے، زکوٰۃ کا بھی یہی حال ہے، حج عمر میں ایک بار ادا کرنا پڑتا ہے، اس لیے یہ فرائض نفس کے تنبہ اور بیداری کا دائمی اور ہر روزہ ذریعہ نہیں ہو سکتے، برخلاف ان کے نماز دن میں پانچ بار ادا کرنی ہوتی ہے، ہر وقت وضو کرنا پڑتا ہے، سجدہ، رکوع، قیام وقعود، جہر، خفا، تسبیح وتہلیل، تکبیر وتشہد نے اس کے ارکان و اعمال میں تنوع وامتیاز پیدا کر دیا ہے، جن میں ہر چیز نفس میں تدریجی اثر پذیری کی قابلیت پیدا کرتی ہے اور ہر چوبیس گھنٹہ میں چند گھنٹوں کے وقفہ سے نفس انسانی کو ہشیار اور قلب خفتہ کو بیدار کرتی ہے، اس طرح نفس کو رات دن تنبہ ہوا کرتا ہے۔

⑪ الفت ومحبت

نماز مسلمانوں میں باہمی الفت ومحبت پیدا کرنے کا ذریعہ ہے، محلّہ کے تمام مسلمان جب کسی ایک جگہ دن میں پانچ دفعہ جمع ہوں اور باہم ایک دوسرے سے ملیں تو ان کی بیگانگی دور ہوگی، ان میں آپس میں محبت اور الفت پیدا ہوگی، اس طرح وہ ایک دوسرے کی امداد کے لیے ہر وقت تیار رہیں گے، قرآن پاک نے نماز کے اس وصف اور اثر کی طرف خود اشارہ کیا ہے:

﴿ وَاتَّقُوْهُ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ مِنَ الَّذِيْنَ فَرَّقُوْا دِيْنَهُمْ وَكَانُوْا

شِيَعًا﴾ (۳۰/ الروم:۳۱۔۳۲)

''خدا سے ڈرتے رہو اور نماز کھڑی رکھو اور مشرکوں میں سے نہ بنو، ان میں سے جنہوں نے اپنے دین میں پھوٹ ڈالی اور بہت سے جتھے ہو گئے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کا اجتماع مسلمانوں کو جتھا بندی اور فرقہ آرائی سے بھی روک سکتا ہے، کہ جب ایک دوسرے سے ملاقات ہوتی رہے گی، تو غلط فہمیوں کا موقع کم ملے گا۔

⑫ غمخواری

بلکہ اس سے آگے بڑھ کر نماز مسلمانوں میں باہمی ہمدردی اور غمخواری کا ذریعہ بھی بنتی ہے، جب امیر و غریب سب ایک جگہ ہوں گے اور امرا اپنی آنکھ سے غریبوں کو دیکھیں گے تو ان کی فیاضی کو تحریک ہوگی، ایک دوسرے کے دکھ درد کی خبر ہوگی اور اس کی تلافی کی صورت پیدا ہوگی۔ ابتدائے اسلام میں اصحاب صفہ کا ایک گروہ تھا، جو سب سے زیادہ مستحقِ اعانت تھا، یہ گروہ مسجد میں رہتا تھا، صحابہ نماز کو جاتے تو ان کو دیکھ کر خود بخود ہمدردی پیدا ہوتی تھی، چنانچہ اکثر صحابہ کھجور کے خوشے لے جا کر مسجد میں لٹکا دیتے تھے، جس پر یہ گروہ گزر اوقات کرتا تھا، اکثر صحابہ اور خود آنحضرت ﷺ نماز سے فارغ ہو کر ان لوگوں کو ساتھ لاتے اور اپنے گھروں میں کھانا کھلاتے تھے، اب بھی مساجد خیرات وصدقات کا ذریعہ ہیں، یہی وجہ ہے کہ قرآن مجید میں نماز اور زکوٰۃ کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے:

﴿وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''اور نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے صرف کرتے ہیں۔''

⑬ اجتماعیت

اجتماعیت چونکہ ایک فطری چیز ہے، اس لیے تمام قوموں نے اس کے لیے مختلف اوقات اور تہوار مقرر کیے ہیں، جن قوموں کو مذہبی قیود سے آزاد کہا جاتا ہے، ان میں بھی اس اجتماعیت کی نمائش کلبوں، کانفرسوں، آٹیورسریوں اور دوسرے جلسوں، جلوسوں اور مظاہروں سے کی جاتی ہے، لیکن یہ اجتماعیت جہاں فائدے پہنچاتی ہے، وہاں اپنے مضر اثرات بھی ضرور پیش کرتی ہے، اجتماعیت کام چاہتی ہے، اگر مفید کام پیش نظر نہ ہو تو وہی رنگ رلیوں، رقص وسرود، شراب خوری، قمار بازی، چوری، بدنظری، بدکاری، رشک وحسد، بلکہ قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے، میلے ٹھیلے، عرس، ہولی، تہوار جن کی مثالیں عرب مشرکوں میں بھی ملتی تھیں اور اب بھی ملتی ہیں، قبور پر ناجائز اجتماع، غرض تمام اجتماعی بدعات بدترین گناہوں اور فسادوں کا مرکز بن جاتے ہیں، اب اگر ان خطرناک رسوم کا صرف انسداد ہی کیا جاتا اور ان کی جگہ اسلام ان کے سامنے کوئی دوسری چیز پیش نہ کرتا، تو محض یہ سلبی علاج کافی نہ ہوتا، ضرورت تھی کہ وہ اپنے قومی اجتماع کے لیے کوئی مشغلہ مقرر کرے، جس

سے قلب انسانی اپنی فطری پیاس کو بجھا سکے اور اجتماعیت پیدا ہو کر بدی کی بجائے نیکی کے رخ کی طرف بہے، چنانچہ اسلام نے اسی لیے روزانہ جماعت کی عام نمازیں، ہفتہ میں جمعہ کی نماز اور سال میں دو دفعہ عیدین کی نمازیں مقرر کیں، کہ اجتماعیت کا فطری تقاضا بھی پورا ہو اور مشرکانہ بدیوں اور اخلاقی برائیوں سے بھی احتراز ہو کہ اس اجتماع کی بنیادی دعوت خیر پر رکھی گئی ہے، حج کے عالمگیر مذہبی اجتماع میں دوسرے اجتماعی اور اقتصادی مقاصد کے برقرار رکھنے کے ساتھ اس کے مشاغل بھی خدا کے ذکر اور اس کی بارگاہ میں توبہ و انابت کو قرار دیا، اس طرح اسلام کا ہر اجتماع پاکیزگی خیال اور اخلاص عمل کی بنیاد پر قائم ہے۔

⑭ کاموں کا تنوع

انسان کی فطرت کچھ ایسی بنی ہے کہ وہ ہمرنگی کے باوجود تفنن اور تجدد کا طالب ہے، لیکن اگر انسان کے دل و دماغ، اعضاء و جوارح ہر وقت اسی ایک کام میں مصروف رہیں، تو سکون و اطمینان، عیش و راحت اور دلچسپی کی لذت، جو ہر عمل کا آخری نتیجہ ہے، مفقود ہو جائے، مفید سے مفید کام سے بھی دنیا چیخ اٹھے، اسی لیے قدرت نے اوقات کی تقسیم ایسے مناسب طریقے پر کی ہے، جس میں انسان کو حرکت و سکون دونوں کا یکساں موقع ملتا رہتا ہے، رات اور دن کا اختلاف اسی بنا پر آیاتِ الٰہی میں شمار کیا گیا ہے، کہ اس تغیر و تبدل سے نظام عالم میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے اور اس تقسیم سے انسانوں میں اپنے ہر کام کی لذت قائم رہتی ہے، نماز ایک ایسا فریضہ ہے جو نہ تو ہر لمحہ اور لحظہ انسان پر فرض ہے اور نہ سال میں ایک دفعہ یا عمر بھر میں صرف ایک دفعہ فرض ہے، بلکہ ہر روز پانچ دفعہ اس کو ادا کرنا پڑتا ہے، صبح سے کام شروع کیا تو ظہر پر آ کر توڑ دیا، پھر مشغولیت ہوئی اور عصر پر پہنچ کر ختم ہوئی، پھر جو سلسلہ چھڑا اس کا مغرب پر خاتمہ ہوا، بعد ازیں خانگی مصروفیت شروع ہوئی اور عشاء پر جا کر منتہی ہوئی، اب نیند آ گئی اور صبح تک بے خبری رہی، اٹھے تو دعاؤں کے افتتاح سے پھر اپنا کاروبار شروع کیا، وہ دولت مند جو جسمانی یا دماغی محنت و مشقت اور مزدوری سے اپنی روزی نہیں حاصل کرتے، وہ اس روحانی ''انٹرول'' (وقفہ) کے لطف سے آگاہ نہیں، یہ معلوم ہوتا ہے کہ انسان چند گھنٹوں تک ایک ہی قسم کی محنت کے بوجھ سے جو دبا جاتا تھا، وہ چند منٹ میں، ہاتھ منہ دھو کر دعا و تسبیح اور نشست و برخاست کے ذریعہ اس سے ہلکا ہو گیا اور پھر سے اس نے اپنے کام کے لیے نئی قوت پیدا کر لی۔

⑮ تربیت

انسان کی عملی کامیابی، استقلال اور مواظبت پر موقوف ہے، کہ جس کام کو اس نے شروع کیا، پھر اس پر عمر بھر قائم رہے، اسی کا نام عادات و اخلاق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی ہے، جس کام میں اس خلق کی استواری اور کیرکٹر کی مضبوطی کی تربیت ہو وہ ضروری ہے کہ روزانہ ہو، بلکہ دن میں کئی دفعہ ہو نماز ایک ایسا فریضہ ہے، جس کے بارے عہدہ برآ ہونے کے لیے انسان میں، استقلال، مواظبت اور مداومت شرط ہے،

اس لیے انسان میں اس اخلاقی خوبی کے پیدا کرنے کا ذریعہ نماز سے بڑھ کر کوئی اور چیز نہیں ہوسکتی، اس لیے قرآن پاک نے صحابہ کی مدح میں فرمایا:

﴿ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ﴾ (۷۰/ المعارج: ۲۳)

''وہ جو اپنی نماز مداومت کے ساتھ ادا کرتے ہیں۔''

آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((احب العمل الى الله ادومه وان قلّ)) [1]

''محبوب ترین عمل خدا کے نزدیک وہ ہے جو ہمیشہ کیا جائے گو وہ کم ہو۔''

⑯ نظم جماعت

کسی قوم کی زندگی، اس کی نظمِ جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی، یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر و پراگندہ ہو جاتا ہے، اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے، محمد رسول اللہ ﷺ نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کر کے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا یہ صف بہ صف کھڑا ہونا، ایک دوسرے سے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا، ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے، جس طرح نماز کی درستی اس صف اور نظامِ جماعت کی درستی پر موقوف ہے، اسی طرح پوری قوم کی زندگی اسی باہمی تعاون، تضامن، مشارکت، میل جول اور باہمی ہمدردی پر موقوف ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ صفوف کی درستی پر بہت زور دیتے تھے اور فرماتے تھے، کہ ''جب تک تم خوب مل کر کھڑے نہ ہوگے تمہارے دل بھی آپس میں نہ ملیں گے۔'' [2]

⑰ مساوات

یہی جماعت کی نماز مسلمانوں میں برادرانہ مساوات اور انسانی برابری کی درس گاہ ہے، یہاں امیر و غریب، کالے گورے، رومی، حبشی، عرب و عجم کی کوئی تمیز نہیں ہے، سب ایک ساتھ ایک درجہ اور ایک صف میں کھڑے ہو کر خدا کے آگے سرنگوں ہوتے ہیں، جماعت کی امامت کے لیے حسب و نسب، نسل و خاندان، رنگ و روپ، قومیت اور جنسیت، عہدہ اور منصب کی ضرورت نہیں ہوتی، بلکہ علم و دانش، فضل و کمال، تقویٰ و طہارت کی ضرورت ہوتی ہے، یہاں شاہ و گدا اور شریف و رذیل کی تفریق نہیں، سب ہی ایک زمین پر، ایک امام کے پیچھے، ایک صف میں دوش بدوش کھڑے ہوتے ہیں اور کوئی کسی کو اپنی جگہ سے نہیں ہٹا سکتا اور اس برادرانہ مساوات اور انسانی برادری کی مشق دن میں پانچ دفعہ ہوتی ہے، کیا مسلمانوں کی معاشرتی جمہوریت کی یہ درس گاہ کہیں اور بھی قائم ہے؟

---

[1] ابوداود، کتاب التطوع، باب ما یؤمر به من القصد فی الصلوۃ: ۱۳۶۸۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب تسویة الصفوف عندالاقامة و بعد ها: ۷۱۷؛ ابوداود، کتاب الصلوۃ، باب تسویة الصفوف: ۶۶۳۔

18 اطاعت

جماعت کی سلامتی بغیر ایک مفترض الطاعۃ امام کے ناممکن ہے، جس کے اشارہ پر تمام قوم حرکت کرے، نماز باجماعت مسلمانوں کی اس زندگی کا رمز ہے، کہ جس طرح ان کی اس عبادت کا ایک امام ہے، جس کے اشارہ پر وہ حرکت کرتے ہیں، اسی طرح قوم کی پوری زندگی کا بھی ایک امام ہونا چاہیے، جس کے اللہ اکبر کی آواز قوم کے کاروان کے لیے بانگ درا اور صدائے جرس ثابت ہو۔

اطاعت امام کے لیے ایک طرف تو قوم میں فرمانبرداری کی قابلیت موجود ہونی چاہیے، جس کی تعلیم مقتدیوں کو نماز میں ہوتی ہے، دوسری طرف امام کو اخلاق صالحہ کی ایک ایسی مثال پیش کرنی چاہیے جو ہمیشہ لوگوں کے پیشِ نظر رہے، نماز ان دونوں چیزوں کا مجموعہ ہے، وہ ایک دائمی حرکت ہے، جو قوم کے اعضاء و جوارح کو ہر وقت اطاعت گزاری کے لیے تیار رکھتی ہے، اس کے ساتھ نمازِ پنجگانہ اور جمعہ وعیدین کی امامت خاص امام کا حق ہے، اس لیے ہر وقت قوم کو اس کے اعمال کے احتساب، اس پر نکتہ چینی، اس سے اثر پذیری کا موقع ملتا ہے، نماز کے اوقات خاص طور پر ایسے موزوں ہیں جو ایک عیاش اور راحت طلب شخص کا پردہ فاش کر دیتے ہیں، ایک ایسا شخص جو شب بھر عیش وعشرت میں مصروف ہو، نماز صبح میں شریک نہیں ہوسکتا، ایک راحت طلب آدمی ظہر کے وقت دھوپ کی شدت برداشت کر کے شریک جماعت ہونا پسند نہیں کرسکتا، چنانچہ خلافت راشدہ کے بعد جب بنوامیہ کا زمانہ آیا تو صحابہ کو خاص طور پر اس کا احساس ہوا اور بے خوف نگاہوں نے ان پر نکتہ چینیاں کیں، احادیث میں بھی خاص طور پر اس زمانہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے، جس میں ائمہ وقت پر نماز ادا کرنے میں غفلت کریں گے۔

19 معیارِ فضیلت

نماز کی امامت کے لیے چونکہ سوائے علم وفضل اور تقویٰ کے کوئی اور قید نہیں ہے، اس لیے امامت کے رتبہ اور درجہ کو حاصل کرنا ہر مسلمان کے لیے ہر وقت ممکن ہے، آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ”جماعت میں جو سب سے زیادہ صاحب علم (اقرأ) ہے وہ امام بننے کا سب سے زیادہ مستحق ہے، ایک دفعہ ایک مقام سے کچھ لوگ مسلمان ہونے کے لیے آئے، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ ان میں سے جو صاحب سب سے زیادہ کمسن ہیں، انہیں قرآن زیادہ یاد ہے، چنانچہ آپ نے انہیں کم سن صحابی کو ان کا امام مقرر فرمایا [1] اس سے مقصود یہ ہے کہ لوگوں میں اس کے ذریعہ سے علمی وعملی فضائل کے حاصل کرنے کی تشویق وترغیب بھی پیدا ہوتی ہے۔

20 روزانہ کی مجلس عمومی

آنحضرت ﷺ اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا، یا کوئی

[1] ابوداود، كتاب الصلوة، باب من احق بالامامة: ٥٨٥، ٥٨٧۔

سیاسی وقومی مشکل پیدا ہوتی، یا کوئی مذہبی بات سنانی ہوتی، تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلوٰۃ جامعۃ ''نماز جمع کرنے والی ہے'' سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس امرِ اہم سے اطلاع پاتے، یا اس کے متعلق اپنے مشورے عرض کرتے، یہ گویا مسلمانوں کے مذہبی، اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا بھی ذریعہ تھا، جس کے لیے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا کسل وسستی کے بہانہ بغیر جمع ہونا ضروری تھا۔

ان تمام امور کو سامنے رکھنے سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ نماز اسلام کا اولین شعار اور اس کے مذہبی و اجتماعی وتمدنی وسیاسی واخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے، اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم وجماعت کی ہر گرہ کھل گئی ہے، مسجد مسلمانوں کے ہر قومی اجتماع کا مرکز اور نماز اس مرکزی اجتماع کی ضروری رسم تھی، جس طرح آج ہر جلسہ کا افتتاح اس کے نصب العین کے اظہار و تعیین کے لیے صدارتی خطبات سے ہوتا ہے، اسی طرح مسلمان جب زندہ تھے، ان کے ہر اجتماع کا افتتاح نماز سے ہوتا تھا، ان کی ہر چیز اس کے تابع اور اسی کے زیر نظر ہوتی تھی، ان کی نماز کا گھر ہی ان کا دار الامارۃ تھا، وہی دار الشوریٰ تھا، وہی بیت المال تھا، وہی صیغۂ جنگ کا دفتر تھا، وہی درس گاہ اور وہی معبد تھا۔

جماعت کی ہر ترقی کی بنیاد، افراد کے باہمی نظم وارتباط پر ہے اور جماعت کے فائدہ کے لیے افراد کا اپنے ہر آرام وعیش اور فائدہ کو قربان کر دینا اور اختلاف باہمی کو تہ کر کے صرف ایک مرکز پر جمع ہو کر جماعتی ہستی کی وحدت میں فنا ہو جانا، اس کے حصول کی لازمی شرط ہے، اسی کی خاطر کسی ایک کو امام وقائد وسرلشکر مان کر اس کی اطاعت وفرمانبرداری کا عہد کر لینا ضروری ہے، اسلام کی نماز انہی رموز واسرار کا گنجینہ ہے، یہ مسلمانوں کا نظم وجماعت، اطاعت پذیری وفرمانبرداراور وحدت قوت کا سبق دن میں پانچ بار سکھاتی ہے، اسی لیے اس کے بغیر مسلمان، مسلمان نہیں اور نہ اس کی کوئی اجتماعی وحدت ہے، نہ انقیاد امامت ہے، نہ زندگی ہے اور نہ زندگی کا نصب العین ہے، اسی بنا پر داعی اسلام علیہ السلام نے یہ فرمادیا:

((العهد الذی بيننا وبينهم الصلوٰة فمن تركها فقد كفر)) [1]

''ہمارے اور ان کے درمیان جو معاہدہ ہے، وہ نماز ہے، تو جس نے اس کو چھوڑا، اس نے کفر کا کام کیا۔''

کہ نماز کو چھوڑ کر مسلمان صرف قالب بے جان، شراب بے نشہ اور گل بے رنگ وبو ہو کر رہ جاتا ہے اور رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کا ایک ایک شعار اور ایک ایک امتیازی خصوصیت اس سے رخصت ہو جاتی ہے اسی لیے نماز اسلام کا اولین شعار ہے اور اسی کی زندگی سے اسلام کی زندگی ہے۔

---

[1] ترمذی، ابواب الایمان، باب ما جاء فی ترك الصلوة: ۲۶۲۱؛ نسائی، کتاب الصلوة، باب الحکم فی تارك الصلوة: ٤٦٤؛ ابن ماجه، ابواب اقامة الصلوة، باب ما جاء فی من ترك الصلوة: ۱۰۷۹؛ مسند احمد، ج ٥، ص: ۳٤٦۔

عرب کی روحانی کایا پلٹ

وہ عرب جو خدا کی عبادت سے بیگانہ تھا، وہ جس کی پیشانی خدا کے سامنے کبھی جھکی نہ تھی، وہ جس کا دل خدا کی پرستش سے لذت آشنا نہ تھا، وہ جس کی زبان خدا کی تسبیح وتحمید کے ذائقہ سے واقف نہ تھی، وہ جس کی آنکھوں نے شب بیداری کا اضطراب انگیز منظر نہیں دیکھا تھا، وہ جس کی روح ربانی تسکین وتسلی کے احساس سے خالی تھی۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم سے دفعتاً کیا ہو گیا؟ اب عبادت الٰہی اسکے ہر کام کا مقصد بن گئی۔ اب اس کو اپنے ہر کام میں اخلاص کے سوا اور کوئی چیز مطلوب نہ تھی۔ اس کی پیشانی خدا کے سامنے جھک کر پھر اٹھنا نہیں چاہتی تھی، اس کے دل کو اس لذت کے سوا دنیا کی کوئی لذت پسند نہیں آتی تھی، اس کی زبان کو اس مزہ کے سوا اور کوئی مزہ اچھا نہ معلوم ہوتا تھا۔ اس کی آنکھیں اس منظر کے سوا اور کسی منظر کی طالب نہ تھیں اس کی روح یاد الٰہی کی تڑپ اور ذکر الٰہی کی بے قراری کے سوا کسی اور چیز سے تسلی نہ پاتی تھی۔

وہ عرب جن کی حالت یہ تھی کہ

﴿ وَلَا يَذْكُرُونَ اللَّهَ إِلَّا قَلِيلًا ﴾ (٤/ النسآء: ١٤٢)

''اور جو خدا کو بہت کم یاد کرتے ہیں۔''

دعوتِ حق اور فیض نبوت کے اثر وبرکت نے انکی یہ شان نمایاں کی کہ دنیا کی کاروباری مشغولیتیں بھی ان کو ذکر الٰہی سے غافل نہ کر سکیں:

﴿ رِجَالٌ لَّا تُلْهِيهِمْ تِجَارَةٌ وَلَا بَيْعٌ عَن ذِكْرِ اللَّهِ ﴾ (٢٤/ النور: ٣٧)

''ایسے لوگ جن کو کاروبار اور خرید وفروخت کا شغل خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتا۔''

اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، غرض ہر حال میں ان کے اندر خدا کی یاد کے لیے بے قراری تھی:

﴿ الَّذِينَ يَذْكُرُونَ اللَّهَ قِيَامًا وَقُعُودًا وَعَلَىٰ جُنُوبِهِمْ ﴾ (٣/ آل عمران: ١٩١)

''جو خدا کو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے یاد کرتے ہیں۔''

راتوں کو جب غافل دنیا نیند کے خمار میں ہوتی، وہ بستروں سے اٹھ کر خدا کے سامنے سربسجود اور راز ونیاز میں مصروف ہوتے تھے:

﴿ تَتَجَافَىٰ جُنُوبُهُمْ عَنِ الْمَضَاجِعِ يَدْعُونَ رَبَّهُمْ خَوْفًا وَطَمَعًا ﴾ (٣٢/ السجدہ: ١٦)

''جن کے پہلو (رات کو) خواب گاہوں سے علیحدہ رہتے ہیں، وہ خوف اور امید کے ساتھ اپنے پروردگار کو پکارتے ہیں۔''

وہ جن کا یہ حال تھا کہ

﴿ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ ارْكَعُوا لَا يَرْكَعُونَ ﴾ (٧٧/ المرسلات: ٤٨)

''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کے آگے جھکو تو نہیں جھکتے۔''

اب ان کی یہ صورت ہوگئی کہ

﴿ تَرٰىهُمْ رُكَّعًا سُجَّدًا يَّبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانًا ﴾ (٤٨/ الفتح:٢٩)

''تم ان کو دیکھو گے کہ رکوع میں جھکے ہوئے اور سجدہ میں پڑے ہوئے خدا کے فضل اور خوشنودی کو تلاش کرتے ہیں۔''

وہ جن کے دلوں کی یہ کیفیت تھی کہ

﴿ وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ ﴾ (٣٩/ الزمر:٤٥)

''اور جب تنہا خدا کا نام لیا جاتا ہے تو ان کے دل جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، مکدر ہو جاتے ہیں۔''

آفتابِ نبوت کے پرتو نے ان مکدر آئینوں میں خشیت الٰہی کا جوہر پیدا کر دیا:

﴿ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ ﴾ (٨/ الانفال:٢ و ٢٢/ الحج:٣٥)

''وہ لوگ کہ جب خدا کا نام لیا جائے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں۔''

یہ خود قرآن پاک کی شہادتیں ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ کے عمل اور تعلیم نے عرب کی روحانی کائنات میں کتنا عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ وہ تمام لوگ جو حلقہ بگوش اسلام ہو چکے تھے خواہ وہ کھیتی کرتے ہوں یا تجارت یا محنت مزدوری، مگر ان میں سے کوئی چیز ان کو خدا کی یاد سے غافل نہیں کرتی تھی، قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ لوگ (صحابہ) خرید و فروخت اور تجارت کرتے تھے۔ لیکن جب خدا کا کوئی معاملہ پیش آتا تھا تو یہ شغل و عمل ان کو یادِ الٰہی سے غافل نہیں کرتا تھا، بلکہ وہ اس کو پوری طرح ادا کرتے تھے۔ [1] حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ایک دفعہ وہ بازار میں تھے، نماز کی تکبیر ہوئی دیکھا کہ صحابہ رضی اللہ عنہم نے فوراً دکانیں بند کر دیں اور مسجد میں داخل ہوگئے۔ [2] صحابہ رضی اللہ عنہم تمام تر راتیں خدا کی یاد میں جاگ جاگ کر بسر کرتے تھے یہاں تک کہ مکہ معظمہ کی غیر مطمئن راتوں میں بھی وہ عبادت الٰہی میں مصروف رہتے تھے۔ خدا نے گواہی دی:

﴿ اِنَّ رَبَّكَ يَعْلَمُ اَنَّكَ تَقُوْمُ اَدْنٰى مِنْ ثُلُثَيِ الَّيْلِ وَنِصْفَهٗ وَثُلُثَهٗ وَطَآئِفَةٌ مِّنَ الَّذِيْنَ مَعَكَ ﴾ (٢٠/ المزمل:٢٠)

''بے شک تیرا رب جانتا ہے کہ تو دو تہائی رات کے قریب اور آدھی رات اور تہائی رات کے بعد اٹھتا ہے اور تیرے ساتھ ایک جماعت بھی اٹھ کر نماز پڑھتی ہے۔''

---

[1] صحیح بخاری، کتاب البیوع، باب التجارۃ فی البز وغیرہ، رقم الباب: ٨ مرسلاً۔

[2] فتح الباری، ج ٤، ص: ٢٥٣ بحوالہ عبدالرزاق۔

اس زمانہ میں صحابہ کو راتوں کے سوا خدا کے یاد کرنے کا موقع کہاں ملتا تھا، جلوۂ دیدار کے مشاق دن بھر کے انتظار کے بعد رات کو کہیں کسی مخفی گوشہ میں جمع ہوتے تھے۔ ذوق وشوق سے اپنی پیشانی خدا کے سامنے زمین پر رکھ دیتے تھے۔ دیر تک سجدہ میں پڑے رہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ ان کے اس والہانہ انداز عبادت کو دیکھتے پھرتے تھے۔ قرآن پاک نے اس نظارہ کی کیفیت اپنے الفاظ میں اس طرح ادا کی ہے:

﴿ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۙ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۙ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ﴾

(۲۶/ الشعرآء:۲۱۷-۲۱۹)

''اور اس غالب رحم والے پر بھروسہ کر جو رات کو جب تو نماز کے لیے اٹھتا ہے اور سجدہ میں پڑے رہنے والوں کے درمیان آنا جانا تیرا دیکھتا ہے۔''

مدینہ منورہ میں آکر سب سے پہلا فقرہ جو آپ کی زبان مبارک سے نکلا وہ یہ تھا:

((يَآ أَيُّهَا النَّاسُ أَطْعِمُوا الطَّعَامَ وَأَفْشُوا السَّلَامَ وَصَلُّوا بِاللَّيْلِ وَالنَّاسُ نِيَامٌ)) [1]

''اے لوگو! غریبوں کو کھانا کھلاؤ اور سلام کو پھیلاؤ اور نماز پڑھو جب لوگ سوتے ہوں۔''

بعض صحابہ نے اس حکم پر اس شدت سے عمل کیا کہ انہوں نے راتوں کا سونا چھوڑ دیا۔ آخر آنحضرت ﷺ کو ان لوگوں کو اعتدال اور میانہ روی کا حکم دینا پڑا۔ چنانچہ حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ رات بھر نماز میں مصروف رہتے تھے۔ آنحضرت ﷺ نے ان سے فرمایا کہ ''عثمان تمہارے جسم کا بھی تم پر حق ہے نماز بھی پڑھو اور سوؤ بھی۔'' [2] حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ صحابہ راتوں کو اٹھ اٹھ کر نماز پڑھتے تھے اور بہت کم سوتے تھے۔ [3] حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ نے رات کے تین حصے کر دیے تھے ایک میں خود نماز پڑھتے تھے دوسرے میں ان کی بیوی اور تیسرے میں ان کا غلام اور باری باری سے ایک دوسرے کو جگاتا تھا۔ [4] حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ ساری رات نماز پڑھا کرتے تھے۔ آنحضرت ﷺ کو معلوم ہوا تو ان کو جا کر نصیحت فرمائی۔ [5] حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ صحابی کا بھی یہی حال تھا کہ وہ رات رات بھر نماز میں گزار دیتے تھے۔ حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ ان کے اسلامی بھائی تھے، ایک شب وہ ان کے ہاں جا کر مہمان ہوئے جب رات کو حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ عبادت کے لیے اٹھنے لگے تو حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے منع کیا۔ پچھلے پہر جب سناٹا چھایا ہوا تھا حضرت سلمان رضی اللہ عنہ نے ان کو جگایا کہ اب نماز کا وقت ہے۔ [6] کوئی صحابی ایسا نہ تھا جس نے اسلام لانے کے بعد پھر ایک وقت کی بھی نماز عمداً قضا کی ہو یہاں تک کہ لڑائی اور خطرہ کی حالت میں بھی وہ اس فرض سے

---

[1] ترمذی، ابواب صفة القيامة:٢٤٨٥۔ الفاظ قدرے مختلف ہیں۔ [2] ابو داود، کتاب التطوع، باب ما یؤمر به من القصد فی الصلوة:١٣٦٩۔ [3] ابوداود، کتاب التطوع، باب نسخ قیام اللیل والتيسير فيه: ١٣٠٥۔
[4] صحیح بخاری، کتاب الاطعمة، باب: ٥٤٤١۔ [5] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب حق الجسم فی الصوم:١٩٧٥۔ [6] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب من اقسم علی اخيه ليفطر فی التطوع: ١٩٦٨۔

غافل نہیں رہتے تھے۔ایک صحابی کو آنحضرت ﷺ نے ایک پر خطر کام کے لیے کہیں بھیجا تھا۔جب وہ منزل مقصود کے قریب پہنچے تو عصر کا وقت ہو چکا تھا۔ان کو خوف تھا کہ اگر کہیں ٹھہر کر عصر پڑھنے کا اہتمام کیا جائے گا تو وقت نکل جائے گا اور اگر عصر میں تاخیر کی جائے تو حکم الٰہی کی تعمیل میں دیر ہو جائے گی اس مشکل کا حل انہوں نے اس طرح کیا کہ وہ اشاروں میں نماز پڑھتے جاتے اور چلتے جاتے تھے۔ [1] سخت سے سخت مجبوری کی حالت میں بھی نماز ان سے ترک نہیں ہوتی تھی۔ چنانچہ بیماری کی حالت میں وہ دوسروں کا سہارا لے کر مسجد میں حاضر ہوتے تھے۔ [2] پھر وہ جس خضوع وخشوع،محویت اور استغراق کے ساتھ نماز ادا کرتے تھے اس کا نظارہ بڑا پراثر ہوتا تھا۔ چنانچہ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ جب نماز پڑھنے کھڑے ہوتے تو ان پر اس شدت سے رقت طاری ہوتی کہ کافر عورتوں اور بچوں تک پر بھی اس کا اثر ہوتا تھا۔ [3] حضرت عمر رضی اللہ عنہ نماز میں اس زور سے روتے تھے کہ ان کے رونے کی آواز پچھلی صف تک جاتی تھی۔ [4] حضرت تمیم داری رضی اللہ عنہ ایک رات تہجد کے لیے کھڑے ہوئے تو صرف ایک آیت کی تلاوت میں صبح کر دی بار بار اس کو دہراتے تھے اور مزے لیتے تھے۔ [5]

؎ شب شود صبح و ہماں محو تماشا باشم

حضرت انس رضی اللہ عنہ قیام اور سجدہ میں اتنی دیر لگاتے تھے کہ لوگ سمجھتے کہ کچھ بھول گئے ہیں۔ [6] حضرت عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما جب نماز میں کھڑے ہوتے تھے تو کئی کئی سورتیں پڑھ ڈالتے تھے اور اس طرح کھڑے ہوتے تھے کہ معلوم ہوتا تھا کہ کوئی ستون کھڑا ہے اور جب سجدہ میں جاتے تو اتنی دیر تک سجدہ کرتے تھے کہ حرم محترم کے کبوتر ایک سطح جامد سمجھ کر ان کی پیٹھ پر آ کر بیٹھ جاتے تھے۔ [7] ایک رات میدان جنگ میں ایک پہاڑی پر دو صحابی پہرہ دینے کے لیے متعین ہوتے ہیں۔ایک صاحب سو جاتے ہیں اور دوسرے نماز کے لیے کھڑے ہو جاتے ہیں۔دشمن ان کو تاک کر تیر مارتا ہے جو بدن میں ترازو ہو جاتا ہے کپڑے خون سے تر بتر ہو جاتے ہیں مگر نماز کا استغراق اسی طرح قائم رہتا ہے۔نماز تمام کر کے اپنے رفیق کو بیدار کرتے اور واقعہ سناتے ہیں۔ساتھی کہتے ہیں کہ تم نے اس وقت مجھے کیوں نہ جگایا جواب ملتا ہے میں نے ایک پیاری سورہ شروع کی تھی پسند نہ آیا کہ اس کو ختم کیے بغیر نماز توڑ دوں۔ [8] اس سے بھی زیادہ پُر اثر منظر یہ ہے کہ دشمنوں کی فوجیں مقابل کھڑی ہیں تیروں کا مینہ برس رہا ہے نیزوں اور تلواروں کی بجلیاں ہر طرف کوند رہی ہیں سر و گردن، دست و بازو کٹ کٹ کر گر رہے ہیں کہ دفعتاً نماز کا وقت آ جاتا ہے فوراً جنگ کی صفیں نماز کی صفیں بن جاتی ہیں

---

[1] ابو داود، کتاب صلاۃ السفر، باب صلوۃ الطالب: ۱۲۴۹۔ [2] نسائی، کتاب الامامۃ، باب المحافظۃ علی الصلوات حیث ینادی بھن: ۸۵۰۔ [3] صحیح بخاری، کتاب الصلوۃ، باب المسجد یکون فی الطریق من غیر ضرر الناس: ۴۷۶، باب ھجرۃ النبی ﷺ: ۳۹۰۵۔ [4] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب اذا بکی الامام فی الصلوۃ، رقم الباب: ۷۰۔ [5] اسد الغابۃ تذکرۃ تمیم داری، ج ۱، ص: ۲۱۵۔ [6] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب المکث بین السجدتین: ۸۲۱۔ [7] حالات عبداللہ بن زبیر اصابۃ، ج ۴، ص: ۷۰ واسد الغابۃ: ج ۳، ص: ۱۶۲ وغیرہ۔ [8] ابو داود، کتاب الطہارۃ، باب الوضوء من الدم: ۱۹۸۔

اور ایک اللہ اکبر کی آواز کے ساتھ موت وحیات سے بے پرواہو کر گردنیں جھکنے اور اٹھنے لگتی ہیں۔ نور کا تڑکا ہے اسلام کے دائرہ کا مرکز فاروق اعظم رضی اللہ عنہ امام نماز ہے۔ پیچھے صحابہ کی صفیں قائم ہیں۔ دفعتاً ایک شقی خنجر بکف آگے بڑھتا ہے اور خلیفہ پر حملہ آور ہو کر شکم مبارک کو چاک چاک کر دیتا ہے۔ آپ غش کھا کر گر پڑتے ہیں خون کا فوارہ جاری ہو جاتا ہے یہ سب کچھ ہو رہا ہے مگر نماز کی صفیں اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ نماز پڑھانے کو آگے بڑھتے ہیں پہلے صبح کا دوگانہ ادا ہو لیتا ہے تب خلیفہ، وقت کو اٹھایا جاتا ہے۔ [1]

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو جس صبح کی نماز میں زخم لگا اس کے بعد کی صبح کو لوگوں نے ان کو نماز کے لیے جگایا تو بولے، ہاں جو شخص نماز چھوڑ دے اسلام میں اس کا کوئی حصہ نہیں۔ چنانچہ اسی حالت میں کہ زخم سے خون جاری تھا، آپ نے نماز پڑھی۔ [2]

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ صبح کی نماز کے لیے مسجد میں داخل ہوتے ہیں یا صبح کی نماز میں ہوتے ہیں [3] کہ ابن ملجم کی تلوار ان کو گھائل کر دیتی ہے اور کچھ دیر کے بعد وہ داعی اجل کو لبیک کہتے ہیں۔ امام مظلوم حسین بن علی رضی اللہ عنہما کربلا کے میدان میں رونق افروز ہوتے ہیں۔ عزیزوں اور دوستوں کی لاشیں میدانِ جنگ میں نظر کے سامنے پڑی ہوتی ہیں، ہزاروں اشقیاء آپ کو نرغہ میں لیے ہوتے ہیں، اتنے میں ظہر کا وقت آ جاتا ہے، آپ دشمنوں سے اجازت چاہتے ہیں کہ وہ اتنا موقع دیں کہ آپ ظہر کی نماز ادا کر سکیں۔ [4] نماز میں جس خضوع اور خشوع کا حکم ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس کے یہ نمونے پیش کیے کہ عزیز سے عزیز چیز بھی اگر ان کے اس روحانی ذوق وشوق میں خلل انداز ہوئی تو انہوں نے اس کو اس ذوق پر نثار کر دیا۔ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، ایک خوشنما چڑیا نے سامنے آ کر چہچہانا شروع کیا۔ حضرت ابوطلحہ رضی اللہ عنہ دیر تک ادھر ادھر دیکھتے رہے، پھر جب نماز کا خیال آیا تو رکعت یاد نہ رہی دل میں کہا اس باغ نے یہ فتنہ برپا کیا یہ کہہ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں آئے اور واقعہ بیان کیا اور کہا کہ یارسول اللہ ﷺ! یہ باغ راہ خدا میں نذر ہے۔ [5] اسی طرح ایک اور صحابی اپنے باغ میں نماز میں مشغول تھے۔ باغ اس وقت نہایت سرسبز وشاداب اور پھلوں سے لدا ہوا تھا پھلوں کی طرف نظر اٹھ گئی تو نماز یاد نہ رہی، جب اس کا خیال آیا تو دل میں نادم ہوئے کہ دنیا کے مال ودولت نے اپنی طرف متوجہ کر لیا، یہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور تھا، ان کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کی کہ یہ باغ جس نے مجھے فتنہ میں مبتلا کر دیا راہ خدا میں دیتا ہوں، چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اس کو بیت المال کی طرف سے بیچا تو ۵۰ ہزار میں فروخت ہوا۔ [6]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب فضائل اصحاب النبی ﷺ، باب قصة اهل البیعة والاتفاق علی عثمان بن عفان، ۳۷۰۰۔

[2] مؤطا امام مالک، کتاب الطهارة، باب العمل فیمن غلب علیه الدم: ۸۴۔ [3] الریاض النضرة فی مناقب العشرة للمحب الطبری، ج ۲، ص: ۲۴۶ مصر۔ [4] تاریخ طبری کبیر، ج ۷، ص: ۳۴۷ واقعات ۶۱ ھ۔

[5] مؤطا امام مالک، کتاب الصلوة، باب النظر فی الصلاة الی مایشغلك عنها: ۲۲۲۔

[6] مؤطا امام مالک، ایضًا: ۲۲۳۔

زکوٰۃ

﴿وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۲/ البقرۃ: ٤٣)

زکوٰۃ کی حقیقت اور مفہوم

نماز کے بعد جس کا اصل تعلق خالق ومخلوق کے باہمی سلسلہ اور رابطہ سے ہے اور جس کا ایک بڑا فائدہ نظام جماعت کا قیام ہے، اسلامی عبادات کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے، جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے اور جس کا اہم فائدہ نظام جماعت کے قیام کے لئے مالی سرمایہ بہم پہنچانا ہے۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے، جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر بھی ہوتا ہے۔ لیکن فقہی اصطلاح میں ''زکوٰۃ'' صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مخصوص مقدار کا مالک ہو۔

زکوٰۃ گزشتہ مذاہب میں

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے، لیکن ان کے پیروؤں نے اس فرض کو اس حد تک بھلا دیا تھا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام کی فہرست میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ حالانکہ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز ہر مذہب کا جزو لاینفک تھی، اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے۔ بنی اسرائیل سے خدا کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں:

﴿وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (۲/ البقرۃ: ٤٣)

''(ہم نے بنی اسرائیل سے اقرار لیا تھا) کہ کھڑی رکھو نماز اور دیتے رہو زکوٰۃ۔''

﴿لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ الزَّكٰوةَ﴾ (٥/ المآئدۃ: ١٢)

''(اے بنی اسرائیل) اگر تم کھڑی رکھتے نماز اور دیتے رہتے زکوٰۃ۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذکر میں ہے:

﴿وَاذْكُرْ فِي الْكِتٰبِ اِسْمٰعِيْلَ ۡ اِنَّهٗ كَانَ صَادِقَ الْوَعْدِ وَكَانَ رَسُوْلًا نَّبِيًّا ۚ وَكَانَ يَاْمُرُ اَهْلَهٗ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ ۠ وَكَانَ عِنْدَ رَبِّهٖ مَرْضِيًّا﴾ (۱۹/ مریم: ٥٤-٥٥)

''اور قرآن میں اسماعیل کا ذکر کر، بے شک وہ عہد کا سچا تھا اور وہ خدا کا بھیجا ہوا پیغمبر تھا اور وہ اپنے لوگوں کو نماز اور زکوٰۃ کی تاکید کرتا تھا اور وہ اپنے رب کے نزدیک پسندیدہ تھا۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿وَاَوْصٰنِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَا دُمْتُ حَيًّا﴾ (۱۹/ مریم: ۳۱)

”اور خدا نے مجھ کو زندگی بھر نماز پڑھنے اور زکوٰۃ دینے کی تاکید کی ہے۔“

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل پر زمین کی پیداوار اور جانوروں میں ایک عشر یعنی دسواں حصہ (احبار ۲۷۔۳۰۔۳۲) نیز ہر بیس برس یا اس سے زیادہ عمر والے پر خواہ امیر ہو یا غریب آدھا مثقال دینا واجب تھا۔ (خروج ۳۰۔۱۳۔۱۵) ساتھ ہی غلہ کاٹتے وقت گرا پڑا اناج، کھلیان کی منتشر بالیں اور پھل والے درختوں میں کچھ پھل چھوڑ دیتے تھے جو مال کی زکوٰۃ تھی اور یہ عملاً ہر تیسرے سال واجب الادا ہوتی تھی۔ یہ رقم بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کی جاتی تھی، اس کا ساٹھواں حصہ مذہبی عہدہ دار پاتے تھے، دسواں حصہ حضرت ہارون کی اولاد (لاوبین) قومی خاندانی کاہن ہونے کی حیثیت سے لیتی تھی اور ہر تیسرے سال میں دسواں حصہ بیت المقدس کے حاجیوں کی مہمانی کے لئے رکھا جاتا تھا۔ ❶ اسی مد سے عام مسافروں، غریبوں، بیواؤں اور یتیموں کو روزانہ کھانا پکا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ ❷ اور نقد آدھے مثقال والی زکوٰۃ کی رقم جماعت کے خیمہ (یا مسجد بیت المقدس) اور قربانی کے ظروف و آلات کی خریداری کے خرچ کے لئے رہتی تھی۔ ❸

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے شریعت موسوی کے ان ظاہری قواعد میں کوئی ترمیم نہیں کی، بلکہ ان کی روحانی کیفیت پر زیادہ زور دیا۔ انجیل لوقا ((۱۸۔۱۰) میں ہے کہ جو اپنا عشر (زکوٰۃ) ریا، نمائش اور فخر کے لئے دیتا ہے، اس سے وہ شخص بہتر ہے جو اپنے قصور پر نادم ہے۔ اسی انجیل کے ۲۱ ویں باب کی پہلی آیت میں ہے:

”اگر کوئی دولت مند ہیکل کے خزانہ میں اپنی زکوٰۃ کی بڑی رقم ڈالے اور اس کے مقابلہ میں کوئی غریب بیوہ خلوص دل سے دو دمڑی ڈالے تو اس کی زکوٰۃ کا رتبہ اس دولتمند کی زکوٰۃ سے کہیں بڑھ کر ہے۔“

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے لوگوں کو ترغیب دی کہ جس کے پاس جو کچھ ہو وہ خدا کی راہ میں لٹا دے:

”کہ اونٹ کا سوئی کے ناکے سے گزر جانا آسان ہے، مگر دولت مند کا خدا کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے۔“ (متی ۱۹۔۲۴)

ساتھ ہی انہوں نے خود اپنی طرف سے نیز اپنے رفیق کی طرف سے اپنی ناداری کے باوجود آدھے مثقال والی زکوٰۃ ادا کی ہے۔ (متی ۱۷۔۲۴)

توراۃ کے زمانہ میں چونکہ دولت زیادہ تر صرف زمین کی پیداوار اور جانوروں کے گلوں تک محدود تھی اس لئے انہیں دونوں چیزوں کی زکوٰۃ کا زیادہ ذکر آیا ہے۔ سونا چاندی اور ان کے سکوں کی چونکہ قلت تھی، اس لئے ان کی زکوٰۃ کا ذکر ایک دو جگہ ہے۔ اسی بنا پر یہودیوں نے نقد زکوٰۃ کی اہمیت محسوس نہیں کی علاوہ بریں زکوٰۃ کی مدت کی تعیین کہ وہ ہر سال یا دوسرے یا تیسرے سال واجب الادا ہے۔ تصریحاً معلوم نہیں ہوتی، نیز

---

❶ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع یازدہم مضمون ”خیرات“ (CHARITY) باب ”یہودیوں میں خیرات“۔

❷ توراة خروج ٣٠ ـ ١٦ العهد القديم، ص: ١٣٧ و ٣٨ ـ ٢٦، ص: ١٥٣۔

❸ توراة خروج، ٣٠ ـ ١٦ العهد القديم، ص: ١٣٧ و ٣٣٨ ـ ٢٦، ص: ١٥٣۔

یہ کہ اس زکوٰۃ کا مصرف کیا ہے یعنی وہ کہاں خرچ کی جائے، اس کی تفصیل بھی خود توراۃ کی زبان سے کم سنائی دیتی ہے۔

غرض وجوہ جو کچھ ہوں، مگر حالت یہ تھی کہ یہود نے اس فرض کو بھلا دیا تھا اور خصوصاً عرب میں جہاں کی دولت کے وہ تنہا مالک بن بیٹھے تھے، چند کے سوا اکثر کو اس فرض کا دھیان بھی نہ تھا، قرآن نے ان کو یاد دلایا کہ

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ۭ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ وَاَنْتُمْ مُّعْرِضُوْنَ ۝﴾

(۲/ البقرۃ:۸۳)

”(اور تم بنی اسرائیل سے معاہدہ تھا کہ) نماز کھڑی رکھنا اور زکوٰۃ دیتے رہنا، پھر تم پھر گئے مگر تم میں سے تھوڑے اور تم دھیان نہیں دیتے۔“

عیسوی مذہب میں گو سب کچھ دینے کا حکم تھا، مگر یہ حکم ہر ایک کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا اور نہ ہر شخص اس پر عمل کر سکتا تھا، دوسرے مذہبوں میں بھی اگرچہ خیرات اور دان کرنے کے احکام موجود تھے، تاہم ان کے لئے کوئی نظام اور اصول مقرر نہیں کیا گیا تھا اور نہ ہر شخص پر قانوناً کوئی رقم واجب الادا تھی جس کے ادا کرنے پر وہ مجبور ہو سکتا تھا۔

اسلام کی اس راہ میں تکمیل

محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے اس بارے میں بھی اپنا تکمیلی کارنامہ انجام دیا۔ اس نے نہایت خوبی اور دقتِ نظر کے ساتھ زکوٰۃ کا پورا نظام تیار کیا۔ انسان کے مالی کاروبار کا معیار عموماً سالانہ آمدنی سے قائم ہوتا ہے۔ اس لئے اسلام نے زکوٰۃ کی مدت سال بھر کے بعد مقرر کی اور ہر سال اس کا ادا کرنا ضروری قرار دیا۔ ساتھ ہی اس نے دولت کے تین سرچشمے قرار دیئے سونا چاندی اور جانور اور پیداوار اور ان میں سے ہر ایک کی علیحدہ علیحدہ شرحیں مقرر کیں۔ سونے چاندی میں سے چالیسواں حصہ اور پیداوار میں دسواں حصہ متعین کیا۔ جانوروں کی مختلف قسموں میں ان کی مختلف تعداد پر ان کی قدر و قیمت کی کمی بیشی کے لحاظ سے مختلف شرحیں قرار دیں۔ پھر اس زکوٰۃ سے ہر قسم کے مصارف کی تعیین و تحدید کی اور اس کی تحصیل وصول اور جمع و خرچ کا کام بیت المال سے متعلق کیا۔

یہ تو اجمال تھا اب تفصیلی حیثیت سے ان میں سے ہر ایک پہلو پر شریعت محمدی ﷺ کی تکمیلی حیثیت کو نمایاں کرنا ہے۔

اسلام میں زکوٰۃ کی اہمیت

اسلام کی تعلیم اور محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفۂ وحی میں نماز کے ساتھ ساتھ جو فریضہ سب سے اہم نظر آتا ہے، وہ زکوٰۃ ہے، نماز حقوق الٰہی میں سے ہے اور زکوٰۃ حقوق عباد میں سے، ان دونوں فریضوں کا باہم

لازم وملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ کے ساتھ حقوق عباد کا بھی یکساں لحاظ رکھا گیا ہے۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں نماز کا ذکر ہے، اس سے متصل ہی ہمیشہ زکوٰۃ کا بھی بیان ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں بیس مقامات پر اقام الصلوۃ کے بعد ایتاء الزکوٰۃ آیا ہے۔ مثلاً:

﴿اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ﴾ (یا) ﴿اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ﴾

اور زکوٰۃ ادا کرنے کی مدح یا اس کے دینے اور نہ دینے والوں کا تذکرہ اس کے علاوہ ہے، اس سے معلوم ہوگا کہ اسلام میں زکوٰۃ کی کیا اہمیت ہے۔ بارگاہ نبوی میں آ کر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کئے ہیں تو ہمیشہ آپ نے نماز کے بعد زکوٰۃ کو پہلا درجہ دیا ہے۔ صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں جن میں یہ ترتیب ملحوظ رہی ہے، بلکہ کبھی کبھی وہ اسلام کے شرائط بیعت میں داخل کی گئی ہے۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ بجلی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز پڑھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا۔ [1] وفد عبدالقیس نے ۵ ھ میں نبوت کے آستانہ پر حاضر ہو کر جب اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو آپ ﷺ نے اعمال میں پہلے نماز پھر زکوٰۃ کو جگہ دی۔ [2]

۹ ھ میں جب آنحضرت ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو اسلام کا داعی بنا کر یمن بھیجا ہے تو اسلام کے مذہبی فرائض کی یہ ترتیب بتائی کہ پہلے ان کو توحید کی دعوت دینا، جب وہ یہ جان لیں تو ان کو بتانا کہ دن میں پانچ وقت کی نماز ان پر فرض ہے جب وہ نماز پڑھ لیں تو انہیں بتانا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے مال پر زکوٰۃ فرض کی ہے، جو ان کے دولت مندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو دی جائے گی۔ [3]

صحابہ رضی اللہ عنہم میں جو لوگ شریعت کے راز دان تھے وہ اس نکتہ سے اچھی طرح واقف تھے، چنانچہ آنحضرت ﷺ کی وفات کے بعد جب اہل عرب نے بغاوت کی اور زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ان کے خلاف تلوار کھینچ لی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا کہ جو توحید کا قائل ہو اس کا خون روا نہیں، اس کا معاملہ خدا کے ساتھ ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جواب دیا خدا کی قسم! جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرے گا، میں اس سے لڑوں گا کہ زکوٰۃ مال کا حق ہے، خدا کی قسم! جو رسول اللہ کے زمانہ میں بھیڑ کا ایک بچہ بھی دیتا تھا وہ اس کو دینا پڑے گا [4] حقیقت میں یہ ایک لطیف نکتہ تھا جس کو صرف شریعت کا محرم اسرار سمجھ سکتا تھا۔ [5] اس نے سمجھا اور امت کو سمجھایا اور سب نے اس کے سامنے اطاعت کی گردن جھکا دی۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب البیعة علی ایتاء الزکوٰۃ: ۱۴۰۱۔ [2] ایضاً، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۳۹۵۔ [3] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی دعاء النبی ﷺ امته الی توحید اللہ: ۷۳۷۲۔

[4] صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۳۹۹، ۱۴۰۰۔ [5] درحقیقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کا ماخذ قرآن پاک کی یہ آیت تھی: ﴿فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ...... فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ﴾ (۹/التوبہ۔۵) ''ان مشرکوں کو مارو جہاں پاؤ...... تو اگر وہ توبہ کریں اور نماز کھڑی کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان کو آزادی دے دو۔'' نیز دیکھو صحیح بخاری، کتاب الاعتصام، باب قول اللہ امرھم شوریٰ بینھم ترجمة الباب: ۲۸۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے۔ جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظام روحانی نماز با جماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو، قائم ہوتا ہے اور نظام مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو، مرتب ہوتا ہے، اسی لئے یہ دونوں چیزیں اسلام میں ساتھ ساتھ نظر آتی ہیں اور ان کی انفرادی حیثیت کے ساتھ ان کی اجتماعی حیثیت پر بھی شریعت محمدی ﷺ نے خاص زور دیا ہے۔ نماز جس طرح جماعت اور مسجد کے بغیر بھی انجام پا جاتی ہے۔ لیکن اپنی فرضیت کے بعض مقاصد سے دور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح زکوٰۃ بیت المال کی مجتمع صورت کے علاوہ بھی ادا ہو جاتی ہے۔ مگر اس کی فرضیت کے بعض اہم مقاصد فوت ہو جاتے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد خلافت میں جب بعض قبیلوں نے یہ کہا کہ وہ زکوٰۃ بیت المال میں داخل نہ کریں گے، بلکہ بطور خود اس کو صرف کر دیں گے تو شریعت محمدی ﷺ کے شناسائے راز نے ان کی اس تجویز کو قبول نہیں کیا اور بزور ان کو بیت المال میں زکوٰۃ داخل کرنے پر مجبور کیا کہ اگر ان کی یہ بات تسلیم کر لی جاتی تو اسلام کی وحدت کا سررشتہ اسی وقت پارہ پارہ اور مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام اسی وقت درہم برہم ہو جاتا۔ الغرض زکوٰۃ یا دوسرے الفاظ میں غریبوں کی چارہ گری، مسکینوں کی دست گیری، مسافروں کی امداد، یتیموں کی خبر گیری، بیواؤں کی نصرت، غلاموں اور قیدیوں کی اعانت نماز کے بعد اسلام کی عبادت کا دوسرا رکن ہے اور اس فریضہ کی یہ سب سے پہلی اہمیت ہے جو مذاہب کی تاریخ میں نظر آتی ہے۔

زکوٰۃ کا آغاز اور تدریجی تکمیل

جس طرح عام نماز کا آغاز اسلام کے ساتھ ساتھ ہوا اور مدینہ آ کر وہ رفتہ رفتہ تکمیل کو پہنچی۔ اسی طرح زکوٰۃ یعنی مطلق مالی خیرات کی ترغیب بھی ابتدائے اسلام ہی سے شروع ہوئی، لیکن اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ بعض مؤرخوں اور محدثوں کو اس بنا پر کہ ۸ ھ میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح ملتی ہے، اس سے پہلے کے واقعات میں جو زکوٰۃ کا لفظ آیا ہے، اس سے پریشانی ہوئی ہے۔ حالانکہ شروع اسلام میں زکوٰۃ کا لفظ صرف خیرات کا مترادف تھا۔ اس کی مقدار، نصاب، سال اور دوسری خصوصیتیں جو زکوٰۃ کی حقیقت میں داخل ہیں، وہ بعد کو رفتہ رفتہ مناسب حالات کے پیدا ہونے کے ساتھ تکمیل کو پہنچیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کا پیغام صرف دو لفظوں سے مرکب ہے۔ خدا کا حق اور بھائیوں کا حق، پہلے لفظ کا مظہر اعظم نماز اور دوسرے کا زکوٰۃ ہے۔ اس لئے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت حق جب بلند ہوئی تو اس پکار کی ہر آواز ان ہی دو لفظوں کی تفصیل و تشریح تھی، آنحضرت ﷺ جس طرح بعثت سے پہلے غار حرا میں چھپ کر خدا کی یاد (نماز) میں مصروف رہتے تھے، اسی طرح بیکس اور لاچار انسانوں کی دستگیری (زکوٰۃ) بھی فرمایا کرتے تھے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا نے بعثت کے وقت آپ ﷺ کی نسبت فرمایا، آپ قرابتداروں کا حق پورا کرتے

ہیں، قرضداروں کا قرض ادا کرتے ہیں، غریب کو کما کر دیتے ہیں، مہمان کو کھلاتے ہیں، لوگوں کو مصیبتوں میں مدد دیتے ہیں۔ ❶ غور کرو، کیا زکوٰۃ انہیں فرائض کے مجموعہ کا نام نہیں ہے؟ اس بنا پر یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ نماز اور زکوٰۃ توام ہیں اور ان ہی دو اجمالی حقیقتوں کی تشریح کا نام اسلام ہے۔ سورۂ مدثر اگرچہ وحی کی ابتدائی سورہ ہے، لیکن اس سرزمین میں وہ تمام بیج موجود ہیں، جن سے آگے چل کر رفتہ رفتہ احکام اسلامی کا عظیم الشان تناور درخت تیار ہوا۔ اس میں نماز کی تمام تفصیلات کو صرف ایک لفظ میں ادا کیا گیا ہے:

﴿ وَرَبَّكَ فَكَبِّرْ ۝ ﴾ (۷٤/ المدثر:۳)

''اور اپنے پروردگار کی بڑائی کر۔''

پروردگار کی بڑائی نماز کی روح ہے، جو اس سورہ میں موجود ہے، اس کے بعد ہے:

﴿ وَلَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ۝ ﴾ (۷٤/ المدثر:٦)

''اور بدلہ بہت چاہنے کے لئے کسی پر احسان نہ کر۔''

یہی وہ بیج ہے جس سے مسائل زکوٰۃ کے تمام برگ و بار پیدا ہوئے ہیں۔ مدثر کے بعد سورۂ مزمل اتری اس میں بہ تصریح دونوں حکم موجود ہیں اور زکوٰۃ کی کسی قدر تفصیل بھی کی گئی ہے:

﴿ وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ۭ وَمَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ مِّنْ خَيْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ هُوَ خَيْرًا وَّاَعْظَمَ اَجْرًا ۭ ﴾ (۷۳/ المزمل:۲۰)

''اور نماز کھڑی کرو اور زکوٰۃ دو اور اللہ کو اچھا قرض دو اور جو تم آگے بھیجو گے اپنے واسطے اس کو خدا کے پاس بہتر اور ثواب میں زیادہ پاؤ گے۔''

بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفر رضی اللہ عنہ وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے ہیں اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت اور اس کی تعلیمات دریافت کی ہیں اور حضرت جعفر رضی اللہ عنہ نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے: ''اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں، روزے رکھیں اور زکوٰۃ دیں۔'' ❷ اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتدا ہی میں ہو چکا تھا اور وفد عبدالقیس کے (جو تقریباً ۵ ھ میں آیا تھا) سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی، ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی۔ ❸ ٦ ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابوسفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ وصدقہ کا ❹ بھی تذکرہ کیا ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۸ ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے بھی پہلے بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔ لیکن چونکہ محمد رسول اللہ ﷺ کا طریقہ تعلیم صرف نظریوں کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ

❶ صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی:۳۔ ❷ مسند احمد، ج۱، ص: ۲۰۲۔ ❸ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب وجوب الزکوٰۃ: ۱۳۹۸۔ ❹ صحیح بخاری، کتاب التفسیر: ٤۵۵۳۔

امت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کار بند بنانا تھا۔ اس لئے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔ مکہ معظمہ میں مسلمانوں کی پریشانی، پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی، اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لئے بہت تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلا دیں، چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کے خیرات کی تعلیم دی گئی:

﴿ وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الْعَقَبَةُ ۝ فَكُّ رَقَبَةٍ ۝ اَوْ اِطْعٰمٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ ۝ یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ ۝ اَوْ مِسْكِیْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ ۝ ﴾ (۹۰/ البلد:۱۲۔۱۶)

''اور تو کیا سمجھا کہ وہ گھاٹی کیا ہے، کسی (قرض دار یا قیدی یا غلام) کی گردن چھڑانا یا بھوک کے دن میں ناتے کے کسی بن باپ کے بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا، عام قریش پر جنہوں نے محمد رسول اللہ صَلَّى ‌اللَّهُ ‌عَلَيْهِ ‌وَسَلَّمَ کی اس انسانی ہمدردی کی پکار کو نہیں سنا، عتاب آیا۔''

﴿ فَذٰلِكَ الَّذِیْ یَدُعُّ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا یَحُضُّ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝ ﴾ (۱۰۷/ الماعون: ۲۔۳)

''وہی ہے جو بن باپ کے بچہ کو دھکا دیتا ہے اور غریب کے کھلانے پر اپنے کو آمادہ نہیں کرتا۔''

﴿ كَلَّا بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْیَتِیْمَ ۝ وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِیْنِ ۝ ﴾ (فجر: ۱)

''یہ بات نہیں بلکہ بن باپ کے بچہ کی تم عزت نہیں کرتے اور آپس میں محتاج کے کھلانے کی تاکید نہیں کرتے۔''

اور مسلمانوں کے اخلاص، باہمی ہمدردی اور ان کے جذبہ ترحم کی تعریف فرمائی کہ

﴿ وَیُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِیْنًا وَّیَتِیْمًا وَّاَسِیْرًا ۝ اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِیْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا ۝ ﴾ (۷۶/ الدھر :۸۔۹)

''اور وہ (حاجت مند ہونے کے باوجود) محتاج، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم تم کو صرف خدا کے لیے کھلاتے ہیں، تم سے نہ بدلا چاہتے ہیں، نہ شکریہ۔''

مدینہ منورہ آ کر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے کچھ اپنا کاروبار شروع کیا تو روزہ کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا [1] یعنی یہ کہ سال میں ایک دفعہ عید کے دن نماز سے پہلے ہر مسلمان سیر سوا سیر غلہ خدا کی راہ میں خیرات کرے، تاکہ غریب و محتاج بھی اپنی عید کا دن پیٹ بھر کر خوشی اور مسرت سے گزاریں۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ اور خیرات کی عام طور سے تاکید کی گئی، انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ صَلَّى ‌اللَّهُ ‌عَلَيْهِ ‌وَسَلَّمَ! ہم کیا خیرات کریں؟

﴿ وَیَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا یُنْفِقُوْنَ ۬ ﴾ (۲/ البقرۃ :۲۱۹)

---

[1] تاریخ طبری، ج۳، ص: ۱۲۸۱۔

''وہ پوچھتے ہیں کہ وہ کیا خیرات کریں۔''

ارشاد ہوا:

﴿ قُلِ الْعَفْوَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۱۹)

''کہہ دو (اے پیغمبر) کہ تمہاری ضرورت سے جو کچھ بچ رہے (اس کو خیرات کرو)۔''

یہ زکوٰۃ کی تعیین کی راہ میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کا قول نقل کیا ہے۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو یہ حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں خیرات کر دیں۔ آیندہ کے لئے کچھ بچا کر نہ رکھیں۔ [1] کہ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی، کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں، زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا:

﴿ يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنفِقُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ الْأَرْضِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲٦۷)

''اے مسلمانو! اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو ہم تمہارے لئے زمین سے پیدا کریں اس میں سے کچھ خیرات میں دو۔''

مسلمانوں نے اس کی تعمیل کی تو خدا نے ان کی تعریف کی کہ

﴿ وَمِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۳)

''اور ہم نے ان کو جو روزی دی ہے، اس میں سے وہ کچھ خرچ (خیرات) کرتے ہیں۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم کا یہ حال تھا کہ وہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا خدا کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لئے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ ہر مسلمان پر صدقہ دینا فرض ہے تو غریب و نادار صحابہ رضی اللہ عنہم نے آ کر عرض کی اے خدا کے رسول! جس کے پاس کچھ نہ ہو وہ کیا کرے؟ فرمایا: ''وہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے، خود بھی فائدہ اٹھائے اور دوسروں کو بھی صدقہ دے۔'' انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو وہ کیا کرے؟ فرمایا کہ ''وہ فریاد خواہ حاجت مند کی مدد کرے۔'' انہوں نے پھر دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو؟ ارشاد ہوا: ''تو وہ نیکی کا کام کرے اور برائی سے بچے، یہی اس کا صدقہ ہے۔'' [2] آنحضرت ﷺ کی ان پر اثر تعلیمات اور نصیحتوں کا صحابہ پر یہ اثر ہوا کہ وہ اس غرض کے لئے بازار جا کر بوجھ اٹھاتے تھے اور اس سے جو کچھ ملتا تھا، اس کو خدا کی راہ میں خرچ کرتے تھے۔ [3] لیکن

---

[1] كتاب الزكوة، باب ما ادى زكاته فليس بكنز: ۱٤۰٤، مع فتح الباري، ج۳، ص: ۲۱٦۔

[2] صحيح بخاري، كتاب الزكوة، باب على كل مسلم صدقة.....: ۱٤٤٥۔

[3] صحيح بخاري، كتاب الزكوة، باب اتقوا النار ولو بشق تمرة: ۱٤۱٥، ۱٤۱٦۔

بایں ہمہ اب تک تمام عرب اسلام کے جھنڈے کے نیچے جمع نہیں ہوا تھا اور اس لئے اس کا کوئی مرتب قومی نظام بھی قائم نہ تھا۔ رمضان ۸ ھ میں مکہ کی فتح نے تمام عرب کو ایک سر رشتہ میں منسلک کر دیا اور اب وہ وقت آیا کہ اسلام اپنا خاص نظام قائم کرے، اس وقت یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ (۹/ التوبۃ: ۱۰۳)

''(اے محمد رسول اللہ ﷺ) ان کے مال میں سے صدقہ (زکوٰۃ) وصول کرو کہ اس کے ذریعہ سے تم ان کو پاک وصاف کر سکو۔''

چنانچہ اس کے بعد نئے سال یعنی محرم ۹ ھ میں زکوٰۃ کے تمام احکام وقوانین مرتب ہوئے اس کی وصولی کے لئے تمام عرب میں محصلوں اور عاملوں کا تقرر ہوا۔ [1] اور باقاعدہ ایک بیت المال کی صورت پیدا ہوئی۔ یہ تمام احکام وقوانین سورۂ براءت میں مذکور ہیں جو ۸ ھ کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔

زکوٰۃ کی مدت کی تعیین

اسلام سے پہلے زکوٰۃ کی مدت کی تعیین میں بڑی افراط وتفریط تھی، توراۃ میں جو عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا گیا تھا، وہ تین سال میں ایک دفعہ واجب ہوتا تھا۔ (استثنا ۱۴۔ ۲۸) اور انجیل میں کسی مدت اور زمانہ کی تعیین ہی نہ تھی۔ اس بنا پر زکوٰۃ کی تنظیم کے سلسلہ میں سب سے پہلی چیز اس کی مدت کا تعین تھا کہ وہ نہ تو اس قدر قریب اور مختصر زمانہ میں واجب الادا ہو کہ انسان بار بار کے دینے سے اکتا جائے اور بجائے خوشی اور دلی رغبت کے اس کو ناگوار اور جبر معلوم ہو اور نہ اس قدر لمبی مدت ہو کہ غریبوں، مسکینوں اور قابل امداد لوگوں کو اپنی ضرورت پوری کرنے کے لئے طویل انتظار کی سخت تکلیف اٹھانی پڑے، اسلام نے اس معاملہ میں دنیا کے دوسرے مالی کاروبار کو دیکھ کر ایک سال کی مدت مقرر کی۔ کیوں کہ تمام متمدن دنیا نے خوب سوچ سمجھ کر اپنے کاروبار کے لئے ۱۲ مہینوں کا سال مقرر کیا ہے، جس کی وجہ یہ ہے کہ آمدنی کا اصلی سر چشمہ زمین کی پیداوار ہے اور اس کے بعد اس پیداوار کی خود یا اس کی بدلی ہوئی شکلوں کی صنعتی صورت کا بنانا اور ان کا بیوپار کرنا ہے آمدنی کے ان تمام ذریعوں کے لئے یہ ضروری ہے کہ سال کے مختلف موسم اور فصلیں، جاڑا، گرمی، برسات، ربیع اور خریف گزر جائیں، تاکہ پورے سال کے آمد وخرچ اور نفع ونقصان کی میزان لگ سکے اور زمیندار، کاشتکار، تاجر، نوکر، صناع، ہر ایک اپنی آمدنی وسرمایہ کا حساب کتاب کر کے اپنی مالی حالت کا اندازہ لگا سکے بڑے جانوروں کی پیدائش اور نسل کی افزائش میں بھی اوسطاً ایک سال لگتا ہے [2] ان تمام وجوہات سے ہر منظم جماعت ہر حکومت اور ہر قومی نظام نے محصول اور ٹیکس وصول کرنے کی مدت ایک سال مقرر کی ہے۔ شریعت محمدی ﷺ نے بھی اس بارہ میں اسی طبعی اصول کا اتباع کیا ہے اور ایک سال کی مدت کی آمدنی

---

[1] ابن سعد: جلد مغازی، جز ثانی، قسم اول، ص: ۱۱۵ وتاریخ طبری، ج ٤، ص: ۱۷۲۲ مطبوعہ یورپ۔

[2] بکری کی مدت حمل چھ مہینے، گائے کی نو، اونٹ کی گیارہ اور بھینس کی بارہ مہینے ہے۔

پر ایک دفعہ اس نے زکوٰۃ کی رقم عائد کی ہے۔ چنانچہ اس کا کھلا ہوا ارشاد سورۂ توبہ میں موجود ہے، جس میں زکوٰۃ کے تمام احکام بیان ہوئے ہیں۔ زکوٰۃ کے بیان کے بعد ہی ہے:

﴿ إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِندَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ ﴾

(۹/ التوبۃ:۳٦)

''مہینوں کی گنتی اللہ کے نزدیک بارہ مہینے ہیں، جس دن اللہ نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا۔''

زکوٰۃ کی مقدار

توراۃ سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل میں زکوٰۃ کی مقدار پیداوار کا دسواں حصہ تھا اور نقد میں آدھا مثقال جو امیر و غریب سب پر یکساں فرض تھا۔ لیکن زمین کی مختلف قسمیں ہوتی ہیں، کہیں زمین صرف بارش سے سیراب ہوتی ہے اور کہیں نہر کے پانی سے جہاں مزدوری اور محنت کا اضافہ ہو جاتا ہے، نقد دولت کے بھی مختلف اصناف ہیں، بعض مرتبہ دولت بے محنت مفت ہاتھ آ جاتی ہے اور بعض اوقات سخت محنت کرنی پڑتی ہے اس لئے سب کا یکساں حال نہیں ہو سکتا۔ انجیل نے حسب دستور اس مشکل کا کوئی حل نہیں کیا۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت کاملہ نے علم اقتصاد سیاسی (پولیٹیکل اکانومی) کے نہایت صحیح اصول کے مطابق دولت کے فطری اور طبعی ذرائع کی تعیین کی اور ہر ایک کے لئے زکوٰۃ کی مناسب شرح مقرر کر دی۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی بات یہ ہے کہ شریعت محمدیہ ﷺ نے توراۃ کی قانونی تعیین اور انجیل کی اخلاقی عدم تعیین، دونوں حقیقتوں کو اپنے نظام میں جمع کر لیا، اس نے اخلاقی طور پر ہر شخص کو اجازت دے دی کہ وہ اپنا کل مال یا نصف مال یا کم و بیش جو وہ چاہے خدا کی راہ میں دے دے، اس کا نام انفاق یا عام خیرات و صدقہ ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ یہ بھی فرض کر دیا کہ ہر شخص کی دولت میں غریبوں اور محتاجوں اور دوسرے نیک کاموں کے لئے بھی ایک مقررہ سالانہ حصہ ہے اور اس کا نام زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿ الَّذِينَ هُمْ عَلَىٰ صَلَاتِهِمْ دَائِمُونَ ۝ وَالَّذِينَ فِي أَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُومٌ ۝ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْرُومِ ۝ ﴾ (۷۰/ المعارج:۲۵)

''جو اپنی نماز ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور جن کے مالوں میں مانگنے اور محروم کا معلوم حصہ ہے۔''

اس آیت سے صاف و صریح طریقہ سے یہ ثابت ہے کہ مسلمانوں کی دولت میں غریبوں کا جو حصہ ہے وہ متعین، مقرر، معلوم اور عملاً رائج ہے۔ چنانچہ قرآن پاک میں مَعْلُوْم اور مَعْلُوْمَات کے الفاظ جہاں آئے ہیں، وہاں یہی مقصود ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ عرب میں جو قوم کسی نہ کسی طرح زکوٰۃ ادا کرتی تھی، اس کی جو شرح متعین اور رواج پذیر تھی، اس کو اسلام نے کسی قدر اصلاح کے بعد قبول کر لیا تھا۔ عرب میں اس قسم کی زکوٰۃ صرف بنی اسرائیل ادا کرتے تھے۔ جس کا حکم توراۃ میں مذکور ہے اور اس کی شرح بھی اس میں مقرر

ہے۔یعنی پیداوار میں دسواں حصہ اور نقد میں نصف مثقال۔آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے اجناس زکوٰۃ پر مختلف شرحیں مقرر فرمائیں، جو قیمت کے لحاظ سے اسی شرح معلوم کے مساوی ہیں اور ان شرحوں کو فرامین کی صورت میں لکھوا کر اپنے عمال کے پاس بھجوایا، یہی تحریری فرامین تدوین حدیث کے زمانہ تک بعینہٖ محفوظ تھے اور تدوین حدیث کے بعد ان کو بعینہٖ کتب حدیث میں درج کیا گیا جو آج تک موجود ہیں۔اس تمام تفصیل کا مخرج قرآن پاک میں بھی ایک حیثیت سے مذکور ہے۔

یہ ظاہر ہے کہ انسان کی دولت صرف اس کی محنت اور سرمایہ کی پیداوار ہے۔اس لئے اصول کا اقتضا یہ ہے کہ جس حد تک محنت اور سرمایہ کم لگتا ہو۔زکوٰۃ کی مقدار اسی قدر زیادہ رکھی جائے اور جیسے جیسے محنت بڑھتی اور سرمایہ کا اضافہ ہوتا جائے زکوٰۃ کی شرح کم ہوتی جائے ،عرب میں یہ دستور تھا کہ قبیلوں کے سردار چوتھ وصول کرتے تھے۔اسی لئے وہ اپنے سرداروں کو مرباع (یعنی چوتھ والا) کہا کرتے تھے۔شاید دوسری پرانی قوموں میں بھی یہ دستور ہو۔ہندوستان میں مرہٹوں نے بھی چوتھ ہی کو رائج کیا تھا۔مگر چونکہ اسلام کو محکوموں اور سپاہیوں کے ساتھ زیادہ رعایت مدِّ نظر تھی۔اس لئے اس نے چار کو پانچ کر دیا۔اس طرح چوتھ (۱/۴) کے بجائے دولت کا پانچواں حصہ خدا اور رسول کا حصہ قرار پایا، جس کو رسول اور ان کے بعد ان کے نائب اپنی ذاتی ضروریات، اہل وعیال کے نان ونفقہ اور نادار مسلمانوں کی امداد یا حکومت اور جماعت کی کسی اور ضروری مد میں صرف کر سکیں۔

اس زکوٰۃ کا نام جو غنیمت کے مال پر عائد ہوتی ہے، خمس ہے، قرآن نے کہا:

﴿ وَاعْلَمُوٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (۸/ الانفال: ٤١)

”اور جان لو کہ جو کچھ تم کو غنیمت ملے اس کا پانچواں حصہ خدا کے لئے اور رسول کے لئے اور قرابت مندوں کے لئے اور یتیموں اور مسکینوں اور مسافر کے لئے ہے۔“

نکتہ

اس موقع پر ایک خاص بات سمجھنے کے لائق ہے، جہاد یا دشمنوں سے لڑائی کا اصلی مقصد دین کی حمایت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے۔غنیمت کا مال حاصل کرنا نہیں اور اگر کوئی صرف حصول غنیمت کی نیت سے دشمن سے لڑے، تو اس کی یہ لڑائی اسلام کی نگاہ میں جہاد نہ ہوگی اور نہ اس کا کوئی ثواب ملے گا۔اس کی طرف خود قرآن پاک میں اشارہ موجود ہے اور آنحضرت ﷺ نے بھی متعدد حدیثوں میں اس کی تشریح فرما دی ہے۔اس بنا پر درحقیقت وہ مال غنیمت جو لڑائی میں دشمنوں سے ہاتھ آتا ہے۔ایک ایسا سرمایہ ہے جو بلا قصد اور بلا محنت اتفاقاً مسلمانوں کو مل جاتا ہے، اس سے یہ نکتہ حل ہو جاتا ہے کہ جو سرمایہ کسی محنت کے بغیر اتفاقاً ہاتھ آئے اس

میں پانچواں حصہ نظام جماعت کا حق ہے یا حکومت کے مقررہ بالا مصارف کے لئے ہے۔ یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی محنت کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آ جائے، اس میں سے پانچواں حصہ خدا اور رسول کا ہے تا کہ وہ جماعت کے مشترکہ مقاصد کے صرف میں آئے، وہی ہے جس کی بنا پر ''رکاز'' یعنی دفینہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً غیب سے ہاتھ آ جائے خمس (یعنی پانچواں حصہ) جماعت کے بیت المال کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

محنت اور سرمایہ سے جو دولت پیدا ہوتی ہے، اس میں سب سے پہلی چیز زمین کی پیداوار ہے۔ توراۃ نے ہر قسم کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ شریعت محمدیہ نے نہایت نکتہ سنجی کے ساتھ پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانہ تک محفوظ رہ سکتے ہیں، تا کہ ان سے حسب منشا خانگی اور تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو، اسی بنا پر سبزیوں اور ترکاریوں پر جو ایک دو روز سے زیادہ نہیں رہ سکتیں کوئی زکوٰۃ مقرر نہیں فرمائی گئی، اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشو و نما اور ترقی کی صلاحیت نہیں، مثلاً: آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب، سواری، قیمتی [1] پتھر ان پر بھی زکوٰۃ نہیں رکھی گئی، کچھ دنوں تک باقی رہنے والی اور نشو و نما پانے والی چیزیں چار ہیں زمین، جانور، سونا، چاندی یا ان کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔ زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے، مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے اس کے سیراب کرنے میں کاشتکار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا۔ بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سے آپ سیراب ہوتی ہے، اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر (۱\۱۰) مقرر کیا گیا۔ زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو۔ مثلاً: کنوئیں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا، تو اس میں قسم اول سے بھی

---

[1] قیمتی پتھروں سے مراد جواہرات اور موتی وغیرہ ہیں، ان پر اس لئے زکوٰۃ نہیں ہے کہ اسلام نے ان کو صرف اسباب زینت قرار دیا ہے، فرمایا: ﴿حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا﴾ (۱۶/ النحل: ۱۴؛ ۳۵/ فاطر: ۱۲) ''زیور جن کو تم پہنتے ہو'' یہ ایسے ہی ہیں جیسے بعض فقہا کے نزدیک سونے چاندی کے استعمالی زیوروں پر زکوٰۃ نہیں کہ یہ بھی ان کے نزدیک اسباب زینت میں ہیں، اب اگر کوئی شخص ہزاروں اور لاکھوں روپے کے جواہرات جمع کر لے تو اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ یا تو تجارت کے لئے ہیں، تو ان پر مال تجارت کی حیثیت سے ان کی قیمت کے لحاظ سے زکوٰۃ واجب ہو گی دوسری یہ کہ کوئی بدنصیب زکوٰۃ سے بچنے کے لیے اپنی دولت کو جواہرات کی صورت میں منتقل کرتا ہے تو گو قانوناً اس سے زکوٰۃ وصول نہیں کی جائے گی، لیکن دیانۃً وہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک سخت گناہ گار ہو گا اور تیسری صورت یہ ہے کہ وہ محض سامان تعیش اور فخر و مباہات کے لیے جمع کرتا ہے، تو اس کی حالت وہی ہو گی جو بیش قیمت لباسوں اور سامانوں کا ذخیرہ جمع کر لے اس کا شمار اسراف میں ہو گا اور اس پر وعید ہے۔ اصل یہ ہے کہ جواہرات کی قیمت کی گرانی نقدین (یعنی سونے چاندی) کی طرح طبعی نہیں ہے، بلکہ محض فرضی ہے، نہ وہ خود ضروریات زندگی میں ہیں، نہ ان سے ضروریات زندگی کا مبادلہ یا خریداری معمولاً کی جاتی ہے، چند دولت مندوں کی طلب اور مانگ نے ان کی فرضی قیمت بنا رکھی ہے، اگر ان جواہرات کی آب جاتی رہی یا وہ ٹوٹ جائیں یا ان میں بال پڑ جائے تو ان کی قیمت فوراً گر جائے گی، بخلاف سونے چاندی کے کہ ان کی قیمت کی گرانی طبعی اسباب سے ہے اور وہ ضروریات زندگی کے لیے زر مبادلہ ہے، وہ بھی ٹوٹ جائے یا میلا بھی ہو جائے تو بھی اس کی قیمت ہر حال میں باقی ہے، اسی لئے وہ معیار زر ہیں۔

نصف یعنی بیسواں حصہ (۱\۲۰) مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ جس کی ترقی، حفاظت، نشو ونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز کی سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لئے بڑے سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے، زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں (۱\۴۰) حصہ مقرر ہوا۔ [1] (جانوروں کا ذکر آگے آتا ہے)۔

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے، انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا جینا منحصر ہے، صرف غذا ہے، زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی جاتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت سے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں، لیکن سونے چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے، وہ براہ راست ان کی زندگی کی اصلی ضرورت کے کام میں نہیں آتی، بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں، وہ کاشتکاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپے دیتے ہیں، جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں، پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر شہر، ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں، نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ ہر سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے، اس لئے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے، ایک اور بات یہ ہے کہ کاشتکار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے اور شہروں سے دور ہوتے ہیں، نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکون سے بھی محروم رہتے ہیں۔ اس لئے نسبتاً وہ قومی ضروریات، دین کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس انفاق یعنی اخلاقی خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں، جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں، اس بنا پر بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لئے قانونی خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جائے۔ زکوۃ کی شرح مقدار کی تعیین میں اس خمس والی آیت سے ایک اور نکتہ معلوم ہوتا ہے کہ خمس میں چونکہ امامت وحکومت کے تمام ذاتی وقومی مصارف شامل ہیں، اس لئے وہ کل کا خمس یعنی ۱\۵ مقرر ہوا اور زکوۃ کے مصارف جیسا کہ سورۂ توبہ رکوع ۸ میں مذکور ہیں صرف آٹھ ہیں، اس بنا پر ان آٹھ مصرفوں کے لئے مجموعی رقم چالیسواں حصہ رکھی گئی، پھر غور کیجئے کہ سونا چاندی کی شرح ۲۰۰ درم یا اس کے مماثل سونا ہے ان دوسو درہموں کو ۵ پر تقسیم کر دیجئے تو ۴۰ ہو جائے گا یہ کل زکوۃ کی شرحیں ۱\۵ و ۱\۱۰ و ۱\۲۰ و ۱\۴۰ ایک دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا مضاعف ہوتی چلی گئی ہیں اس سے یہ اندازہ ہوگا کہ یہ تقسیم وتحدید حساب اور اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

جانوروں پر زکوۃ

توراۃ میں ہر قسم کے جانوروں میں دسواں حصہ زکوۃ کا تھا۔ [2] لیکن چونکہ ہر قسم کے جانوروں میں

[1] یہ نکتہ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد، ج ۱، ص: ۱۵۲ میں بیان کیا ہے۔ [2] احبار: ۲۷۔ ۳۳؛ العھد القدیم، ص: ۲۰۵۔

نسل کی افزائش کی صلاحیت اور مدت افزائش (زمانہ حمل) یکساں نہیں ہوتی، نیز جانوروں میں دسویں بیسویں کا حصہ، مشاع ہر تعداد پر چسپاں نہیں ہوسکتا۔ اس لئے ان میں دسویں بیسویں کے بجائے تعداد کے تعین کی ضرورت تھی۔ شریعتِ محمدیہ نے اس نقص کو پورا کیا۔ چنانچہ اسی پہلے اصول (پیدائش اور افزائش کی مدت کیفیت اور کمیت) کی بنا پر اولاً بےنسل یا کم نسل کے جانوروں کو زکوٰۃ سے مستثنیٰ کردیا۔ مثلاً خچر گھوڑے ❶ پر کوئی زکوٰۃ نہیں، دوسرے جانوروں کی مالیت اور قوت و کیفیت افزائش کے لحاظ سے حسب ذیل شرح معین ہوئی، یہ وہ شرح نامہ ہے، جو خود آنحضرت ﷺ نے اپنی حکمت ربانی سے فیصلہ فرما کر طے کیا اور زبانی نہیں، بلکہ فرامین کی صورت میں لکھوا کر عمال کو عنایت فرمایا تھا اور خلفائے راشدین نے اسی کی نقلیں حدود حکومت میں بھجوائیں اور جس کی تعمیل آج تک برابر بلا اختلاف ہوتی آئی ہے:

نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ	نام جانور	تعداد	شرح زکوٰۃ
اونٹ	ایک سے چار تک	کچھ نہیں	اونٹ	۲۰ سے ۲۴ تک	چار بکریاں
اونٹ	۵ سے ۹ تک	ایک بکری	//	۲۵ سے ۳۵ تک	اونٹ کا ایک سال کا بچہ
//	۱۰ سے ۱۴ تک	دو بکریاں	//	۳۶ سے ۴۵ تک	اونٹ کا دوسالہ بچہ
//	۱۵ سے ۱۹ تک	تین بکریاں	//	۴۶ سے ۶۰ تک	اونٹ کا تین سالہ بچہ
	۶۱ سے ۷۵ تک	چار سال کا اونٹ کا بچہ			
	۷۶ سے ۹۰ تک	دوسال کے دو بچے			
	۹۱ سے ۱۲۰ تک	تین سال کے دو بچے	گائے، بیل بھینس	ایک سے ۲۹ تک	کچھ نہیں
	۱۲۰ کے بعد ہر چالیس پر	دوسال کا ایک بچہ	//	۳۰ تک	ایک دوسالہ بچھڑا ❷
	اور ہر پچاس پر	تین سال کا ایک بچہ	//	۴۰ تک	تین سال کا ایک بچھڑا ❸
بکری	ایک سے ۳۹ تک	کچھ نہیں	//	۶۰ تک	دوسال کے دو بچھڑے
	۴۰ سے ۱۲۰ تک	ایک بکری	//	۷۰ تک	ایک تین سال اور ایک دوسال کا بچھڑا
	۱۲۱ سے ۲۰۰ تک	دو بکریاں	//	۸۰ تک	تین سال کے دو بچھڑے
	۲۰۰ سے ۳۰۰ تک	تین بکریاں	//	۹۰ تک	تین سال کے تین

❶ حنفیہ کے نزدیک خیل متناسلہ اور تجارت کے گھوڑوں میں زکوٰۃ ہے، سواری اور جہاد کے گھوڑوں میں نہیں۔

❷ یعنی جس کا دوسرا سال شروع ہو۔ ❸ جس کا تیسرا سال شروع ہو۔

	پھر ہر سو پر	ایک ایک بکری	//	۱۰۰ تک	دو سال کے دو، اور تین سال کا ایک
			//	پھر ہر دس پر	ایک دو سالہ

غرض اصول یہ ہے کہ ہر تیس بننے والے عدد پر ایک دو سالہ اور ہر چالیس بننے والے عدد پر ایک سہ سالہ۔

نصاب مال کی تعیین

شرح زکوۃ کے تعین کے سلسلہ میں شرائع سابقہ میں ایک اور کمی تھی، جس کی تکمیل محمد رسول اللہ ﷺ کی شریعت نے کر دی، جن دوسری شریعتوں میں قانونی خیرات کی تعیین ہے۔ان میں امیر وغریب اور کم اور زیادہ دولت والوں کی تفریق نہیں کی گئی تھی۔ مثلاً: اگر دس بیس روپے والوں یا دس پانچ گائے اور بکری والوں سے یہ زکوۃ وصول کی جاتی تو ان پر ظلم ہوتا، توراۃ میں غلہ اور مویشی پر جو عشر اور نقد پر جو آدھا مثقال مقرر کیا گیا ہے، اس میں اس کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ آدھے مثقال کی زکوۃ میں تو یہاں تک کہہ دیا گیا ہے کہ

”خداوند کے لئے نذر کرتے وقت آدھے مثقال سے امیر زیادہ نہ دے اور غریب کم نہ دے“۔(خروج ۳۰۔۱۵)

لیکن شریعت محمدی ﷺ نے اس نکتہ کو ملحوظ رکھا اور غریبوں، ناداروں، مقروضوں اور ان غلاموں کو جو سرمایہ نہیں رکھتے یا اپنی آزادی کے لئے سرمایہ جمع کر رہے ہیں، اس سے بالکل مستثنیٰ کر دیا، نیز دولت کی کم مقدار رکھنے والوں پر بھی ان کی اپنی حسب خواہش اخلاقی خیرات کے علاوہ کوئی باقاعدہ زکوۃ عائد نہیں کی اور کم مقدار کی دولت کا معیار بھی اس نے خود مقرر کر دیا۔سونے کی زکوۃ وہی آدھا مثقال رکھا، لیکن بتا دیا کہ یہ آدھا مثقال اسی سے لیا جائے گا جو کم از کم پانچ اوقیہ یعنی بیس مثقال [1] سونے کا مالک ہو اور ۵ اوقیہ یعنی ۲۰ مثقال سونے کی متوسط قیمت دو سو درہم چاندی کے سکے ہیں یعنی ایک اوقیہ چالیس درہم کے برابر ہے۔ [2] وہ کم سے کم معیار دولت جس پر زکوۃ نہیں حسب ذیل ہے:

نام	اس تعداد سے کم پر زکوۃ نہیں
غلہ اور پھل	پانچ وسق [3] سے کم پر زکوۃ نہیں
اونٹ	پانچ عدد
گائے، بیل، بھینس	۳۰ عدد
بھیڑ، بکری	۴۰ عدد

[1] موجودہ انگریزی حساب سے بیس مثقال سونا ساڑھے سات تولہ کے اور دو سو درہم چاندی ۵۲ روپے تولے کے برابر ہے۔مگر یہ کتاب کی تصنیف کے وقت انگریزی دور کے لحاظ سے ہے۔اب ایک تولہ یعنی انگریزی سکہ تقریباً سو روپے کے برابر ہے اس فرق کو ملحوظ رکھا جائے۔ [2] سنن ابی داود، کتاب الزکوة، باب من یعطی من الصدقة وحد الغنی: ١٦٢٨۔

[3] ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادتاً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو۔

سونا	پانچ اوقیہ (بیس مثقال) سے کم پر زکوٰۃ نہیں
چاندی	۲۰۰ درہم سے کم پر زکوٰۃ نہیں

اس معیار سے امیر وغریب کی سطحوں میں جو یکساں زکوٰۃ کی ناہمواری تھی، وہ دور ہوگئی اور جو غریب خود زکوٰۃ کے مستحق تھے، وہ اس قومی محصول سے بری ہوگئے۔ان مذکورہ بالا اشیاء کی تعداد جنسیت کے اختلاف کی وجہ سے گو مختلف ہے۔مگر مالی اعتبار سے وہ ایک ہی معیار پر مبنی ہیں۔پانچ وسق غلہ، دوسو درہم چاندی اور پانچ اوقیہ سونا درحقیقت ایک ہی معیار ہے۔ایک اوقیہ جیسا کہ معلوم ہو چکا چالیس درہم کے برابر ہے۔اس بنا پر پانچ اوقیہ اور دوسو درہم برابر ہیں۔اسی طرح ایک وسق غلہ کی قیمت اس زمانہ میں چالیس [1] درہم یا ۴ مثقال تھی یعنی پانچ اوقیہ اور پانچ وسق کی قیمت وہی دوسو درہم یا ۲۰ مثقال ہوگی۔

زکوٰۃ کے مصارف اور ان میں اصلاحات

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت میں تین قسم کی زکوٰۃ تھی، ایک آدھے مثقال سونے چاندی کی یہ رقم جماعت کے خیمہ یا پھر بیت المقدس کی تعمیر ومرمت اور قربانی کے طلائی ونقرئی ظروف وسامان کے بنانے میں خرچ کی جاتی تھی۔(خروج ۳۰۔۱۳) دوسری خیرات یہ تھی کہ کھیت کاٹتے اور پھل توڑتے وقت حکم تھا کہ جا بجا کونوں اور گوشوں میں کچھ دانے اور پھل چھوڑ دیئے جائیں وہ غریبوں اور مسافروں کا حصہ تھا۔(احبار ۱۹۔۱۰) اور سوم یہ تھی کہ ہر تیسرے سال کے بعد پیداوار اور جانوروں کا دسواں حصہ خدا کے نام پر نکالا جائے، اس کے مصارف یہ تھے کہ دینے والا مع اہل وعیال کے بیت المقدس جاکر جشن منائے اور کھائے اور کھلائے اور لادیوں میں، جو موروثی کاہن اور خدا کے گھر کے خدمت گزار ہیں، نام بنام تقسیم کیا جائے (اس کے بدلے میں وہ خاندانی وراثت سے محروم رکھے گئے تھے) اس کے بعد یہ چیزیں بیت المقدس کے خزانہ میں جمع کردی جاتی تھیں کہ ان سے مسافروں یتیموں اور بیواؤں کو کھانا کھلایا جائے۔(استثناء ۱۴۔۲۶ سے ۲۹ تک)

شریعت محمدیہ نے مذہب کی حقیقت میں سب سے بڑی جو اصلاح کی:

1. وہ عبادت میں خدا اور بندہ کے درمیان سے واسطوں کا حذف کرنا تھا، یہاں ہر شخص اپنا آپ امام اور کاہن ہے۔اس بنا پر مفت خور کاہنوں اور عبادت گاہوں کے خادموں کی ضرورت ساقط ہوگئی اور اس لئے زکوٰۃ کا یہ مصرف جو قطعاً بیکار تھا کلیتہً اڑ گیا۔
2. عبادت میں سادگی پیدا کرکے ظاہری رسموں اور نمائشوں سے اس کو پاک کردیا گیا، اس لئے سونے چاندی کے سامانوں، قربانی کے برتنوں اور محرابوں کے طلائی شمع دانوں کی ضرورت ہی نہیں رہی۔
3. حج ان ہی پر واجب کیا گیا جن کے پاس زادراہ ہو، اس لئے ہر شخص کو خواہ مخواہ بیت اللہ جانے کی حاجت نہ رہی اور اس لئے یہ رقم بھی خارج ہوگئی۔

---

[1] هداية، باب الزكوة في التجارة، فصل في العروض، ج۱، ص:۸۰۔

4. زکوٰۃ کی چیز کو مالک کی ذاتی ضروریات اور کھانے میں صرف ہونے کی ممانعت کر دی گئی کہ اگر وہ مالک ہی کے ضروریات میں خرچ ہوگئی تو اس میں ایثار کیا ہوا۔

5. اس طرح وہ تمام سامان اور رقمیں جو ان مدوں سے بچیں غریبوں، مسکینوں اور مسافروں وغیرہ کو دے دی گئیں۔

گزشتہ اصلاحات کے علاوہ شریعت محمدیہ نے زکوٰۃ کے سلسلہ میں بعض اور اصلاحیں بھی کی ہیں مثلاً:

6. شریعت سابقہ میں ایک بڑی تنگی یہ تھی کہ زکوٰۃ خود مستحقین کے حوالہ نہیں کی جاتی تھی۔ بلکہ ذخیرہ میں جمع ہوکر اس کا کھانا پک کر غربا میں تقسیم ہوتا تھا، لیکن عام انسانی ضرورتیں صرف کھانے تک محدود نہیں ہیں۔ اس لئے شریعت محمدیہ نے اس رسم میں یہ اصلاح کی کہ غلہ یا رقم خود مستحقین کو دے دی جائے، تاکہ وہ جس طرح چاہیں اپنی ضروریات میں صرف کریں۔

7. ایک بڑی کمی یہ تھی کہ نقد زکوٰۃ جو آدھے مثقال والی تھی، وہ بیت المقدس کے خرچ کیلئے مخصوص تھی، اس کے علاوہ کوئی دوسری نقد زکوٰۃ نہ تھی۔ شریعت محمدیہ نے بیس مثقال پر آدھا مثقال نقد زکوٰۃ فرض کر کے اس کو بھی تمام تر مستحقین کے ہاتھوں میں دے دیا۔

8. غلہ کی صورت یہ تھی کہ سارے کا سارا بیت المقدس چلا جاتا تھا اور وہیں سے وہ پکوا کر تقسیم کیا جاتا تھا۔ یہ انتظام بنی اسرائیل کی ایک چھوٹی سی قوم کے لئے تو شاید موزوں ہوسکتا ہو، مگر ایک عالمگیر مذہب کے تمام عالم میں منتشر پیروؤں کے لئے یہ بالکل ناممکن تھا، اس لئے مناسب سمجھا گیا کہ ہر جگہ کی زکوٰۃ اسی مقام کے مستحقین میں صرف کی جائے۔

9. بعض منافقین اور دیہاتی بدوؤں کی یہ حالت تھی کہ وہ اس قسم کے صدقات کی لالچ کرتے تھے۔ جب تک ان کو امداد ملتی رہتی خوش اور مطمئن رہتے اور جب نہ ملتی تو طعن وطنز کرنے لگتے۔ اسلام نے ایسے لوگوں کا منہ بند کرنے اور ان کی مفت خوری کی عادتِ بد کی اصلاح کے لئے زکوٰۃ کے جملہ مصارف کی تعیین کر دی اور بتا دیا کہ اس کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس رقم سے کس کس کو مدد دی جاسکتی ہے۔ چنانچہ سورۂ توبہ کے ساتویں رکوع میں اس کا مفصل ذکر ہے۔

10. اگر زکوٰۃ کے مصارف کی تعیین نہ کی جاتی اور اس کے مستحقین کے اوصاف نہ بتا دیئے جاتے تو یہ تمام سرمایہ خلفا اور سلاطین کے ہاتھوں میں کھلونا بن جاتا اور سلطنت کی دوسری آمدنیوں کی طرح یہ بھی ان کے عیش وعشرت کے پرتکلف سامانوں کے نذر ہو جاتا، اس لئے تاکید کر دی گئی کہ جو غیر مستحق اس کو لے گا، اس کے لئے یہ حرام ہے اور جو شخص کسی غیر مستحق کو اپنی زکوٰۃ جان بوجھ کر دے گا تو اس کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی، اسی بندش کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں زکوٰۃ تا بامکان اب تک صحیح مصارف میں خرچ ہوتی ہے۔

⑪ اس قسم کی مالی رقوم جب کوئی اپنے پیروؤں پر عائد کرتا ہے تو اس کی نہایت قوی بدگمانی ہو سکتی ہے کہ وہ اس طرح اپنے اور اپنے خاندان کے لئے ایک دائمی آمدنی کا سلسلہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ کی شریعت میں زکوٰۃ کا مستحق حضرت ہارون اور ان کی اولاد (بنولاوی) کو ٹھہرایا گیا تھا کہ وہ خاندانی کاہن مقرر ہوئے تھے۔ مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قسم کی بدگمانیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا اور اپنے خاندان کے لئے قیامت تک زکوٰۃ کی ہر مد قطعی طور پر حرام قرار دی۔

⑫ قرآن مجید میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف قرار دیئے گئے:

﴿ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝﴾

(۹/ التوبہ:۶۰)

”زکوٰۃ کا مال تو غریبوں مسکینوں اور زکوٰۃ کے صیغہ میں کام کرنے والوں اور ان لوگوں کے لئے ہے جن کے دلوں کو اسلام کی طرف ملانا ہے اور گردن چھڑانے میں جو تاوان بھریں، ان میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر کے بارہ میں یہ خدا کی طرف سے ٹھہرایا ہوا ہے اور خدا جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ (اس لئے اس کی یہ تقسیم علم وحکمت پر مبنی ہے)۔“

فقرا میں ان خوددار اور مستورالحال شرفا، کو ترجیح دی ہے جو دین اور مسلمانوں کے کسی کام میں مصروف ہونے کی وجہ سے کوئی نوکری چاکری یا بیوپار نہیں کر سکتے اور حاجت مند ہونے کے باوجود کسی کے آگے ہاتھ نہیں پھیلاتے اور اپنی آبرو اور خودداری کو ہر حال میں قائم رکھتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ۡ يَحْسَبُھُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُھُمْ بِسِيْمٰھُمْ ۚ لَا يَسْــَٔـلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ۭ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳)

”ان مفلسوں کو دینا ہے جو اللہ کی راہ میں اٹک رہے ہیں اور زمین میں (روزی حاصل کرنے کے لئے) چل پھر نہیں سکتے، ناواقف ان کے نہ مانگنے کی وجہ سے ان کو بے احتیاج سمجھتے ہیں، تم ان کو ان کے چہرہ سے پہچانتے ہو کہ وہ حاجتمند ہیں وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔“

تمام مستحقین کو درجہ بدرجہ ان کی اہمیت اور اپنے تعلق کے لحاظ سے دینا چاہیے، چنانچہ اسی سورہ میں فرمایا:

﴿ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَـتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّاۗىِٕلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

”اور جس نے خدا کی محبت پر (یا مال کی محبت کے باوجود) قرابت مندوں، یتیموں، مسکینوں، مسافروں، مانگنے والوں اور (غلاموں یا مقروضوں کی) گردن چھڑانے میں مال دیا۔“

اس کے تین چار رکوع کے بعد ہے۔

﴿ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ ﴾

(۲/ البقرہ:۲۱۵)

'' کہو جو تم مال خرچ کرو، وہ اپنے ماں باپ، رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں اور مسافروں کے لئے۔''

ضرورت مندوں میں ترجیح

اسلام سے پہلے عام طور پر یہ سمجھا جاتا تھا کہ قرابت مندوں اور رشتہ داروں کے دینے سے اجنبی بیگانہ اور بے تعلق لوگوں کو دینا زیادہ ثواب کا کام ہے اور اس کی وجہ یہ سمجھی جاتی تھی کہ اپنے لوگوں کے دینے میں کچھ نہ کچھ نفسانیت کا اور ایک حیثیت سے خود غرضی کا شائبہ ہوتا ہے، کیوں کہ وہ اپنے ہی رشتہ دار ہیں اور ان کا نفع و نقصان اپنا ہی نفع و نقصان ہے۔ لیکن درحقیقت یہ ایک قسم کا اخلاقی مغالطہ اور فریب تھا۔ ایک انسان پر دوسرے انسان کے جو حقوق ہیں، وہ تمام تر تعلقات کی کمی و بیشی پر مبنی ہیں۔ جو جتنا قریب ہے اتنا ہی زیادہ آپ کے حقوق اس پر اور اس کے حقوق آپ پر ہیں، اگر یہ نہ ہو تو رشتہ داری اور قرابت مندی کے فطری تعلقات بالکل لغو اور مہمل ہو جائیں، انسان پر سب سے پہلے اس کا اپنا حق ہے۔ پھر اہل و عیال کا، ان کے جائز حقوق ادا کرنے کے بعد اگر سال میں کچھ بچ رہے تو اس میں حصہ پانے کے سب سے زیادہ مستحق قرابت دار ہیں۔ چنانچہ وراثت اور ترکہ کی تقسیم میں اس اصول کی رعایت کی گئی ہے۔

یہ سمجھنا بھی کہ اگر قرابت داروں کو ترجیح دی جائے تو دوسرے غریبوں کا حق کون ادا کرے گا، ایک قسم کا مغالطہ ہے، دنیا میں ہر انسان کسی نہ کسی کا رشتہ دار ضرور ہے، اس بنا پر اگر ہر شخص اپنے رشتہ داروں کی خبر گیری کرے تو کل انسانوں کی خبر گیری ہو جائے گی، اس کے علاوہ اس مقام پر ایک اور غلط فہمی بھی ہے، جس کو دور ہو جانا چاہیے، مستحقین میں باہم ایک کو دوسرے پر جو فوقیت ہے، اس کا مدار دو چیزوں پر ہے، ایک تو دینے والوں سے ان اشخاص کے قرب و بعد کی نسبت، دوسرے ان اشخاص کو حاجتوں اور ضرورتوں کی کمی و بیشی، قرابت مندوں کی ترجیح کے یہ معنی نہیں ہیں کہ خواہ ان کی ضرورت کتنی ہی کم اور معمولی ہو ان کو ان لوگوں پر ترجیح ہے جن کی ضرورت اور حاجتمندی ان سے کہیں زیادہ ہے، بلکہ مسئلہ کی صورت یہ ہے کہ اگر دو ضرورت مند برابر کے حاجت مند ہوں اور ان میں سے ایک آپ کا عزیز یا دوست یا ہمسایہ ہو تو وہ آپ کی امداد کا زیادہ مستحق ہو گا۔ یعنی ضرورت اور حاجت کی مساوات کے بعد تعلقات کی کمی و بیشی ترجیح کا دوسرا سبب بنے گی نہ کہ پہلا سبب؟ اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ ایسی حالت میں وہ اپنے عزیزوں اور دوستوں کو ترجیح دے۔ فقرا اور مساکین میں سے ان لوگوں پر جو بے حیائی کے ساتھ دربدر بھیک مانگتے پھرتے ہیں، ان کو ترجیح دی گئی ہے جو

فقر و فاقہ کی ہر قسم کی تکلیف گوارا کرتے ہیں، لیکن اپنی عزت و آبرو اور خودداری کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتے اور لوگوں کے سامنے ہاتھ نہیں پھیلاتے ہیں۔ یہ تعلیم خود قرآن پاک نے دی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا نیز آنحضرت ﷺ نے بھی اس کی تاکید فرمائی ہے، آپ ﷺ نے فرمایا: ''مسکین وہ نہیں ہے جس کو ایک دو لقمے در بدر پھرایا کرتے ہیں۔'' صحابہ رضی اللہ عنہم نے دریافت کیا پھر کون مسکین ہے؟ ارشاد ہوا: ''وہ جس کو حاجت ہے لیکن اس کا پتہ نہیں چلتا اور وہ کسی سے مانگتا نہیں۔'' [1] اس تعلیم کے دو مقصد ہیں، ایک تو یہ کہ ان بھیک مانگنے والوں کو تو کوئی نہ کوئی دے ہی دے گا اور وہ کہیں نہ کہیں سے پا ہی جائیں گے، اس لئے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں، اصلی توجہ ان مستور الحال مسکینوں کی طرف ہونی چاہیے جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر اکثریت کو نہیں ہو سکتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہ جاتے ہیں دوسرا مقصد یہ ہے کہ شریعت اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کر دے کہ بے حیا گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں نہایت کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتی ہے۔ شریعت نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین و تحدید اس غرض سے بھی کی ہے، تاکہ ہر شخص کو مانگنے کی ہمت نہ ہو اور ہر کس و ناکس اس کو اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے۔ جیسا کہ بعض منافقین اور اہل بادیہ نے اس کو اپنے ایمان و اسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا۔ چنانچہ وحی الٰہی نے ان کی پردہ دری ان الفاظ میں کی:

﴿ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ فِي الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ۝ اِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۵۸۔۶۰)

''اور بعض ان میں سے ایسے ہیں جو تجھ کو (پیغمبر کو) زکوٰۃ بانٹنے میں طعن دیتے ہیں، اگر ان کو اس میں سے ملے تو راضی ہوں اور اگر نہ ملے تو وہ ناخوش ہو جائیں اور کیا خوب تھا اگر وہ اس پر راضی رہتے جو خدا اور اس کے رسول نے ان کو دیا اور کہتے کہ ہم کو اللہ بس ہے، ان کو اللہ اپنی مہربانی سے اور اس کا رسول دیں گے، ہم کو تو خدا ہی چاہیے، زکوٰۃ تو حق ہے غریبوں کا، مسکینوں کا اور اس کا کام کرنے والوں کا اور ان کا جن کا دل (اسلام کی طرف) پرچانا ہے اور گردن چھڑانے میں اور خدا کی راہ میں اور مسافر میں، یہ حصے خدا کی طرف سے ٹھہرائے ہوئے ہیں۔''

ایک دفعہ ایک شخص نے آنحضرت ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ پانے کی درخواست کی۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''اے شخص! اللہ تعالیٰ نے مالِ زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار

[1] صحیح مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب المسکین الذی لایجد غنی ولا یفطن لہ فیتصدق علیہ: ۲۳۹۳، ۲۳۹۴۔

نہیں دیا ہے۔ بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے اور اس کے آٹھ مصرف بیان کر دیئے ہیں، اگر تم ان آٹھ میں سے ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں۔'' ❶

اسلام میں زکوۃ کے مصارف ہشتگانہ

یہ آٹھوں مصارف نیکی، بھلائی اور خیر وفلاح کی ہر قسم اور ہر صنف کو محیط ہیں فقرا اور مساکین میں وہ تمام اہل حاجت داخل ہیں جو اپنی محنت وکوشش سے اپنی روزی کمانے کی صلاحیت نہیں رکھتے، جیسے بوڑھے، بیمار، اندھے، لولے لنگڑے، مفلوج، کوڑھی، یا وہ محنت کر سکتے ہیں، لیکن موجودہ حالت میں دین وملت کی کسی ایسی ضروری خدمت میں مصروف ہیں کہ وہ اپنی روزی کمانے کی فرصت نہیں پاتے، جیسے مبلغین، مذہبی بالغ طالب العلم جو ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِي الْاَرْضِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳) میں اسی طرح داخل ہیں، جس طرح آنحضرت ﷺ کے زمانہ مبارک میں اصحاب صفہ داخل تھے اور وہ کم نصیب بھی داخل ہیں جو اپنی پوری محنت اور کوشش کے باوجود اپنی روزی کا سامان پیدا کرنے سے اب تک قاصر رہے ہیں اور فاقہ کرتے ہیں۔ ﴿ وَالْعَامِلِيْنَ عَلَيْهَا ﴾ یعنی امام کی طرف سے صدقہ کی تحصیل وصول کا کام کرنے والے بھی اس میں سے اپنے کام کی اجرت پا سکتے ہیں اور ﴿ وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ ﴾ (یعنی جن کی تالیف قلوب کی جائے) میں وہ لوگ داخل ہیں جن کو ابھی اسلام کی طرف مائل کرنا ہے یا جن کو اسلام پر مضبوط کرنا ہے ﴿ وَفِي الرِّقَابِ ﴾ (گردن کے چھڑانے میں) اس سے مقصود وہ غلام ہیں، جن کی گردنیں دوسروں کے قبضہ میں ہیں اور ان کو خرید کر آزاد کرنا ہے اور وہ مقروض ہیں جو اپنا قرض آپ کسی طرح ادا نہیں کر سکتے، ﴿ وَالْغَارِمِيْنَ ﴾ (تاوان اٹھانے والوں) سے مراد وہ نیک لوگ ہیں، جنہوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لئے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے، یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوۃ کے بیت المال سے ادا کی جا سکتی ہے۔ ﴿ وَفِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ (خدا کی راہ میں) ایک وسیع مفہوم ہے جو ہر قسم کے نیک کاموں کو شامل ہے۔ ❷ اور حسب ضرورت بھی اس سے مذہبی لڑائی یا سفر حج یا اور دوسرے نیک کام مراد لئے جا سکتے ہیں اور ﴿ وَابْنِ السَّبِيْلِ ﴾ (مسافر میں) اس میں مسافروں کی ذاتی مدد کے علاوہ مسافروں کی راحت رسانی کے سامان کی تیاری مثلاً: راستوں کی درستی، پلوں اور مسافر خانوں کی تعمیر بھی داخل ہو سکتی ہے۔ ❸ یہ ہیں زکوۃ کے وہ آٹھ مقررہ مصارف جن میں اسلام نے اس قومی ومذہبی رقم

---

❶ ابوداود، وكتاب الزكوة باب من يعطى من الصدقة وحد الغنى. ١٦٣٠ـ ❷ اکثر فقہا نے فی سبیل اللہ سے مراد صرف جہاد لیا ہے، مگر یہ تحدید صحیح نہیں معلوم ہوتی، آیت گزر چکی ﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾ یہاں فی سبیل اللہ سے بالاتفاق صرف جہاد ہی نہیں بلکہ ہر نیکی اور دینی کام مراد ہے، اکثر فقہا نے یہ بھی کہا ہے کہ زکوۃ میں تملیک یعنی کسی شخص کی ذاتی ملکیت بنانا ضروری ہے، مگر ان کا استدلال جو للفقراء کے لام تملیک پر مبنی ہے، بہت کچھ مشتبہ ہے، ہو سکتا ہے کہ لام انتفاع ہو جیسے ﴿ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ﴾

❸ كتاب الخراج قاضى ابو يوسف فصل فى الصدقات باب فى النقصان والزيادة والضياع، ص: ٤٦ـ

کو خرچ کرنے کی تاکید کی ہے۔

مسکینوں، فقیروں اور معذوروں کی امداد

زکوٰۃ کا سب سے اہم مصرف یہ ہے کہ اس سے لنگڑے، لولے، اندھے، بوڑھے، کوڑھی مفلوج اور دوسرے معذور لوگوں کی امداد کی جائے۔ نادار، یتیموں، بیواؤں اور ان لوگوں کی خبر گیری کی جائے جو اپنی کوشش اور جدوجہد کے باوجود روزی کا سامان نہیں کر پاتے یہ زکوٰۃ کا وہ مصرف ہے جو تقریباً ہر قوم میں اور ہر مذہب میں ضروری خیال کیا گیا ہے اور ان مستحقین کی یہ قابل افسوس حالت خود کسی مزید تشریح کی محتاج نہیں۔ لیکن اسلام نے ان کے علاوہ زکوٰۃ کے چند اور ایسے مصارف مقرر کیے ہیں، جن کی اہمیت کو خاص طور سے صرف اسلام ہی نے محسوس کیا ہے۔

غلامی کا انسداد

غلامی انسان کے قدیم تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر تھی، یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی، غلاموں کے آزاد کرنے کے فضائل بتائے، ان کے ساتھ نیکی، احسان اور حسن سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک خاص حصہ اس کے لئے نامزد فرمایا کہ اس سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا جائے، لیکن چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زرفدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اس لئے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور سے اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی، انسانوں کے اس درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے کہ جس کی نظیر دنیا کے محسنین کی فہرست میں نظر نہیں آ سکتی۔ پیغمبر اسلام علیہ السلام کی شریعت نے صرف اس لئے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے، اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعہ سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔

مسافر

گزشتہ زمانہ میں سفر کی مشکلات اور دقتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بہ آسانی سمجھ میں آ سکتا ہے کہ مسافروں کی امداد اور ان کے لئے سفر کے وسائل و ذرائع کی آسانی کی کتنی ضرورت تھی۔ صحرا اور بیابان، جنگل اور میدان، آبادی اور ویرانی ہر جگہ آنے جانے والوں کا تانتا لگا رہتا تھا اور اب تک یہ سلسلہ قائم ہے، یہ وہ ہیں جو اپنے اہل و عیال، عزیز و اقارب، دوست و احباب، مال و دولت سے الگ ہو کر اتفاقات اور حوادث کے سیلاب سے بہہ کر کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں، ان کے پاس کھانے کے لئے کھانا، پینے کے لئے پانی، سونے کے لئے بستر، اوڑھنے کے لئے چادر نہیں ہوتی اور یہ حالت ہر انسان کو کسی نہ کسی وقت پیش آ جاتی ہے۔ اس لئے

ضرورت تھی کہ ان کے آرام وآسائش کا سامان کیا جائے ،اسی اصول پر سرائیں، کنوئیں، مسافرخانے پہلے بھی بنوائے جاتے تھے اور اب بھی بنوائے جاتے ہیں۔آپ کہہ سکتے ہیں کہ اب اس اسٹیم اور بجلی کے عہد میں یہ تمام مشکلیں افسانہ کہن اور داستان پارینہ ہوگئی ہیں، اب ہر جگہ اچھے سے اچھے ہوٹل، تیز سے تیز سواریاں، بڑے سے بڑے بنک اور آمدورفت کا سامان کرنے والی کمپنیاں قائم ہوگئی ہیں اور سفر وحضر میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔مگر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ جو کچھ ہوا ہے یہ صرف دولتمندوں اور سرمایہ داروں کی راحت وآسائش کے لئے ہوا اور ان کے ان نئے طریقوں نے پرانے طریقوں کے پرانے آثار کو حرف غلط کی طرح مٹا دیا ہے۔آج متمدن دنیا کے بڑے سے بڑے پر رونق شہروں سے لے کر معمولی دیہاتوں تک میں جہاں امیر اور دولتمند مسافروں کے لئے قدم قدم پر ہوٹل، ریستوران، قہوہ خانے اور آرام خانے موجود ہیں، وہاں اس پورے مسیحی ملک میں حضرت مسیح کی طرح ایک غریب مسافر کے لئے کہیں سر رکھنے کی جگہ نہیں۔کسی کی جیب میں جب تک کسی بنک کا نوٹ اور چیک نہیں اس کے لئے ہوٹلوں اور اقامت خانوں کے تمام دروازے بند ہیں۔کیا یہ انسانیت کے لئے رحم ہے؟ کیا یہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی ہے؟ لیکن ان تمام ملکوں کے طول و عرض میں جو محمد رسول اللہ ﷺ کے غلاموں کے قبضہ میں آئے سراؤں، مسافرخانوں، کنوؤں اور مہمان خانوں کا وہ وسیع سلسلہ قائم ہوگیا کہ ایک غریب مسلمان اسپین کے کنارہ سے چل کر کاشغر کے ایک گاؤں میں بہ آرام و آسائش پہنچ جاتا تھا اور ہندوستان کے اس سرے سے روم کے اس سرے تک اھلًا باھل و اوطانا باوطانٍ کہتا ہوا بے خطر چلا جاتا تھا اور آج بھی اس نظام کی بدولت ان اسلامی ملکوں میں جو ابھی یورپ کے سرمایہ دارانہ طور وطریق سے واقف نہیں ہیں۔غریب مسافروں کو وہی آرام وآسائش حاصل ہے اور امراء اور دولتمندوں کے لئے کیا کہنا کہ ایک پرانے جہاں گرد سیاح بزرگ (سعدی) کے مقولہ کے مطابق

منعم بکوہ و دشت و بیابان غریب نیست ہر جا کہ رفت خیمہ زد و بارگاہ ساخت

جماعتی کاموں کے اخراجات

جب تک منتشر افراد ایک شیرازہ میں نہیں بندھ جاتے، حقیقت میں جماعت کا وجود نہیں ہوتا، لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں، جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد جماعت اور اس کے اصول کی حفاظت کے لئے سرفروشانہ مجاہدہ کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، جماعت کی آمدورفت اور سفر کے وسائل کی ترقی وتعمیر، جماعت کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا، جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا جو جماعت کی مذہبی، علمی، تعلیمی، خدمات بجا لائیں اور اس رقم کی فراہمی اور نظم ونسق کے فرائض انجام دیں، زکوٰۃ اسی نظام جماعت کا سرمایہ دولت ہے۔

زکوٰۃ کے مقاصد،فوائد اور اصلاحات

زکوٰۃ کا اصلی اور مرکزی مقصد وہی ہے جو خود لفظ ''زکوٰۃ'' کے اندر ہے، زکوٰۃ کے لفظی معنی پاکی اور صفائی کے ہیں، یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا، قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنی میں بار بار آیا ہے۔سورۂ والشمس میں ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰىهَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰىهَا ۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۹۔۱۰)

''مراد پایا وہ جس نے اپنے نفس کو پاک وصاف کیا اور نامراد ہوا وہ جس نے اس کو میلا اور گندہ کیا۔''

ایک اور سورہ میں ہے:

﴿ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۝ ﴾ (۸۷/ الاعلی:۱۴)

''مراد پایا وہ جو پاک وصاف ہوا۔''

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کی ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے، جن کا ذکر قرآن پاک کی تین چار آیتوں میں آیا ہے:

﴿ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۹ و ۶۲/ الجمعۃ:۲)

''وہ نبی خدا کی آیتیں پڑھ کر ان کو سناتا ہے اور ان کو گناہوں سے پاک وصاف کرتا ہے اور ان کو کتاب اور حکمت کی باتیں سکھاتا ہے۔''

تزکیہ نفس

ان آیتوں سے اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی وصفائی کی اہمیت اسلام اور شریعت محمدی ﷺ میں کتنی ہے؟ یہ دل کی پاکی، روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔انسانوں کی روحانی ونفسانی بیماریوں کے بڑے حصہ کا سبب تو خدا سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے۔لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال ودولت اور دیگر اسباب دنیا سے دل کا تعلق ہے۔زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے، غزوۂ تبوک کے موقع پر جب بعض صحابہ رضی اللہ عنہم سے باغ وبستان کی محبت کے سبب سے، جو ان کی دولت تھی، غزوہ میں عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا ہے اور پھر ان کی صداقت اور سچائی کے باعث خدا نے ان کو معاف کیا ہے، وہاں محمد رسول اللہ ﷺ کو خطاب کر کے قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿ خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا ﴾ (۹/ التوبہ:۱۰۳)

''ان کے مالوں میں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک وصاف بنا۔''

اس آیت سے ثابت ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے، دل سے دور ہو جاتا ہے، بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہو جاتا ہے۔ مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے۔ دوسروں کے ساتھ ہمدردی کرنے کا جذبہ ابھرتا ہے۔ شخصی خود غرضی کی بجائے جماعتی اغراض کے لئے اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں، جن پر تہذیب نفس اور حسن خلق کی عمارت قائم اور جماعتی زندگی کا نظام ہے۔

قرآن مجید میں سود اور صدقہ میں جو حد فاصل قرار دی گئی ہے، وہ یہ ہے:

﴿ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ﴾ (۲/ البقرة: ۲۷۶)

''خدا سود کو گھٹاتا اور صدقہ کو بڑھاتا ہے۔''

لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ درحقیقت سود میں نقصان اور صدقہ کے مال میں اضافہ ہوتا ہے، کیوں کہ مشاہدہ بالکل برعکس ہے۔ بلکہ اخروی ثواب و گناہ اور برکت و بے برکتی کے فرق کے علاوہ اصلی مقصد اس سے یہ ہے کہ سود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے۔ لیکن جماعتی دولت کو برباد کر دیتا ہے۔ جس سے پوری قوم مفلس ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور قومی صدقہ و عطا سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام باقی رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے۔ اگر سود لینے والا کبھی اتفاقی مالی خطرہ میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لئے جماعت ایک انگلی تک نہیں ہلاتی۔ لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لئے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ سود خوار اس قدر حریص اور طماع ہو جاتے ہیں کہ ان کو مال کی کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے اور جو لوگ صدقہ اور زکوٰۃ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لئے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے۔ سود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے۔ آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک دفعہ قبضہ کر لیتا ہے۔ لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا، بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے۔ اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرت انگیز واقعہ کی پوری تصویر ہیں اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے۔ پھر ظاہر ہے کہ استغنا اور قناعت ایسی چیز ہے، جو تمام اخلاقی محاسن کا سنگ بنیاد ہے، بلکہ محمد رسول اللہ ﷺ نے نہایت بلیغ و حکیمانہ طریق سے یہ ارشاد فرمایا کہ

((ليس الغنى عن كثرة العرض ولكن الغنى غنى النفس)) [1]

''تونگری دولت کی کثرت کا نام نہیں ہے، بلکہ مال کی بے نیازی کا نام ہے۔''

---

[1] بخاري، كتاب الرقاق، باب الغنى غنى النفس: ٦٤٤٦۔

اس حدیث کا ترجمہ سعدی نے ان لفظوں میں کیا ہے، تو نگری بدل ست نہ بمال، دوسرے لفظوں میں یوں کہو کہ دولت آمدنی کی زیادتی کا نام نہیں بلکہ ضروریات کی کمی کا نام ہے، لیکن یہ غیر فانی دولت حرص وطمع سے نہیں، بلکہ صبر وقناعت کی بدولت حاصل ہوتی ہے۔ اس بنا پر کیا کسی کو زکوٰۃ وصدقہ کے مطہر مزکی اور مصلح اخلاق ہونے میں شبہ ہوسکتا ہے؟ سود خور کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے، وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں میں پھنسیں اور وہ ان کی اس حالت سے فائدہ اٹھائے۔ لیکن جو زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، وہ ہمیشہ قابل ہمدردی اشخاص کی ٹوہ میں لگے رہتے ہیں، تا کہ وہ اپنے مال ودولت سے اس کی مدد کر کے ان کے زخمِ دل پر مرہم رکھ سکیں۔

باہمی اعانت کی عملی تدبیر

زکوٰۃ اور صدقات کے مصارف کا بڑا حصہ غریبوں اور حاجت مندوں کی امداد ہے۔ انسانیت کا یہ وہ طبقہ ہے، جس کے ساتھ تمام مذہبوں نے ہمدردی کی ہے اور اس کی تسلی اور تسکین کے لئے دوسری دنیا کی توقع اور امید کے بڑے بڑے خوش آئند الفاظ استعمال کئے ہیں، لیکن یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اس کی زندگی کی یہ تلخی محض اہل مذاہب کی شیریں کلامی سے دور نہیں ہوسکتی۔ محمد رسول اللہ ﷺ دنیا کے پہلے اور وہی پچھلے پیغمبر ہیں جنہوں نے اس طبقہ کے ساتھ اپنی عملی ہمدردی کا ثبوت دیا اور اس کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کے لئے عملی تدبیر جاری اور نافذ فرمائی۔ خود اپنی زندگی غریبوں اور مسکینوں کی صورت سے بسر کی اور دعا فرمائی کہ ”خداوندا! مجھے مسکین زندہ رکھ، مسکین اٹھا اور مسکینوں ہی کے زمرہ میں میرا حشر کر۔“ آپ کے گھر کا چبوترہ (صفہ) غریبوں اور مسکینوں کی پناہ کا سایہ تھا، وہی آپ کی بزم قدس کے مقرب درباری اور اسلام کے معرکوں کے مخلص جانباز تھے۔ آپ کی نظر میں کسی انسان کی غربت اور تنگ دستی اس کی ذلت اور رسوائی کے ہم معنی نہ تھی۔ نہ دولت وامارت عزت ووقار کے مترادف تھی، بلکہ صرف نیکی اور پرہیز گاری فضیلت وبزرگی کا اصلی معیار تھی۔ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا کہ ”مبارک ہیں وہ جو دل کے غریب ہیں، کیوں کہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔“ [1] آنحضرت ﷺ نے اس سے زیادہ اختصار وایجاز کے ساتھ اس مطلب کو ادا فرمایا:

((ان المکثرین هم المُقلّوْن)) [2]

”جو دولت مند ہیں وہی غریب ہیں۔“

اس کے دوسرے معنی یہ ہوئے کہ جو غریب ہیں وہی دولت مند ہوں گے۔ پھر انہیں خوشخبری دی کہ غریب جن کو خدا کے آگے اپنی کسی دولت کا حساب نہیں دینا ہے، دولت والوں سے ۴۰ سال پہلے جنت میں داخل ہوں گے۔ [3] اسلام نے ان روحانی تسلیوں اور بشارتوں کے ساتھ جو مزید کام کیا، وہ ان کی دنیاوی

---

[1] متی ۵ - ۳؛ العہد الجدید، ص ۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب المکثرون هم المقلون: ٦٤٤٣۔

[3] جامع ترمذی، ابواب الزهد، باب ما جاء ان فقراء المهاجرين يدخلون الجنة قبل اغنياء هم: ٢٣٥٥۔

تکلیفوں اور مصیبتوں کو کم کرنے کی عملی تدبیریں ہیں۔ جن کا نام صدقہ اور زکوۃ ہے، اس کی تعلیم نے اس عملی ہمدردی اور اعانت کو صرف اخلاقی ترغیب و تشویق تک محدود نہیں رکھا، بلکہ اس کے لئے دو قسم کی تدبیریں اختیار کیں۔ ایک یہ کہ ہر مسلمان کو نصیحت کی جس سے جتنا ہو اپنی دولت سے ان کی مدد کرے۔ یہ اخلاقی خیرات ہے جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں انفاق ہے، لیکن چونکہ یہ اخلاقی خیرات ہر شخص کو اس ضروری نیکی پر مجبور نہیں کرتی اس لئے ایک مقدار معین کے مالک پر ایک ایسا قانونی محصول عائد کیا، جس کا سالانہ ادا کرنا اس کا مذہبی فرض ہے اور اس مجموعی رقم کا بڑا حصہ غریبوں اور محتاجوں کی امداد و اعانت کے لئے مخصوص کیا اور رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس تعلیم کو ایک ناقابل تغیر دستور العمل کے طور پر اپنی امت کو ہمیشہ کے لئے سپرد فرمایا۔ چنانچہ آپ نے معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب بنا کر یمن بھیجا تو توحید اور نماز کے بعد جس چیز کا حکم دیا وہ یہی زکوۃ ہے۔ پھر اس کی نسبت ان کو یہ ہدایت فرمائی کہ

((تؤخذ من اغنياء هم وترد على فقرائهم)) [1]

''وہ ان کے دولتمندوں سے لے کر ان کے غریبوں کو لوٹا دیا جائے۔''

صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ کی ہدایت کے بموجب ان دونوں قسموں کی خیراتوں پر اس شدت سے عمل کیا کہ جو استطاعت نہ بھی رکھتے تھے، وہ بازار جا کر مزدوری کرتے تھے، تاکہ جو رقم ہاتھ آئے وہ غریب و معذور بھائیوں کی اخلاقی اعانت میں خرچ کریں اور اس معاملہ میں خود آپ نے یہاں تک اس طبقہ کی دلجوئی کی فرمایا: ''اگر کسی کے پاس کچھ اور نہ ہو تو لطف و مہربانی سے بات کرنا ہی اس کا صدقہ ہے۔'' اس سے زیادہ یہ کہ اس کی بھی ممانعت کی گئی کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے، اس کو سختی سے واپس نہ کیا کرو خدا نے تعلیم دی:

﴿ فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ ۝ وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ ۝ ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۹۔۱۰)

''تو یتیم کو دبایا نہ کر اور نہ مانگنے والے کو جھڑک۔''

ساتھ ہی یہ بھی حکم دیا کہ اگر تم کسی حاجت مند کی مدد کرو تو اس پر احسان مت دھرو کہ وہ شرمندہ ہو، بلکہ خدا کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم کو یہ نعمت دی اور اس کی توفیق عنایت کی۔ احسان دھرنے سے وہ نیکی کا پیالہ حباب کی طرح ٹوٹ کر بیٹھ جائے گا فرمایا:

﴿ لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦٤)

''تم اپنی خیرات کو احسان دھر کر یا طعنہ دے کر برباد نہ کرو۔''

اس لطف، اس مدارات اور اس دلجوئی کے ساتھ محمد رسول اللہ ﷺ نے خدا کے حکم سے انسانیت کے قابل رحم طبقہ کی چارہ نوازی فرمائی اور ہم کو باہمی انسانی محبت اور ایک دوسرے کی مدد کا سبق پڑھایا۔ اگر یہ حکم

[1] صحیح بخاری، کتاب التوحید، باب ماجاء فی دعاء النبی ﷺ امته الی توحید الله تبارك وتعالیٰ: ۷۳۷۲ وکتاب الزکاۃ: ۱۳۹۵۔

صرف اخلاقی حیثیت سے یا صرف مبہم طریقہ سے ہوتا یا سب کو سب کچھ دے ڈالنے کا عام حکم دے دیا جاتا تو کبھی اس پر اس خوبی اس نظام اور اس پابندی کے ساتھ عمل نہ ہو سکتا اور آج بھی مسلمانوں کے سامنے یہ راہ کھلی ہوئی ہے اور کچھ نہ کچھ ہر جگہ اس پر عمل بھی ہے، یہی سبب ہے کہ مسلمانوں میں اگر امیر کم ہیں تو ویسے غریب محتاج بھی کم ہیں۔ جیسے دوسری قوموں میں نظر آتے ہیں، تاہم افسوس ہے کہ ایک مدت سے مسلمانوں کا یہ نظام سخت ابتری کی حالت میں ہے اور اس کی تنظیم کی طرف سے غفلت بڑھتی جارہی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارا ہر قسم کا جماعتی کام منتشر و پراگندہ ہے۔

دولت مندی کی بیماریوں کا علاج

دولت مندی اور تمول کا مسئلہ ہمیشہ سے دنیا کے مذاہب میں ایک معرکۃ الآراء بحث کی حیثیت سے چلا آرہا ہے، یہودیت کی طرح بعض ایسے مذہب ہیں جن میں نہ تو دولت مندی کی کوئی تحقیر کی گئی اور نہ مفلسی و غربت کو سراہا گیا ہے۔ بلکہ گویا اس بحث کو نامفصل چھوڑ دیا گیا ہے، لیکن عیسائیت اور بودھ مت دو ایسے مذہب ہیں، جن میں دولت کی پوری تحقیر کی گئی ہے۔ عیسائیت کی نظر میں دولت مندی اور تمول نجات کی راہ کا کانٹا ہے، بلکہ کوئی انسان اس وقت تک نجات نہیں پا سکتا، جب تک وہ سب کچھ جو اس کے پاس ہے، خدا کی راہ میں لٹا نہ دے۔ انجیل میں ہے کہ ایک نیکوکار دولت مند نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے نجات کا طریقہ دریافت کیا تو جواب میں فرمایا:

> ''اگر تو کامل ہوا چاہتا ہے تو جا کے سب کچھ جو تیرا ہے، بیچ ڈال اور محتاجوں کو دے کہ تجھے آسمان پر خزانہ ملے گا تب آ کے میرے پیچھے ہو لے۔''

وہ دولت مند یہ تعلیم سن کر غمگین ہو کر چلا گیا۔ تب انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

> ''میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ دولت مند کا آسمان کی بادشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے، بلکہ میں تم سے کہتا ہوں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گزر جانا اس سے آسان ہے کہ دولت مند خدا کی بادشاہت میں داخل ہو۔'' (متی ۱۹۔۲۱۔۲۴)

بودھ مت نے نیک لوگوں کو ترک دنیا کی تلقین کی ہے اور ہر قسم کی دولت سے پاک رہنے کی ہدایت کی ہے اور ایسے لوگوں کے لئے یہ سامان کیا ہے کہ جب وہ بھوکے ہوں تو بھیک کا پیالہ لے کر لوگوں کے دروازوں پر کھڑے ہو جائیں۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں طریقوں کو ناپسند فرمایا، اصل یہ ہے کہ اگر دولت ایسی بری چیز ہے تو اس برائی کو دوسروں کی طرف منتقل کر دینا ان کی خیر خواہی نہ ہوئی، دشمنی ہوئی اور اگر غربت کوئی برائی کی چیز ہے تو سب کچھ دوسروں کو دے کر خود اسی حال میں بن جانا کہاں کی دانشمندی اور اصلاح ہے، اس لئے یہ طریقہ ہر شخص کے لئے یکساں مفید نہیں ہے۔ نہ نفس دولت فرشتہ کو شیطان اور نہ نفس غربت

شیطان کو فرشتہ بناتی ہے، جس طرح دولت مندی دنیا میں ہزاروں سیہ کاریوں کی محرک ہے، اسی طرح غربت بھی دنیا کے ہزاروں جرائم کا باعث ہے اور ان دونوں خرابیوں سے انسانوں کو بچانا ایک نبوت عظمیٰ کا فرض تھا۔ دولت بہ حیثیت دولت اور غربت بہ حیثیت غربت نیک و بد اور خیر و شر دونوں صفتوں سے پاک ہے۔ بلکہ نیکی کرنے کی عام صلاحیت اور اہلیت کے لحاظ سے دیکھا جائے تو ایک نیکوکار دولت مند ایک نیکوکار غریب سے بدرجہا نیکی کے مواقع زیادہ رکھتا ہے، اسی لئے دولت اسلام کی نگاہ میں خدا کی ایک نعمت ہے۔ لعنت نہیں، ہنر ہے عیب نہیں، خیر ہے شر نہیں۔ چنانچہ قرآن پاک میں متعدد موقعوں پر دولت کو خیر اور فضل سے تعبیر کیا گیا ہے اور احادیث سے بھی دولت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔

چنانچہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی نے مرتے وقت یہ چاہا کہ اپنا سارا مال و اسباب خدا کی راہ میں دے دیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ "تم اہل و عیال کو غنی چھوڑ جاؤ، یہ اس سے بہتر ہے کہ وہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے پھریں۔" [1] آپ کے حلقہ بگوشوں میں دولت مند بھی تھے اور غریب بھی اور دونوں آپ کے دربار میں برابر کی حیثیت رکھتے تھے۔ ایک دفعہ غریبوں نے آ کر عرض کی کہ یارسول اللہ ﷺ! ہمارے دولت مند بھائی تو ہم سے سبقت لئے جاتے ہیں، ہم جو نیکی کے کام کرتے ہیں وہ، وہ بھی کرتے ہیں اور اس کے علاوہ وہ خیرات بھی کرتے ہیں، جو ہم نہیں کر پاتے۔ آپ نے ان کو ایک دعا سکھائی کہ یہ پڑھ لیا کرو۔ دولت مند صحابیوں نے یہ سنا تو وہ بھی وہ دعا پڑھنے لگے۔ غریبوں نے پھر جا کر عرض کی تو آپ ﷺ نے فرمایا: "یہ خدا کا فضل ہے جس کو چاہیے دے۔" [2]

آنحضرت ﷺ نے اس عظیم الشان مسئلہ کو جو دنیا میں ہمیشہ سے غیر منفصل اور ناطے شدہ چلا آ رہا تھا۔ اپنی روشن تعلیم اور تلقین کے ذریعہ سے ہمیشہ کے لئے حل کر دیا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے تقریر میں فرمایا کہ "لوگو! مجھے تمہاری نسبت جو ڈر ہے، وہ دنیا کے خیر و برکت کا ہے۔" صحابہ نے پوچھا، یارسول اللہ! دنیا کے خیر و برکت سے آپ کا کیا مقصود ہے؟ فرمایا: "دنیا کا باغ و بہار" (عیش و نشاط اور مال و دولت) ایک شخص نے کہا، یارسول اللہ ﷺ! کیا بھلائی سے بھی برائی پیدا ہوتی ہے؟ سائل کا منشا یہ تھا کہ دولت جو خیر و برکت ہے، وہ فتنہ کیوں کر ہو سکتی ہے۔ آپ نے سوال سن کر ذرا تامل کیا پھر پیشانی سے پسینہ کے قطرے پونچھے پھر فرمایا: "بھلائی سے بھلائی ہی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن دولت کی مثال ایک ہرے بھرے چراگاہ کی ہے، جس کو موسم بہار نے سرسبز و شاداب بنایا ہو، جب بعض جانور حرص و طمع میں آ کر حد اعتدال سے زیادہ کھا لیتے ہیں، تو دیکھو وہی خیر و برکت کی چیز ان کی ہلاکت اور موت کا باعث ہو جاتا ہے، لیکن جو جانور اس کو اعتدال سے چرتا ہے، جب اس کا پیٹ بھر جاتا ہے تو وہ دھوپ کے سامنے ہو جاتی ہے اور کچھ دیر جگالی کرتا ہے فضلہ باہر پھینک دیتا ہے اور

---

[1] بخاری، کتاب الوصایا، باب ان یترك ورثة اغنیاء خیر من ان یتکففوا الناس:۲۷۴۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الاذان، باب الذکر بعد الصلوة:۸۴۳؛ صحیح مسلم، کتاب المساجد، باب استحباب الذکر بعد الصلوة: ۱۳۴۷۔

پھر چرنے لگتا ہے، دولت ایک خوشگوار چیز ہے تو جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے خرچ کرے تو یہ دولت اس کے لئے بہترین مددگار ہے، لیکن جو شخص اس کو صحیح طریقہ سے حاصل نہیں کرتا، اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی کھاتا چلا جاتا ہے اور سیر نہیں ہوتا۔'' [1] اس تقریر میں آنحضرت ﷺ نے مسئلہ کے اہم نکتہ کو واضح فرمادیا اور بتادیا کہ نفس دولت خیر وشر نہیں ہے۔ بلکہ اس کا درست و نادرست طریقہ حصول اور جائز و ناجائز مصرف خیر وشر ہے۔ اگر درست طریقہ سے وہ حاصل کی جائے اور صحیح طریقہ سے خرچ کی جائے، تو وہ نیکیوں اور بھلائیوں کا بہتر سے بہتر ذریعہ ہے، اگر اس کے حصول وصرف کا طریقہ صحیح نہیں تو وہ بری اور شرانگیز ہے۔ اخلاقی محاسن و معائب امیر وغریب دونوں کے لئے یکساں ہیں۔ ایک سخی وفیاض ومتواضع امیر اور ایک قناعت پسند اور صابر و شاکر غریب اسلام کی نظر میں فضیلت کے ایک ہی درجہ پر ہیں، اسی طرح ایک متکبر، بخیل، امیر اور خوشامدی اور لالچی فقیر پستی کی ایک ہی سطح پر ہیں۔ اس لئے ضرورت تھی کہ دولت کی اجازت کے ساتھ ساتھ ایک طرف امرا اور دولت مندوں کے اخلاق کی اصلاح کی جائے اور دوسری طرف غریبوں اور فقیروں کی امداد اور دستگیری کے ساتھ ان کے اخلاق وعادات کو بھی درست کیا جائے، اسلام میں زکوۃ اسی عظیم الشان دوطرفہ اصلاح کا نام ہے۔

اس سلسلہ میں آنحضرت ﷺ کی تعلیم نے سب سے پہلے حصول دولت کے ناجائز طریقوں دھوکا، فریب، خیانت، لوٹ مار، جوا، سود وغیرہ کی سخت سے سخت ممانعت کی۔ سرمایہ داری کے اصول کی حمایت نہیں کی اور اس کا سب سے آسان ترین ذریعہ اور غریبوں کے لوٹنے کے سب سے عام طریقہ سود کو حرام مطلق اور خدا اور رسول سے لڑائی کے ہم معنی فرمایا۔ جو زمین یونہی پڑی ہوئی ہے اس کو جو بھی اپنی کوشش سے آباد و سیراب کرے اسی کی ملکیت قرار دی۔ چنانچہ فرمایا: ''زمین خدا کی ہے اور سب بندے خدا کے بندے ہیں، جو کسی مردہ زمین کو زندہ کرے وہ اسی کی ہے۔'' [2] متروکہ جائیداد کا مالک کسی ایک کو نہیں بلکہ بقدر استحقاق تمام عزیزوں کو اس کا حصہ دار بنادیا۔ ممالک مفتوحہ کو امیر اسلام کی شخصی ملکیت نہیں بلکہ پوری جماعت کی ملکیت قرار دیا۔ فطرت کی ان بخششوں کو جو انسانی محنت کی ممنون نہیں، جیسے پانی، تالاب، گھاس، چراگاہ، نمک کی کان، معدنیات وغیرہ جماعتی تصرف میں دیا اور بن لڑائی کے دشمنوں سے حاصل کی ہوئی زمینوں کو امراء اور دولت مندوں کے بجائے خالص غریبوں اور بیکسوں کا حق قرار دیا اور اس کی وجہ بھی ظاہر کردی، فرمایا:

﴿ مَآ اَفَآءَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ مِنْ اَهْلِ الْقُرٰى فَلِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ كَيْ لَا يَكُوْنَ دُوْلَةً بَيْنَ الْاَغْنِيَآءِ مِنْكُمْ ﴾ (۵۹/ الحشر: ۷)

''بستیوں والوں کی ملکیت سے اللہ جو اپنے رسول کو ہاتھ لگادے، وہ خدا اور اس کے رسول اور رشتہ داروں اور یتیموں اور غریبوں اور مسافروں کا حق ہے، تاکہ وہ اُلٹ پھر کر تم میں سے

---

[1] صحيح بخاری، كتاب الزكوة، باب الصدقة على اليتامى: ١٤٦٥؛ كتاب الرقاق، باب مايحذر من زهرة الدنيا: ٦٤٢٧۔ [2] مسند ابی داود الطیالسی، ص: ٢٠٤، الجزء السادس۔

دولتمندوں ہی کے لینے دینے میں نہ رہ جائے۔''

اس کے بعد اس سلسلہ میں دولت مندی کی سب سے بڑی بیماری بخل کو دنیا میں انسانیت کا بدترین مظہر اور آخرت میں بڑی سے بڑی سزا کا مستوجب قرار دیا اور جو اس گناہ سے پاک ہو، اسی کو کامیابی کی بشارت دی، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ ﴾ (۵۹/ الحشر:۹)

''اور جو اپنے جی کے لالچ سے بچایا گیا وہی لوگ ہیں مراد پانے والے۔''

بخل کا مبتلا دوسروں کے ساتھ بخل نہیں کرتا، بلکہ درحقیقت وہ خود اپنے ساتھ بخل کرتا ہے، وہ اس کی بدولت اس دنیا میں اپنے آپ کو ہر دلعزیزی اور نیک نامی بلکہ جائز آرام و راحت تک سے اور آخرت میں ثواب کی نعمت سے محروم رکھتا ہے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ يَّبْخَلْ فَاِنَّمَا يَبْخَلُ عَنْ نَّفْسِهٖ ۭ وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَاۗءُ ۚ ﴾ (۴۷/ محمد:۳۸)

''اور جو بخل کرتا ہے وہ اپنے آپ ہی سے بخل کرتا ہے، اللہ تو غنی ہے اور تم ہی محتاج ہو۔''

اس آیت پاک میں درپردہ یہ بھی واضح کر دیا کہ جس دولت کو تم اپنی سمجھتے ہو، وہ درحقیقت تمہاری نہیں، اصل مالک خدا ہے اور تم خود اس کے محتاج ہو، پھر جو شخص مال کا اصلی مالک نہ ہو، بلکہ محض امین ہو، وہ اصلی مالک کے حکم کے مطابق اس کو صرف نہ کرے اور یہ سمجھے کہ یہ خود اس کی ملکیت ہے اور اس کو اپنی ملکیت میں سے کسی کو کچھ دینے نہ دینے کا اختیار ہے، خائن اور بے ایمان نہ کہا جائے گا؟ درحقیقت یہی تصور کہ یہ مال میرا ہے اور میری شخصیت اور انانیت کی طرف اس کی نسبت ہے۔ دنیا کی تمام برائیوں اور بدیوں کی جڑ ہے، اس آیت پاک کی یہ تعلیم اسی جڑ کو کھودتی اور بیخ و بن سے اکھاڑ کر پھینک دیتی ہے۔ پھر دولت کے ان مجازی مالکوں اور امینوں کو یہ بتا دیا گیا کہ ان کو خدا کی عدالت میں اپنی دولت کے ایک ایک ذرہ کا حساب دینا پڑے گا، فرمایا:

﴿ ثُمَّ لَتُسْـَٔلُنَّ يَوْمَىِٕذٍ عَنِ النَّعِيْمِ ۝ ﴾ (۱۰۲/ التکاثر:۸)

''پھر اس دن تم سے تمہاری نعمت کا حساب پوچھا جائے گا۔''

اس لئے ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ وہ اپنی دولت کو کہاں اور کس طرح صرف کرتے ہیں، ان لوگوں کو جو اپنے روپے کی تھیلیوں کو اپنی نجات کا ذریعہ سمجھتے ہیں، تنبیہ کی:

﴿ وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةِۨ ۝ الَّذِيْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَهٗ ۝ يَحْسَبُ اَنَّ مَالَهٗٓ اَخْلَدَهٗ ۝ كَلَّا لَيُنْۢبَذَنَّ فِي الْحُطَمَةِ ۝ ﴾ (۱۰۴/ الھمزہ:۱۔۴)

''برائی ہو اس کی جو طعنہ دیتا اور عیب چنتا ہے، جو مال کو سینت کر رکھتا ہے اور اس کو گن گن کر وہ خیال کرتا ہے کہ اس کا مال اس کے ساتھ سدا رہے گا ہرگز نہیں۔''

فرمایا: ''رشک کرنا صرف دو آدمیوں پر جائز ہے ایک تو اس پر جس کو خدا نے علم دیا ہے اور وہ اس کے

مطابق شب و روز عمل کرتا ہے اور دوسرے اس پر جس کو خدا نے دولت دی ہے اور وہ اس کو دن رات خدا کی راہ میں خرچ کرتا ہے۔'' [1] جو لوگ سونے چاندی کو زمین میں گاڑ کر رکھتے ہوں اور کارِ خیر میں خرچ نہ کرتے ہوں ان کو خطاب کیا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ۙ﴾ (۹/ التوبۃ:۳۴)

''وہ لوگ جو سونا اور چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے، ان کو دردناک عذاب کی بشارت دے دو۔''

اس آیت پاک نے صحابہ میں دو فریق پیدا کر دیے، ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب خدا کی راہ میں خرچ کر دینا چاہیے۔ کل کے لئے کچھ نہ رکھنا چاہیے، ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت میں عذاب کا مستحق ہوگا۔ دوسرا کہتا تھا، خدا نے ہماری دولت میں جو حق واجب ٹھہرایا ہے (یعنی زکوٰۃ) اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع کرنا عذاب کا مستوجب نہیں۔ لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول و عمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی توراۃ میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمات اپنی اپنی جگہ پر صحیح و درست ہیں، لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے، اسی طرح دوسری تعلیم جو یقیناً ایک بلند روحانی تخیل ہے، مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے بہت زیادہ ہے۔ اسی لئے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لئے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے۔ اسلام نے خیرات کے درجے مقرر کر دیے، ایک قانونی اور دوسری اخلاقی، قانونی خیرات کی وہی مقدار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں ملحوظ تھی۔ یعنی نصف مثقال نقد میں اور عشر پیداوار میں، یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر واجب ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے۔ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ رضی اللہ عنہم میں دونوں قسم کے لوگ تھے، وہ بھی تھے جو کل کے لئے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے۔ جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ [2] اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں پر لا کر ڈال دیتے تھے۔ جیسے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ [3] اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک

---

[1] بخاری، کتاب العلم، باب الاغتباط فی العلم والحکمۃ: ۷۳۔

[2] بخاری، کتاب الزکوۃ، باب ما ادی زکوتہ فلیس بکنز: ۱۴۰۶۔ [3] ترمذی، ابواب المناقب: ۳۶۷۵۔

وقت لٹا دیتے تھے، جیسے حضرت عبدالرحمان بن عوف رضی اللہ عنہ [1] اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے۔ اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے۔ جیسے حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور بعض انصار کرام، خدا نے ان کی مدح فرمائی:

﴿ وَيُطْعِمُونَ الطَّعَامَ عَلَىٰ حُبِّهِ مِسْكِينًا وَيَتِيمًا وَأَسِيرًا ﴾ (۷٦/ الدھر:۸)

''اور وہ اپنی ذاتی حاجت کے باوجود اپنا کھانا مسکین اور یتیم اور قیدی کو کھلا دیتے ہیں۔''

﴿ وَيُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ ﴾ (۵۹/ الحشر:۹)

''اور وہ اپنے آپ پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں، اگرچہ وہ خود حاجت مند ہوں۔''

غرض محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے لئے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق نجات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لئے عملاً ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لئے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں، تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت شیخ شرف الدین یحییٰ منیری رحمہ اللہ اپنے مکتوبات میں اسلام کے اس آخری مرتبہ کمال کی تشریح ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

وایں طائفہ، جان و مال درباختہ اند و باہیچ کس ماسوا اللّٰہ نہ پر داختہ اند گفتۂ ایشاں است الفقیر مالُھم مباح و دمہ ھدر یعنی درویش صادق آن بود کہ بخون و مال ادعوی نبود ... اگر مالش برند خوش گرد گوید الحمد للہ کہ حجابے از پیش من برداشتند تا گفتہ اند زکوۃ نعمت دنیا نزدیک ایں طائفہ محمود نبا شد از آنکہ بخل ناستودہ است، و بخلی تمام باید درم را دربند کند، ویکسال محبوس دارد آنگاہ پنج درم ازاں بد ہد.

''اس فرقہ نے اپنی جان اور مال کو ہار دیا ہے اور خدا کے سوا کسی سے دل نہیں لگایا۔ اس کا مقولہ ہے کہ درویش وہ ہے جس کا مال وقف اور جس کا خون معاف ہو۔ اس کو اپنی جان و مال پر کوئی دعویٰ نہ ہو۔ اگر لوگ اس کا مال اُٹھا لے جائیں تو خوش ہو کہ الحمد للہ، اس کے اور خدا کے درمیان جو ایک پردہ پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ یہاں تک کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ دنیا کی دولت کو جمع کر

[1] اسد الغابۃ، ج۳، ص: ۳۱٦۔

کے زکوٰۃ دینا کچھ اچھا نہیں ہے۔ کیوں کہ بخالت تعریف کے قابل نہیں اور اس کے لئے کہ سال میں دو سو درہم جمع ہوں اور پھر وہ ایک سال تک بند پڑے رہیں، تب جا کر ایک سال کے بعد پانچ درہم ان میں سے خدا کی راہ میں دے، بڑی بخالت کی ضرورت ہے۔''

اس کے بعد حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک فتویٰ نقل کیا ہے:

یکے از فقہا برسبیل آزمانش شبلی رحمۃ اللہ علیہ را پرسید کہ زکوٰۃ درچند لازم آید گفت جواب بر مذہب فقیہاں خواہی، یا بر مذہب فقیراں؟ گفت بر ہر دو جواب فرما، شبلی رحمۃ اللہ علیہ گفت بر مذہب فقیہاں از دویست درم بعد از حولان حول پنجدرم باید داد و بر مذہب فقیراں درحال ہر دویست درم باید داد و جان بشکرانہ برسر بایدنہاد فقیہ گفت ما ایں مذہب از ائمہ دین گرفتیم شبلی گفت ما ایں مذہب ازصادق رب العالمین گرفتیم یعنی ابی بکر صدیق رضی اللہ عنہ او ہر چہ داشت پیش سید عالم ﷺ نہاد و جگر گوشہ خویشتن بشکرانہ داد۔ [1]

''کسی نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے، فرمایا فقہا کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقرا کے؟ کہا دونوں کے، فرمایا: فقہا کے مذہب کے مطابق ایک سال گزرنے پر دو سو درہم میں سے پانچ درہم اور فقرا کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو اور اس نذرانہ کی خوشی میں اپنی جان بھی سر پر رکھ کر پیش کرنی چاہیے۔ فقیہ نے کہا: ہم نے یہ مذہب ائمۂ دین سے حاصل کیا ہے، فرمایا: ہم نے یہ مسلک صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے حاصل کیا ہے کہ جو کچھ تھا وہ سب سرور عالم ﷺ کے سامنے رکھ دیا اور اپنی جگر گوشہ (حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا) کو شکرانہ میں دیا۔''

محمد رسول اللہ ﷺ کی ذاتی مثال اسی دوسرے فریق کے مطابق تھی۔ آپ کے پاس عمر بھر کبھی اتنا جمع نہ ہوا کہ زکوٰۃ کی نوبت آئے، جو کچھ ہوتا وہ اسی دن اہل استحقاق میں تقسیم ہو جاتا۔ اگر گھر میں رات کو سونے چاندی کے چند خزف ریزے بھی پڑے رہتے، تو گھر میں آرام نہ فرماتے۔ مگر عام امت کے لئے اپنے مسلک کو فرض نہیں قرار دیا، بلکہ اتنا ہی ان کے لئے مقرر کیا گیا جو ان کی قوت، استطاعت اور ہمت کے مطابق ہو، تاکہ نجات کا دروازہ غریبوں اور دولت مندوں کے ہر طبقہ کے لئے یکساں کھلا رہے اور اس لئے، تاکہ بے

[1] مکتوب: ٣٤؛ سہ صدی، ص: ٩١، ٩٢۔

قیدی وعدم پابندی لوگوں کی سستی اور عدم عمل کا باعث نہ ہو۔ مقدار معین کے مالک پر ایک رقم قانوناً فرض کی گئی، تاکہ جماعت کے مجبور و معذور افراد کی لازمی طور سے دستگیری ہوتی رہے۔

اشتراکیت کا علاج

دنیا میں امیر و غریب کی جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ ہر تمدن کے آخری دور میں قوم کے مختلف افراد کے درمیان دولت کی غیر مساوی صورت یقینی طور سے پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض طبقے نہایت دولت مند ہو جاتے ہیں جن کے خزانوں کے لئے زمین کا پورا طبقہ بھی کافی نہیں ہوتا اور دوسری طرف وہ غریب ہوتے ہیں جن کے پاس کھانے کے لئے ایک سوکھا ٹکڑا اور سونے کے لئے ایک بالشت زمین بھی نہیں ہوتی اور دولت مند طبقوں کی خود غرضی، خود پسندی اور عیاشی اس حد تک پہنچ جاتی ہے کہ وہ اپنے بھوکے اور ننگے بھائیوں کے لئے روٹی کا ایک ٹکڑا اور کپڑے کا ایک چیتھڑا تک دینے کے روادار نہیں ہوتے اور وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اتفاقی دولت خدا کی طرف سے نہیں، بلکہ ان کے علم و ہنر، سعی و کوشش اور دست و بازو سے حاصل ہوئی ہے۔ اس لئے ان سست و ناکارہ افراد کا اس میں کوئی حصہ نہیں۔ قارون کو جب زکوٰۃ و خیرات کا حکم ہوا تو اس نے جواب میں یہی کہا:

﴿ إِنَّمَآ أُوتِيتُهُۥ عَلَىٰ عِلْمٍ عِندِىٓ ۚ ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۸)

''مجھ کو تو ایک ہنر سے جو میرے پاس ہے یہ سب ملا ہے۔''

چنانچہ ہر زمانہ کے قارونوں کا اپنی دولت کے متعلق یہی تصور اور اعتقاد ہوتا ہے۔

یونان کے آخری دور میں یہی صورت پیدا ہوئی، ایران کے انتہائی زمانہ میں یہی شکل نمودار ہوئی، یورپ کی موجودہ فضا میں یہی آب و ہوا اقتصادی مشکلات کی ابر و باد کا طوفان اور سیلاب پیدا کر رہی ہے۔ مزدور سرمایہ دار کی جنگ پورے زور پر قائم ہے اور سوشلزم، کمیونزم، انارکزم اور بالشوزم کے طوفان جگہ جگہ اٹھ رہے ہیں، لیکن دنیا میں مساوات اور برابری پیدا کرنے کے لئے یہ دنیا کے نئے خاکے تیار کرنے والے جو نقشے بنا رہے ہیں وہ انسانی فطرت و تربیت کے اس درجہ مخالف ہیں کہ ان کی دائمی کامیابی حد درجہ مشکوک ہے۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی تعلیم نے دنیا کی اس مشکل کا اندازہ کر لیا تھا اور اس نے اسی کے حل کرنے کے لئے یہ اصول مقرر کر دیا کہ ذاتی و شخصی ملکیت کے جواز کے ساتھ جس کی انسانی فطرت متقاضی ہے، دولت و سرمایہ کو چند اشخاص کے ہاتھوں میں جانے سے روکا جائے۔ سود کو حرام قرار دیا، متروکہ جائداد کو صرف ایک ہی شخص کی ملکیت قرار نہیں دیا۔ نفع عام کی چیزیں اشخاص کے بجائے جماعت کی ملکیت قرار دیں۔ قیصریت اور شہنشاہیت کی بجائے جماعت کی حکومت قائم کی۔ زمینداری کا پرانا اصول جن میں کاشتکار غلام کی حیثیت رکھتا تھا، بدل دیا اور اس کی حیثیت اجیر اور مزدور کی رکھی۔ انسانی فطرت کے خلاف یہ نہیں کیا کہ سرمایہ کو لے کر تمام انسانوں میں برابر تقسیم کر دیا جائے، تاکہ دنیا میں کوئی ننگا اور بھوکا باقی نہ رہے، بلکہ یہ کیا کہ ہر سرمایہ دار پر جس

کے پاس سال کے مصارف کے بعد مقررہ رقم باقی بچ جائے اس کے غریب بھائیوں کی امداد کے لئے ایک سالانہ رقم قانونی طور سے مقرر کر دی، تاکہ وہ اس کے ادا کرنے پر مجبور ہو اور جماعت کا فرض قرار دیا کہ وہ اس رقم سے قابل اعانت لوگوں کی دستگیری کرے، یہی وہ راز ہے، جس کی بنا پر اسلام کے تمدن کا دور اس قسم کی اقتصادی مصیبتوں سے محفوظ رہا اور آج بھی اگر اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد ہو تو یہ فتنے زمین کے اتنے رقبہ میں، جتنے میں محمد رسول اللہ ﷺ کی روحانی حکومت ہے پیدا نہیں ہو سکتے، خلافت راشدہ کے عہد میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق کہ "جو لوگ سونا چاندی گاڑ کر رکھتے ہیں اور خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے" یہ فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے۔ [1] اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ ہو وہ خدا کی راہ میں دے دے اور شام کے دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان کی مخالفت کی اور فرمایا کہ ہم خدا کی راہ میں دے کر بچاتے ہیں تو حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی یہ آواز عام پسند نہ ہو سکی اور نہ عوام میں کوئی فتنہ پیدا کر سکی، کیوں کہ زکوٰۃ کا قانون پورے نظام کے ساتھ جاری تھا اور عرب کے آرام و آسائش کا یہ حال تھا کہ ایک زمانہ میں کوئی خیرات کا قبول کرنے والا باقی نہیں رہا۔ [2]

اقتصادی اور تجارتی فائدے

زکوٰۃ میں ان روحانی اور اخلاقی فائدوں کے ساتھ اقتصادی حیثیت سے دنیاوی فائدے کے پہلو بھی ملحوظ ہیں، اوپر گزر چکا ہے کہ زکوٰۃ انہیں چیزوں میں واجب ہوتی ہے جن میں دو صفتیں پائی جائیں، یعنی بقا اور نمو۔ بقا سے یہ مقصود ہے کہ وہ ایک مدت تک اپنی حالت پر باقی رہ سکیں، کیوں کہ ہر چیز ایسی نہ ہوگی اس کی تجارت میں نہ چنداں فائدہ ہے اور نہ دوسروں کے استعمال کے لئے دیر تک ذخیرہ بن سکتی ہے، اسی لئے سبزیوں اور ترکاریوں پر زکوٰۃ نہیں ہے اور نمو سے یہ مقصد ہے کہ ان میں یا تو پیداوار یا تناسل یا مبادلہ کی بنا پر افزائش کی صلاحیت ہو۔ اسی لئے جواہرات اور دیگر قیمتی معدنی پتھروں میں یا غیر مزروعہ زمین اور مکان میں بھی زکوٰۃ نہیں ہے، ان دونوں نکتوں سے یہ بات حل ہوتی ہے کہ شریعت نے زکوٰۃ کے فرض کرنے سے یہ مقصد بھی پیش نظر رکھا ہے کہ لوگ اپنے سرمایہ کو بیکار نہ رکھیں، بلکہ محنت، کوشش اور جدوجہد سے اس کو ترقی دیں ورنہ اصل سرمایہ میں سال بسال کمی ہوتی جائے گی جس کو فطرتاً کوئی برداشت نہیں کر سکتا، اس طرح زکوٰۃ کا ایک بالواسطہ مقصد یہ بھی ہے کہ تجارت و زراعت کو جو دولت کا اصل سرچشمہ ہیں ترقی دی جائے، کیوں کہ جب ہر شخص کو لازمی طور پر سال میں ایک خاص رقم ادا کرنا پڑے گی تو وہ کوشش کرے گا کہ جہاں تک ہو یہ رقم منافع سے ادا کرے اور اصل سرمایہ محفوظ رکھے، اسی بنا پر اسلام نے زکوٰۃ کو انہیں چیزوں کے ساتھ مخصوص کیا ہے جن

[1] مسند ابن حنبل، ج٥، ص: ١٧٦۔ [2] فتح الباری شرح بخاری، ج٦، ص: ٤٥١ و طبقات ابن سعد، ترجمۃ عمر بن عبدالعزیز، ص: ٢٥٦ جزء خامس فی اہل المدینۃ من التابعین۔

میں نمو اور اضافہ کی قابلیت ہو اور اسی بنا پر زکوٰۃ کے ادا کرنے کے لئے ایک سال کی وسیع مدت مقرر کی، تا کہ ہر شخص اپنے مال یا جائیداد سے کامل طور پر فائدہ اٹھا سکے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس نکتہ کو سمجھ کر ہمیشہ تجارت اور کاروبار میں مصروف رہتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں ان لوگوں کو جو یتیموں کے سرمایوں کے متولی تھے، ہدایت کی کہ وہ ان کو تجارت میں لگائیں، تا کہ ان کے بالغ ہونے تک ان کا اصل سرمایہ زکوٰۃ میں سب صرف نہ ہو جائے۔

یورپ نے بڑی تحقیق کے بعد ایشیا کے تجارتی اور تمدنی تنزل کی یہ وجہ بتائی ہے کہ یہاں مال کا اکثر حصہ بیکار زمین میں مدفون رکھا جاتا ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ ﷺ کی زبانِ وحی ترجمان نے آج سے تیرہ سو برس پہلے زکوٰۃ کو فرض کر کے یہ نکتہ بتا دیا تھا:

﴿ وَالَّذِيْنَ يَكْنِزُوْنَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنْفِقُوْنَهَا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۳۴)

”اور جو لوگ چاندی اور سونے کو گاڑ کر رکھتے ہیں اور اس کو خدا کی راہ میں نہیں صرف کرتے، ان کو سخت دردناک عذاب کی بشارت دو۔“

یہ دردناک عذاب قیامت میں تو جو کچھ ہو گا، وہ ہو گا اس دنیا میں بھی ان کے لئے اقتصادی دردناک عذاب یہ ہے کہ وہ اس مدفون سرمایہ کو دبا کر ملک کی دولت کو تباہ کرتے ہیں اور اس سے دولت کی افزائش اور ترقی کا کام لینے کے بجائے اس کو بیکار اور معدوم کر کے ملک کو فقر و محتاجی کے عذابِ الیم میں مبتلا کرتے ہیں اور بالآخر خود مبتلا ہوتے ہیں، اس لئے امرا کی اخلاقی اصلاح اور مالی ترقی اسی میں ہے کہ وہ اپنی دولت کو مناسب طور سے صرف کریں۔

فقرا کی اصلاح

اب دوسری طرف فقرا کا گروہ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ دنیا کے تمام شارعین مذاہب نے انسانوں کے اس قابل رحم فرقہ کی جانب ہمدردی اور ترحم کی نگاہ سے دیکھا ہے اور اس کی طرف امداد و اعانت کا ہاتھ بڑھایا ہے، مگر درحقیقت ان کے رحم، ہمدردی اور محبت کی مثال ایسی ہے، جیسے کسی کے پھوڑا یا زخم ہو اور اس کا دوست اس کی محبت اور خیر خواہی کی بنا پر ہمیشہ اس کے پھوڑے اور زخم کی حفاظت کرتا ہے کہ اس کو ٹھیس نہ لگے اور ٹوٹنے نہ پائے اور نہ کسی جراح کا نشتر اس کو چیرے کہ ان باتوں سے ان کو تکلیف ہو گی، کیا کوئی عقل مند کہہ سکتا ہے کہ اس نادان دوست کا یہ عمل اس کے ساتھ دوستی کا ثبوت ہو گا؟

گزشتہ مصلحین نے عموماً اس میں افراط و تفریط سے کام لیا ہے۔ بعض نے تو اس زخم میں صرف نشتر ہی لگایا ہے اور مرہم کا کوئی پھاہا نہیں رکھا۔ چنانچہ زردشتی مذہب میں سوال قطعاً ممنوع قرار دیا گیا ہے اور اس کے

بالمقابل بودھ مذہب میں اس زخم کو سرتاپا مادہ فاسد بننے دیا گیا ہے اور بھکشوؤں کا ایک مذہبی گروہ ہی سوال اور بھیک کے لئے پیدا کیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ اس زخم کو بھرنے اور پھوڑے کو دور کرنے کے لئے ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کئے ہیں۔ اس نے اس غمگین اور دردمند طبقہ کے زخم میں نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے، یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد واعانت کی تدبیریں ہیں، جو اس کے دل کی ڈھارس اور اس کی امیدوں کا سہارا ہیں اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دنائت، پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت سے بچانے کے لئے جاری کیں، اس نے اہل حاجت کے لئے دوسروں سے سوال اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی۔ لیکن ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔ عام طور سے اس قسم کا وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو اور غریبوں اور مسکینوں کو دے ڈالو۔ نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم اور رحم ومحبت کا نہایت بلند مظہر نظر آتا ہے، لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے آپ دولت مندوں کو سب کچھ غریبوں اور مسکینوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جود وسخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں، اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقے کو گداگری کی لعنت، بھیک مانگنے کی پستی اور دوسرے کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں، اس طرح ان کے لیے گداگری، دنائت، پستی، ذلت، سفلہ پن، کم ہمتی، نامردی اور تمام رذیل پست اخلاق کا گڑھا تیار کر رہے ہیں، جہاں یہ تمام نجاستیں آ کر جمع ہوں گی، کیا یہ انسانیت کے ساتھ رحم ہے؟ کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے؟ کیا یہ جنسِ بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

پیغمبر اسلام علیہ السلام کی بعثت کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لئے نہیں ہوئی، وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے مصلح اور معلّم بنا کر بھیجے گئے ہیں۔ غریب وامیر اور مسکین ودولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں، اس لیے آپ نے کسی ایک ہی طبقہ کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا۔ بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باٹ سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصّہ دیا ہے۔ یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک پل صراط ہے، جس پر نبیوں کے خاتم اور دینوں کے مکمل کے سوا دنیا کے کسی اخلاقی معلّم اور روحانی مصلح کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھ سکا۔ اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ اور خیرات اور دوسروں کی اعانت وہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امرا کا طبقہ اپنے اخلاقی معائب کی فراوانی اور کثرت سے ہلاک اور اخلاقی محاسن سے تمام تر تہی مایہ ہو جائے گا اور اگر غربا اور فقرا کو ہر قسم کی گداگری اور دریوزہ گری کی اجازت دے دی

جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ و برباد ہو جائے گی۔اسی لیے داعی اسلام ﷺ نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے خدا کی بتائی ہوئی وہ تعلیم پیش کی، جس سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر کو پیش اور اپنے اپنے نقائص اور کمزوریوں کو دور کرنے کی صورت ہاتھ آئی۔ایک طرف تو اسلام نے امرا اور دولتمندوں کے طبقہ کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَاَمَّا السَّآىِٕلَ فَلَا تَنْهَرْ﴾ (۹۳/ الضحیٰ:۱۰)

''مانگنے والے کو جھڑک نہ دے۔''

دوسری طرف خوددار و بے نیاز فقرا اور غریبوں کے طبقہ کی مدح فرمائی:

﴿ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِيْمٰهُمْ ۚ لَا يَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۳)

''ناواقف ان کی خودداری اور سوال کی ذلت سے بچنے کے سبب سے ان کو دولت مند سمجھتے ہیں تو ان کو ان کی پیشانی سے پہچانتا ہے، وہ لوگوں سے لپٹ کر نہیں مانگتے۔''

اور بھیک مانگنے کو خلافِ تقویٰ قرار دیا، جو لوگ بھیک مانگ کر حج کرتے تھے ان کو خطاب کر کے کہا:

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''اور زادِ راہ لے کر چلو کہ بہترین زادِ راہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے۔''

ایک طرف دولتمندوں کو فرمایا کہ تمہارا احسن اخلاق یہ ہے کہ جو تمہارے سامنے ہاتھ پھیلائے اس کو خالی مت لوٹاؤ ((وَلَوْ بِشِقِّ تَمْرَةٍ)) [1] ''اگرچہ چھوہارے کی ایک پھانک ہی کیوں نہ ہو۔'' دوسری طرف فقیروں کو فرمایا کہ ''تمہاری خودداری یہی ہونی چاہیے کہ کسی کے سامنے کبھی ہاتھ نہ پھیلاؤ کہ ((الید العلیا خیر من الید السفلی)) [2] ''اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔'' (یعنی لینے والے ہاتھ سے دینے والا ہاتھ بہتر ہے) یہ ہے وہ تعلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا اور دونوں کے لئے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔صدقہ و خیرات درحقیقت وہ پانی ہے، جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے تمام میل اور گندہ پن کو چھانٹ کر ان کو پاک و صاف بنا دیتا ہے۔لیکن وہ خود جب اس میل اور گندہ پن کو لے کر باہر نکلتا ہے تو حرص و طمع کے پیاسے اس کو چلو میں لے کر پینے لگتے ہیں، اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((ان هذه الصدقات انما هی اوساخ الناس)) [3]

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب اتقوا النار ولو بشق تمرۃ:۱۴۱۷۔ [2] ایضًا، باب لا صدقۃ الا عن ظهر غنی:۱۴۲۹۔ [3] مسلم، کتاب الزکوٰۃ، باب ترک استعمال آل النبی ﷺ علی الصدقۃ:۲۴۸۲۔

"یہ صدقہ تو لوگوں کا میل ہے۔"

اگر آج ان فقیروں اور گداگروں کی صورتوں اور سیرتوں پر نظر ڈالو جو استحقاق شرعی کے بغیر اس مال سے فائدہ اٹھاتے ہیں تو نظر آ جائے گا کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے اس کو لوگوں کے دلوں کا میل کہہ کر کتنی بڑی حقیقت کو آشکارا کیا ہے۔

حرص، طمع، لالچ، فریب، بے حیائی، بے غیرتی اور وہ تمام باتیں جو ان کے لازمی اخلاقی نتائج ہیں، ان میں سے کونسی چیز ہے۔ جو غیر مستحق ابناء السبیل، فقرا اور مہذب گداگروں کا تمغائے امتیاز نہیں اور درحقیقت یہی وہ میل ہے جو زکوۃ دینے والوں کے دامن سے چھٹ کر فقرا اور گداگروں کے دامن دل کو نجس بنا دیتا ہے۔ تاہم اس سے کون انکار کرسکتا ہے کہ بعض دفعہ قدرتاً ایسی مجبوریاں پیش آ جاتی ہیں، جب نفیس الطبع سے نفیس الطبع انسان کو اپنی جان بچانے کے لئے گندے سے گندہ اور میلے سے میلا پانی کے پی لینے پر مجبور ہونا پڑتا ہے اور اس وقت اس اجازت کی ضرورت پیش آتی ہے کہ ایسے مجبور اشخاص کو شخصی طور سے صدقہ وخیرات کے قبول کرنے کی اجازت دی جائے۔ شریعتِ محمدیہ نے اسی اصول پر اسی حیثیت سے لوگوں کو اس کے قبول کرنے کی اجازت دی ہے اور اس مجبورانہ قبول سے اس گروہ کے اخلاق وعادات پر جو برے اثرات طاری ہو سکتے ہیں، ان کے انسداد اور دفعیہ یا ان کو کم سے کم مضر بنانے کے لئے مفید تدابیر اختیار کی ہیں اور چند نہایت مناسب احکام جاری کئے ہیں جن کی تفصیل حسب ذیل ہے:

❶ اسلام کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ صدقہ اور زکوۃ کو خالصتاً لوجہ اللہ ادا کیا جائے، یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان کا بار رکھا جائے نہ اس کو ممنون کرم بنایا جائے، نہ عام مجمع میں اس کو ذلیل ورسوا کرنے کے لئے دیا جائے، کیوں کہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور دنائت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود اس طرح کے لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے اور بجائے اس کے کہ لینے والا اس طرح دینے والے کا ممنون ہو، اس کو اس کے اس فعل سے پہلے تو نفرت ہوگی، پھر رفتہ رفتہ شائد اس کی یہ اخلاقی حس غیرت اور شرمندگی کا شریفانہ جوہر ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے یا ان میں بڑے ظرف کے شریف النفس لوگ ہوں، وہ اپنی نظر میں اپنی ذلت آپ محسوس کر کے اپنی جان پر کھیل نہ جائیں۔

اسلام نے انہیں باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی کہ دینے والوں کے سامنے یہ نظریہ ہو کہ

﴿ إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا ۝ ﴾ (۷٦/ الدھر: ۹)

"ہم تم کو خدا کے لئے کھلاتے ہیں، ہم تم سے کوئی بدلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔"

اس شریفانہ تعلیم کو دیکھو کہ بدلہ تو کجا ہم کو تمہاری احسان مندی اور شکر گزاری بھی نہیں چاہیے۔ پھر صدقہ دینے والوں کو بہ تصریح بتا دیا کہ تمہارے احسان دھرنے، طعنہ دینے یا لینے والے کو ذلیل ورسوا کرنے سے

تمہارے اس عظیم الشان کارنامہ کی حقیقت باطل ہو جائے گی اور تمام ثواب حرف غلط کی طرح تمہارے نامہ اعمال سے مٹ جائے گا۔ فرمایا:

﴿ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَاۤ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَاۤ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَاۤ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرة:۲۶۳)

''جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں اور اس کے بعد نہ احسان جتاتے ہیں، نہ طعنہ دیتے ہیں، ان کا اجران کے خدا کے پاس امانت ہے اور نہ ان کو قیامت میں کوئی خوف ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے، کچھ نرمی کی بات کہہ کر اور چشم پوشی کر کے سائل کو ٹال دینا اس صدقہ سے بہتر ہے، جس کے بعد طعنہ دیا جائے یا احسان جتایا جائے، خدا تمہاری ایسی خیرات سے بے نیاز ہے اور تمہارے ایسے کاموں پر بردباری سے درگزر کرنے والا ہے۔''

اس حقیقت کو قرآن پاک نے ایک دل نشین تشبیہ سے واضح کیا ہے:

﴿ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُبْطِلُوْا صَدَقٰتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْاَذٰى ۙ كَالَّذِيْ يُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ تُرَابٌ فَاَصَابَهٗ وَابِلٌ فَتَرَكَهٗ صَلْدًا ؕ لَا يَقْدِرُوْنَ عَلٰى شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوْا ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرة:۲٦٤)

''مسلمانو! اپنے صدقوں کو احسان جتا کر اور طعنہ دے کر، برباد نہ کرو، جیسے کہ وہ اپنے صدقوں کو برباد کرتا ہے، جو محض لوگوں کے دکھلانے کو دیتا ہے اور خدا پر اور قیامت پر ایمان نہیں لاتا اس قسم کی خیرات کی مثال اس چٹان کی ہے جس پر کچھ گرد پڑی ہوئی ہو اور اس پر ایک پانی پڑ گیا ہو جس نے اس کو صاف اور چٹیل کر دیا کہ اب اس پر کوئی چیز جم نہیں سکتی ہے، ان لوگوں نے جو کام کیا اس سے کچھ فائدہ نہیں اٹھا سکے، خدا کافروں کو ہدایت یاب نہیں کرتا۔''

منجملہ اور اسباب کے یہ بھی ایک سبب ہے کہ اسلام نے زکوٰۃ ادا کرنے کا صحیح طریقہ یہ مقرر کیا کہ دینے والے خود کسی کو نہ دیں، بلکہ وہ اس کو امیر جماعت کے بیت المال میں جمع کریں اور وہ امیر حسب ضرورت مستحقین کو بانٹ دے، تا کہ اس طرح غریب لینے والا مگر شریف مسلمان ذاتی طور سے کسی دوسرے شخص کا ممنون احسان بن کر اپنی ذلت نہ محسوس کرے اور دینے والے کو ذاتی طور سے کسی پر منت رکھنے کا موقع نہ ملے اور اس طرح پوری قوم کا اخلاقی معیار اپنی پوری بلندی پر قائم رہے، ساتھ ہی یہ کہ فقرا اور معذوروں کو در بدر کی ٹھوکر کھانے کی رسوائی اور ہر ضرورت کے لئے ایک ایک پیسہ کی بھیک جمع کرنے کی ذلت سے بچایا جائے۔

2 اسی لیے صدقہ دینے کا دوسرا اصول اسلام نے یہ بتایا کہ صدقہ چھپا کر دیا جائے۔ کہ علانیہ دینے میں بھی سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے۔ کیوں کہ جب کسی کی ذلت اور فقر وفاقہ کی داستان عام ہو جاتی ہے تو پھر اپنے فعل سے اس کو غیرت اور شرم نہیں آتی اور اس لئے اس کا ڈر تھا کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار واعلان کا یہ طریقہ دنیا میں گداگری، دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشہ کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور یہ اخفا اور چھپا کر دینے کی صورت اس لئے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی لئے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''بہتر صدقہ وہ ہے کہ داہنے ہاتھ سے دو تو بائیں ہاتھ کو بھی خبر نہ ہو۔'' 1 لیکن بعض موقعے ایسے بھی ہیں کہ جہاں صدقہ خیرات اور زکوٰۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور تشویق دلانے کی خالص نیت ہو، یا خود وسائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کر بیٹھے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو۔ چنانچہ قرآن پاک نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا:

﴿ إِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَإِنْ تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۗ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۷۱)

''اگر تم صدقہ کو کھلم کھلا دو تو یہ بھی اچھا ہے لیکن اگر تم اس کو چھپا کر فقرا کو دو تو یہ بہت ہی بہتر ہے۔''

مفسرین نے اس آیت کی تفسیر میں صدقہ کے اخفا کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا ہے۔ مگر فرض زکوٰۃ کے لئے اس بنا پر اظہار واعلان کو مستحق قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رُکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب وتشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کئے جاتے ہیں، لیکن ہمارے نزدیک آیتِ کریمہ کا مفہوم صاف ہے۔ زکوٰۃ کے ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہدِ نبوی میں تھا، یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے، اس لئے اخفا کا جو فائدہ فقرا کے حق میں ہے، وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے اسی لئے جس آیت میں اعلان کی اجازت ہے، اس میں فقرا کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور جہاں اخفا کے ساتھ دینے کا ذکر ہے، وہاں فقرا کو دینے کی تصریح ہے۔ اس لئے اعلان اور اخفا کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے، بلکہ ادا کرنے کے طریقہ میں ہے کہ اگر بیت المال اور نائبین بیت المال کے ذریعہ سے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور وصول کرنے والے دونوں کا حساب پاک رہے اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے۔ لیکن اگر کسی سبب سے تم کو براہِ راست مستحقین کو دینا پڑے، جس میں حساب کتاب

---

1 صحیح مسلم، کتاب الزکوۃ، باب فضل اخفاء الصدقۃ: ۲۳۸۰۔

کی ضرورت نہیں اور براہ راست آپ ہی کو ان کو دینا ہے۔ بیت المال کا پردہ بیچ میں نہیں ہے، اس لئے تم پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دو، تا کہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت وخواری سے محفوظ رہے۔ پھر ترغیبِ اعلان اور اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوقِ اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی فقیہانہ ٹھوکروں کی ضرورت ہو، ورنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی ترغیب کے لئے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا۔ مگر آج تو یہ حالت ہے کہ معمولی سی معمولی رقم کے لئے جب تک اخباروں کے پورے کالم سیاہ نہ کر دیے جائیں، دینے والوں کے نزدیک خدا کو ان کے عطیہ کی خبر ہی نہیں ہوتی۔

3 تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے۔ بلند ہمتی کا اقتضا یہ ہے کہ مسلمان کی نگاہ بلند سے بلند نقطہ پر بھی پہنچ کر نہ ٹھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں، اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا کہ زکوۃ وصدقہ میں مال کا عمدہ اور بہتر حصہ دیا جائے، تا کہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو۔ کیوں کہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھور پن پیدا ہوگا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علو کے بجائے بخالت حرص اور کینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہوگی، کیوں کہ کوئی بری چیز کسی کو دے دینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا۔ بلکہ اس بیکار اور سڑی گلی چیز سے اپنے دامن اور صحن خانہ کو صاف کرنا ہوتا ہے، اس لئے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کی بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ روایتوں میں ہے کہ اصحاب صفہ کو جنہوں نے اپنی زندگی کا مقصد صرف اسلام کی خدمت اور خدا کی عبادت قرار دیا تھا، کسب معاش کا موقع نہیں ملتا تھا، اس لئے لوگ کھجوروں کے بدمزہ خوشے لا کر مسجدوں میں لٹکا دیتے تھے اور جب وہ گروہ بھوک کی شدت سے بے تاب ہو جاتا تھا تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھالیتا تھا، چونکہ یہ نہایت ذلیل حرکت تھی، اس بنا پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَنفِقُواْ مِن طَيِّبَٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ أَخْرَجْنَا لَكُم مِّنَ ٱلْأَرْضِ ۖ وَلَا تَيَمَّمُواْ ٱلْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِـَٔاخِذِيهِ إِلَّآ أَن تُغْمِضُواْ فِيهِ ۚ وَٱعْلَمُوٓاْ أَنَّ ٱللَّهَ غَنِىٌّ حَمِيدٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲٦۷)

''مسلمانو! اپنی کمائی سے اور اس چیز سے جو تمہارے لئے ہم نے زمین سے نکالی ہے۔ بہتر حصہ خیرات کرو اور ان میں سے ردّی مال کی خیرات کا قصد نہ کرو۔ حالانکہ اگر وہی تم کو دیا جائے تو خود تم نہ لو گے، لیکن یہ کہ چشم پوشی کر جاؤ اور یقین کرو کہ خدا تمہاری اس قسم کی خیرات سے بے نیاز ہے اور وہ خوبیوں والا ہے۔ (خوبیوں ہی والی چیز پسند کرتا ہے)۔''

❹ فقرا اور مساکین کی دنائت اور حرص وطمع کے زائل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ انہیں لوگوں کو زکوٰۃ اور صدقہ کا حقیقی مستحق قرار دیا جائے جو باوجود تنگ دستی اور بے بضاعتی کے خودداری اور قناعت کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، کیوں کہ جب قوم کی توجہ اس قسم کے اشخاص کی طرف مبذول ہوگی تو ہر شخص خود بخود ان اخلاق کی تقلید پر مجبور ہوگا، صحابہ کرام میں سب سے زیادہ مفلس اور نادار اصحاب صفہ تھے۔ لیکن ان کی خودداری اور قناعت کا یہ حال تھا کہ پریشانی صورت کے علاوہ کوئی چیز ان کے فقر وفاقہ کا راز فاش نہیں کر سکتی تھی۔ اس بنا پر اسلام نے ان کو زکوٰۃ کا بہترین مستحق قرار دیا:

﴿ لِلْفُقَرَآءِ الَّذِیْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ ۡ یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ تَعْرِفُهُمْ بِسِیْمٰهُمْ ۚ لَا یَسْـَٔلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا ؕ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۷۳)

”صدقہ ان فقرا کے لئے ہے جو خدا کی راہ میں گھرے ہوئے ہیں۔ (بغرضِ معاش وتجارت) سفر کی قدرت نہیں رکھتے جو لوگ ان سے ناواقف ہیں، خودداری اور عدم سوال کی وجہ سے ان کو مالدار سمجھتے ہیں، تم صرف ان کے بشرہ سے ان کو پہچانتے ہو، وہ لوگوں سے گڑگڑا کر کچھ نہیں مانگتے۔“

آج مسلمانوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا ہے، جس کا یہ نتیجہ ہے کہ سینکڑوں شریف آدمی در در کی ٹھوکریں کھاتے ہیں اور قوم اور خاندان کا نام بیچتے ہیں۔

❺ لیکن بایں ہمہ جزم واحتیاط گداگری درحقیقت ایک نہایت مبتذل شیوہ ہے، اس بنا پر اسلام نے سخت مجبوری کی حالت میں اس کی اجازت دی اور جہاں تک ممکن ہوا لوگوں کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے بعضوں سے اس کی بیعت بھی لی کہ وہ کسی سے کچھ نہیں مانگیں گے انہوں نے اس بیعت کی اس شدت سے پابندی کی کہ راستہ میں اگر ان میں سے کسی کا کوڑا گر جاتا تھا تو بھی وہ کسی سے نہیں کہتے تھے کہ اٹھا دو۔ ❶ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا: ”جو شخص مجھ سے یہ ضمانت کرے کہ وہ کسی سے مانگے گا نہیں تو میں اس کے لئے جنت کی ضمانت کرتا ہوں۔“ آپ کے آزاد کردہ غلام ثوبان بولے، میں یہ ضمانت کرتا ہوں۔ چنانچہ اس کے بعد وہ کبھی کسی سے کچھ نہیں مانگتے تھے۔ ❷

حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ ایک صحابی تھے۔ انہوں نے ایک دفعہ آنحضرت ﷺ سے سوال کیا، آپ نے عنایت کیا، پھر مانگا، پھر دیا، پھر تیسری دفعہ یہ صورت پیش آئی تو فرمایا: ”اے حکیم! یہ مال بظاہر نہایت شیریں اور خوش رنگ چیز ہے، جو اس کو شرافت کے ساتھ لے گا اس کو اس میں برکت دی جائے گی اور جو لالچ کے ساتھ لے گا اس کو برکت نہ ملے گی اور اس کی حالت ایسی ہوگی جیسے کوئی کھاتا چلا جائے اور اس کا پیٹ نہ بھرے، اوپر کا ہاتھ نیچے کے ہاتھ سے بہتر ہے۔“ حکیم نے کہا، یارسول اللہ! آج سے میں پھر کسی سے کچھ نہ

❶ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب کراهیة المسئلة:١٦٤٢۔ ❷ ایضا: ١٦٤٣۔

مانگوں گا۔اس کے بعدان کا یہ حال ہوا کہ خلافت راشدہ کے زمانہ میں خلفا ان کو اپنا وظیفہ لینے کے لئے بلاتے تھے اور وہ انکار کرتے رہے اور آخر تک اس انکار پر قائم رہے۔ ❶

اس کی اور متعدد مثالیں ہیں اس عمومی ممانعت کے ساتھ خصوصیت سے ان تمام لوگوں کے لئے جو صاحب دست و بازو ہوں، یعنی جن کے ہاتھ پاؤں اور آنکھیں صحیح وسالم ہوں، بھیک مانگنے سے سخت ممانعت کر دی گئی، فرمایا کہ

((لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مِرّة سویّ)) ❷

''غیر محتاج اور صحیح وسالم آدمی کے لئے بھیک مانگنا حلال نہیں۔''

صحیح بخاری میں ہے کہ، آپ ﷺ نے فرمایا:

((والذی نفسی بیده لأن یاخذ احدکم حبله فیحتطب علی ظهره خیر له من ان یأتی رجلاً فیسأله أعطاه او منعه)) ❸

''قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ تم میں کسی کا رسی لے کر اپنی پیٹھ پر لکڑی کا بوجھ اٹھانا، اس سے بہتر ہے کہ دوسرے سے بھیک مانگے وہ اسے دے یا نہ دے۔''

آنحضرت ﷺ نے اپنے زمانہ میں اس پر عمل بھی فرمایا۔ایک دست نگر صحابی نے خیرات مانگی آپ ﷺ نے فرمایا: ''تمہارے پاس کچھ ہے؟'' عرض کی، ایک ٹاٹ اور ایک پیالہ ہے۔آپ نے ان کو منگوا کر نیلام کیا اور ان کی قیمت سے ایک کلہاڑی خرید دی اور فرمایا کہ ''جنگل سے لکڑی کاٹ لاؤ اور بیچو۔'' انہوں نے اس پر عمل کیا تو خدا نے ان کو یہ برکت دی کہ وہ گداگری کی ذلت سے ہمیشہ کے لئے بچ گئے۔ ❹

❻ لیکن جو لوگ بدقسمتی سے کسب معاش نہیں کر سکتے۔ان کو بھی الحاح، کثرت سوال، لجاجت اور گڑگڑا کر زبردستی مانگنے کی نہایت سختی کے ساتھ ممانعت کی، آپ ﷺ نے فرمایا:

((لیس المسکین الذی ترده الا کلة والا کلتان ولکن المسکین الذی لیس له غنی ویستحی او لا یسأل الناس الحافا)) ❺

''مسکین وہ نہیں ہے جس کو لقمہ دو لقمے دروازوں سے واپس لوٹا دیتے ہیں۔مسکین وہ ہے جو گو بے نیاز نہیں ہے، لیکن حیا کرتا ہے اور لوگوں سے گڑگڑا کر نہیں مانگتا۔''

پھر یہ بھی بتا دیا کہ گداگری اور بھیک کا طریقہ جو سخت مجبوری کی حالت کے علاوہ ہو، وہ ہر حال میں

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب الاستعفاف عن المسئلة: ۱٤۷۲۔ ❷ ترمذی، کتاب الزکوٰۃ، باب ماجاء من لا تحل له الصدقه:۲ ۱۵۲۔ ❸ کتاب الزکوٰۃ، باب الا ستعفاف عن المسئلة: ۱٤۷۰۔

❹ ابوداود، کتاب الزکوٰۃ، باب ماتجوز فیه المسئلة:۱٦٤۱۔

❺ بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب قول اللّٰه عزوجل: لا یسألون الناس الحافا: ۱٤۷٦۔

انسان کی شرم وحیا اور غیرت وآبرو کو برباد کردیتا ہے، فرمایا:

((ما زال الرجل يسئل الناس حتى يأتي يوم القيامة ليس في وجهه مزعة لحم)) [1]

"آدمی ہمیشہ مانگتا پھرتا ہے، یہاں تک کہ وہ قیامت کے روز اس طرح آئے گا کہ اس کے چہرہ پر گوشت کا ایک ٹکڑا نہ ہوگا۔"

یہ اس کی سزا ہوگی کہ اس نے دنیا میں مانگ مانگ کر اپنے چہرہ سے عزت وآبرو کی رونق خود دھودی تھی۔

ان ضروری اصلاحات کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے نظام کو قائم کیا اور ان تمام برائیوں اور بداخلاقیوں کی جڑ کاٹ دی جو اس مفت خوری سے انسانوں میں پیدا ہوسکتی تھیں اور ساتھ ہی انسانی برادری کے دونوں طبقوں کو ترازو کے پلڑے میں برابر رکھ کر ان کو باہمی معاونت، باہمی مشارکت، باہمی ہمدردی اور امداد کا سبق سکھایا اور اس طرح پوری جماعت انسانی کو باہم جوڑ کر ایک کردیا۔ پست وبلند کے تفرقے ممکن حد تک کم کردیے اور اس اقتصادی بربادی سے جماعت کو محفوظ رکھنے کا طریقہ بتادیا جو اکثر اپنی بھیانک شکلوں سے اس کو ڈرایا کرتی ہے۔

آنحضرت ﷺ کی اس تعلیم کا نتیجہ یہ ہوا کہ دولت مند صحابہ رضی اللہ عنہم میں یہ فیاضی آگئی کہ وہ دین وملت کی خدمت کے لئے اپنی ساری دولت لٹا کر بھی سیر نہ ہوتے تھے اور غریب صحابیوں میں یہ قناعت اور خودداری پیدا ہوگئی کہ وہ کسی سے کسی کام کا سوال کرنا بھی عیب سمجھتے تھے۔ دولت مند اپنی زکوٰۃ آپ لے کر بیت المال کے دروازوں تک خود آتے تھے اور غریب اپنے افلاس وحاجت کو خدا کے سوا دوسروں کے سامنے پیش کرنا توکل کے منافی سمجھتے تھے اور تیسری طرف آنحضرت ﷺ کے بعد جب فراغت آئی تو جماعت کے بیت المال میں اتنا سرمایہ رہتا تھا کہ زکوٰۃ کے کسی مصرحہ مصرف کے لئے کمی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ ضرورت مندوں کو اسی رقم سے قرض بھی دیا جاتا تھا [2] اس طرح یہ ایک ایسا مالی واقتصادی نظام تھا کہ بلانفع قرض دینے میں افراد کو جو تامل ہوتا ہے، وہ اس جماعتی نظام کے ماتحت آسان تھا اور سود کی لعنت کے بغیر داد وستد کا راستہ کھلا ہوا تھا۔

---

[1] بخاری، کتاب الزکوٰۃ، باب من سأل الناس تكثرا: ١٤٧٤۔

[2] تفسير كبير، سورة توبة، ج ٤، ص: ٦٨١۔

روزہ

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

روزہ کا مفہوم

روزہ اسلام کی عبادت کا تیسرا رکن ہے، عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں، جس کے لفظی معنی رکنے اور چپ رہنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تفسیروں کے مطابق قرآن پاک میں اس کو کہیں کہیں ''صبر'' بھی کہا گیا ہے، جس کے معنی ضبط نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزہ کا کیا مفہوم ہے؟ وہ درحقیقت نفسانی ہوا و ہوس اور بہیمی خواہشوں سے اپنے آپ کو روکنے اور حرص و ہوا کے ڈگمگا دینے والے موقعوں میں اپنے آپ کو ضابطہ اور ثابت قدم رکھنے کا نام ہے۔ روزانہ استعمال میں عام طور سے نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں، یعنی کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات، انہیں سے ایک مدت متعینہ تک رکے رہنے کا نام شرعاً روزہ ہے۔ لیکن دراصل ان ظاہری خواہشوں کے ساتھ باطنی خواہشوں اور برائیوں سے دل اور زبان کا محفوظ رکھنا بھی خواص کے نزدیک روزہ کی حقیقت میں داخل ہے۔

روزہ کی ابتدائی تاریخ

روزہ کی ابتدائی تاریخ معلوم نہیں۔ انگلستان کا مشہور حکیم ہربرٹ اسپنسر اپنی تصنیف پرنسپلز آف سوشیالوجی (اصول معاشرت) میں چند وحشی قبائل کی تمثیل اور استقرا کی بنا پر قیاس کرتا ہے کہ روزہ کی ابتدا اصل میں اسی طرح ہوئی ہوگی کہ لوگ وحشت کے زمانہ میں خود بھوکے رہتے ہوں گے اور سمجھتے ہوں گے کہ ہمارے بدلہ ہمارا کھانا اس طرح مردوزن کو پہنچ جاتا ہے۔ لیکن یہ قیاس ارباب خرد کی نگاہ میں سند قبول حاصل نہ کر سکا۔ [1] بہرحال مشرکانہ مذاہب میں روزہ کی ابتدا اور حقیقت کے خواہ کچھ ہی اسباب ہوں، لیکن اسلام کا روزہ اپنی ابتدا اور غایت کی تشریح میں اپنے پیروؤں کی وکالت کا محتاج نہیں، وہ بہ آواز بلند مدعی ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُتِبَ عَلَيْكُمُ ٱلصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى ٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''مسلمانو! روزہ تم پر اسی طرح فرض ہوا جس طرح تم سے پہلی قوموں پر فرض کیا گیا، تاکہ تم پرہیزگار بنو۔''

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ ٱلَّذِىٓ أُنزِلَ فِيهِ ٱلْقُرْءَانُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنَٰتٍ مِّنَ ٱلْهُدَىٰ وَٱلْفُرْقَانِ ۚ فَمَن شَهِدَ مِنكُمُ ٱلشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَن كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ ٱللَّهُ بِكُمُ ٱلْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ ٱلْعُسْرَ وَلِتُكْمِلُوا۟ ٱلْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا۟ ٱللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَىٰكُمْ

[1] انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا، ج ۱۰، ص: ۱۹۴ طبع ۱۱۔

وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

”ماہ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن اتارا گیا جو انسانوں کے لیے سرتاپا ہدایت، ہدایت کی دلیلیں اور حق و باطل میں فارق بن کے آیا تو جو اس رمضان کو پائے وہ اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے، اور جو بیمار ہو یا سفر پر ہو وہ دوسرے دنوں میں رکھ لے۔ خدا آسانی چاہتا ہے سختی نہیں، تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور (یہ روزہ اس لیے فرض ہوا) تاکہ تم خدا کے اس ہدایت دینے پر اس کی بڑائی کرو اور تاکہ تم شکر بجالاؤ۔“

ان آیات پاک میں نہ صرف روزہ کے چند احکام بلکہ روزہ کی تاریخ، روزہ کی حقیقت، رمضان کی ہیئت اور روزہ پر اعتراض کا جواب یہ تمام امور مفصل بیان ہوئے ہیں، ذیل کے صفحات میں بہ ترتیب ہم ان پر روشنی ڈالتے ہیں۔

روزہ کی مذہبی تاریخ

قرآن پاک نے ان آیتوں میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اسلام سے پہلے بھی وہ کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جزو رہا ہے۔ جاہل عرب کا پیغمبر امی ﷺ جو بقول مخالفین عالم کی تاریخ سے ناواقف تھا، وہ مدعی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب میں روزہ فرض عبادت رہا ہے۔ اگر یہ دعویٰ تمام تر صحت پر مبنی ہے تو اس کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے؟ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزہ (فاسٹنگ) کے بارے میں لکھتا ہے:

”روزہ کے اصول اور طریقے گو آب و ہوا قومیت و تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں، لیکن بہ مشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں، جس کے مذہبی نظام میں روزہ مطلقاً تسلیم نہ کیا گیا ہو۔“

آگے چل کر لکھتا ہے:

”گو کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔“

ہندوستان کو سب سے زیادہ قدامت کا دعویٰ ہے، لیکن برت یعنی روزہ سے وہ بھی آزاد نہیں، ہر ہندی مہینہ کی گیارہ بارہ کو برہمنوں پر اکادشی کا روزہ ہے۔ اس حساب سے سال میں چوبیس روزے ہوئے۔ بعض برہمن کاتک کے مہینہ میں، ہر دوشنبہ کو روزہ رکھتے ہیں۔ ہندو جوگی چلہ کشی کرتے ہیں، یعنی چالیس دن تک اکل و شرب سے احتراز کرتے ہیں۔ ہندوستان کے تمام مذاہب میں جینی دھرم میں روزہ کے سخت شرائط ہیں۔ چالیس چالیس دن تک کا ان کے یہاں ایک روزہ ہوتا ہے۔ گجرات و دکن میں ہر سال جینی کئی کئی ہفتہ کا

روزہ رکھتے ہیں۔قدیم مصریوں کے ہاں بھی روزہ دیگر مذہبی تہواروں کے شمول میں نظر آتا ہے۔یونان میں صرف عورتیں تھموفیریا کی تیسری تاریخ کو روزے رکھتی ہیں، پارسی مذہب میں گو عام پیروؤں پر روزہ فرض نہیں لیکن ان کی الہامی کتاب کی ایک آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ روزہ کا حکم ان کے ہاں موجود تھا،خصوصاً مذہبی پیشواؤں کے لیے تو پنج سالہ روزہ ضروری تھا۔ [1] یہودیوں میں بھی روزہ فریضۂ الٰہی ہے۔حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کوہ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے۔(خروج ۳۴۔۲۸ العہد القدیم،ص:۱۴۵) چنانچہ عام طور سے یہود حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے ہیں۔لیکن چالیس دن کا روزہ ان پر فرض ہے۔جو ان کے ساتویں مہینہ (تشرین) کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لیے اس کو عاشورہ (دسواں) کہتے ہیں یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا،جس میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کے دس احکام عنایت ہوئے تھے۔اسی لیے تورات میں اس دن کے روزہ کی نہایت تاکید آئی ہے۔ [2] اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں۔ [3]

عیسائی مذہب میں آکر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔چنانچہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ [4] حضرت یحییٰ علیہ السلام جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے گویا پیشرو تھے،وہ بھی روزے رکھتے تھے اور ان کی امت بھی روزہ دار تھی۔ [5] یہود نے مختلف زمانوں میں مختلف واقعات کی یادگار میں بہت سے روزے بڑھا لیے تھے اور وہ زیادہ تر،غم کے روزے تھے اور اس غم کو ظاہر کرنے کے لیے اپنی ظاہری صورت کو بھی وہ اداس اور غمگین بنا لیتے تھے [6] حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اپنے زمانے میں غم کے ان مصنوعی روزوں کو منع کر دیا۔غالباً اسی قسم کے کسی روزہ کا موقع تھا کہ بعض یہودیوں نے آکر حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اعتراض کیا کہ بڑے شاگرد کیوں روزہ نہیں رکھتے۔حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا:

> ”کیا براتی جب تک دولہا ان کے ساتھ ہے،روزہ رکھ سکتے ہیں،جب تک دولہا ان کے پاس ہے،روزہ نہیں رکھ سکتے پر وہ دن آئیں گے کہ جب دولہا ان سے جدا کیا جائے گا،تب انہیں دنوں میں روزہ رکھیں گے۔“ (مرقس ۲۔۱۸۔۱۹و۲۰ العہد الجدید، ص: ۵۹)

اس تلمیح میں دولہا سے مقصود خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ مبارک اور براتی سے مقصود ان کے پیرو اور حواری ہیں،ظاہر ہے کہ جب تک پیغمبر علیہ السلام اپنی امت میں موجود ہے،امت کو غم منانے کی ضرورت نہیں۔ انہیں فقروں سے ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے موسوی شریعت کے فرض و مستحب روزوں کو نہیں بلکہ غم کے

---

[1] ان تمام حوالوں کے لیے دیکھو انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا،جلد ۱۰،صفحہ:۱۹۳،۱۹۴ طبع یازدہم۔ [2] تورات، سفر الاحبار: ١٦ـ٢٩ـ٣٤ و ٢٣ـ٢٧، ص: ١٩٦ (لاويين) العهد القديم، ص: ١٧٥ـ [3] سموايل اول: ٧ـ٦؛ العهد القديم، ص: ٤٣٦؛ ويرميا: ٣٦ـ٦، ص: ١١٣٤ـ [4] متى: ٤ـ٢؛ العهد الجديد، ص: ٦ـ
[5] مرقس: ٢ـ١٨؛ العهد الجديد، ص: ٥٩ـ [6] قضاة: ٢٠ـ٢٦ ص: ٤١٦؛ العهد القديم سموائيل اول: ٧ـ٦؛ العهد القديم، ص: ٤٣٦ و ٣١ـ١٣ ص: ٤٨١ ولوقا ٦ـ١٦ وغيره ـ

مبتدعانہ روزوں کو منع فرمایا۔ انہوں نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے، چنانچہ آپ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں:

''پھر جب تم روزہ رکھو ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ، کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور منہ دھوؤ، تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے، روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔'' (متی ٦۔ ١٦ و ١٧ العهد الجديد، ص: ١١)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید روحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں۔ وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں:

''یہ جنس سوائے دعا اور روزہ کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی۔'' (متی ١٧۔ ٢١ العهد الجديد: ٣٢)

اہل عرب بھی اسلام کے پہلے سے روزہ سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا (یعنی دسویں محرم کو) اس لیے روزہ رکھتے تھے کہ اس دن خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ [1] مدینہ میں یہود اپنا عاشورا الگ مناتے تھے۔ [2] یعنی وہ اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوگا کہ قرآن کی یہ آیت:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ ﴾ (٢/ البقرة:١٨٣)

''مسلمانو! تم پر روزہ اس طرح لکھا گیا جس طرح تم سے پہلوں پر لکھا گیا۔''

کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے۔

روزہ کی حقیقت

انسان کی ہر قسم کی روحانی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل واسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا وہ دنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے۔ اس کے دل کی کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کوشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں۔ اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے۔ اگر تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی، اس لیے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں، ضرورت اور غرض۔ اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔ قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے، اس کی اصل حقیقت کتنی ہے؟ ہمارے دل میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے۔ تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے۔ لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالی

[1] مسند احمد، ج ٦، ص: ٢٤٤۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب صوم یوم عاشوراء: ٢٠٠٤، ٢٠٠٥۔

شان عمارتوں لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے؟ فرزند وعیال، زر و مال اور خدم وحشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا؟ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی اور زندہ رہے ہیں، بروایتِ عام ابراہیم ادہم بادشاہ سے فقیر ہو گئے اور نہایت پُر مسرت روحانی زندگی بسر کی۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی اور تحلیل کے بعد شاید انسانی حقیقی ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو لفظوں میں محدود ہو کر رہ جائے اور وہ مایۂ قوت وغذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا، روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدِ رمق پر موقوف ہے اور سدِ رمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا انہیں چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط و وسعت تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی چیز تمام فروق و امتیاز کو محیط ہو گی۔ انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جائے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈھے جائیں تو انہیں دو چیزوں کے افراط اور تعیش کی مزید طلب اس سلسلہ کی آخری کڑی ہو گی۔ اس بنا پر دنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لیے اکل و شرب سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے، جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت وغذا کی طلب و حرص سے بھی بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام گناہ اور جرائم صرف اسی ایک قوت کے نتائج مابعد ہیں، اگر یہ طلب و ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتاً عالمِ ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے، لیکن جب تک انسان انسان ہے، اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونی ناممکن ہے۔ اسی بنا پر تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کر دی ہے، اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانہ تک ممکن ہے۔ مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملائے اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیے اور چونکہ ان مخلوقات کا فرض زندگی محض خدائے پاک کی اطاعت و عبادت ہے، اس لیے انسان بھی اتنی دیر تک اپنی زندگی کا حتی الامکان یہی فرض قرار دے۔

قرآن مجید نے ان تمام حقائق و رموز کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے اور چونکہ روزہ کی یہ حقیقت تمام مذاہب میں مشترک تھی، اس بنا پر قرآن مجید نے دیگر مذاہب کو بھی اشارتاً اس حقیقت میں شریک کر لیا ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''مسلمانو! تم پر روزہ لکھا گیا جس طرح تم سے پہلی امتوں پر لکھا گیا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

روزہ کی غرض وغایت تقویٰ ہے، یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے کو بچا لینا، اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا۔ لیکن آگے چل کر قرآن پاک اسلامی روزہ کی دو اور مخصوص حقیقتوں کو بھی واضح کرتا ہے۔ فرمایا:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (٢/ البقرة:١٨٥)

''تاکہ خدا نے جو تم کو راہ دکھائی اس پر تم اس کی بڑائی کرو اور شکر ادا کرو۔''

اس مفہوم کی توضیح کے لیے ہم کو رمضان مبارک کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔

رمضان کی حقیقت

یہ مادّی عالم جس طرح مادّی نظام اور قانون کا پابند ہے، خدائے پاک نے عالمِ روحانی میں بھی اسی قسم کا ایک اور نظام، قانون اور علل واسباب کا سلسلہ قائم کر رکھا ہے، جس طرح یقین کے ساتھ آپ یہ دعویٰ کر سکتے ہو کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ اسی یقین کے ساتھ طبِ روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی روح کو قتل کر دیتا ہے۔ پیغمبر فیضانِ نبوت کے قبول کے لیے اپنی روح میں کس طرح استعداد پیدا کرتا ہے۔ دنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے۔ معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے اور اپنے دعویٰ کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ انکار و مزاحمت پر وہ کیونکر مہاجرۃ الی اللہ کرتا ہے اور پھر کیوں کر دعوت کے منکر ناکام و خاسر اور اہل ایمان فلاح یاب و کامیاب ہوتے ہیں، ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منظم قواعد کے مطابق بہ ترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن مجید میں تیرہ مقام پر سنة الله کا لفظ آیا ہے۔ لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔ فلسفہ تاریخ جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادہ سے اصول اور نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنالیتا ہے۔ بالکل اسی طرح انبیا علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادہ سے خصائص نبوت کا اصولِ قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔ پیغمبرانہ تاریخ کے انہیں اصول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی جب اپنے کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوت کے قبول اور استعداد کا انتظار کرتا ہے تو وہ ایک مدت تک کے لیے عالمِ انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے، اسی وقت سے اس کے دل و دماغ میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پرجلال پیغمبر (حضرت موسیٰ علیہ السلام) جب توراۃ لینے جاتا ہے تو چالیس شبانہ روز بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔ [1] کوہ سعیر کا مقدس آنے والا (حضرت عیسیٰ علیہ السلام) اس سے پہلے کہ اس کے منہ میں انجیل کی زبان گویا ہو، وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہا۔ [2] اسی طرح فاران کا آتشین شریعت والا پیغمبر (آنحضرت ﷺ) نزول قرآن

---

[1] خروج: ٣٤۔٢٨، ص: ١٤٥۔ [2] متی: ٤۔٢؛ العهد الجديد، ص: ٦۔

سے پہلے پورا ایک مہینہ حرا نام مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں مصروف رہتا ہے اور بالآخر اسی اثنا میں ناموسِ اکبر ﴿ اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ ﴾ کا مژدۂ جانفزا لے کر نمودار ہوتا ہے۔ [1]

یہ واقعہ کس ماہ مبارک کا تھا؟

﴿ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْۤ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''رمضان کا وہ مہینہ جس میں قرآن اترا۔''

یہ کس شبِ اقدس کی داستان ہے؟

﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةٍ مُّبٰرَكَةٍ ﴾ (٤٤/ الدخان :۳)

''ہم نے قرآن کو ایک برکت والی رات میں اتارا۔''

اس مبارک شب کو ہم کس نام سے جانتے ہیں؟

﴿ اِنَّاۤ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ﴾ (۹۷/ القدر :۱)

''ہم نے قرآن کو شبِ قدر میں اتارا۔''

ان آیتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے، جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور پیغمبرِ امی علیہ السلام کو عالم کی راہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط۔ ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ وتنہا بھوکا اور پیاسا [2] سر بہ زانو تھا۔ اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا اور پیاسا رہنا (روزہ) کسی عبادت گاہ میں یکہ وتنہا رہنا (اعتکاف) نزول وحی کی رات میں (لیلۃ القدر) بیدار و سربسجود رہنا تمام پیروانِ محمدی ﷺ کے لیے ضروری تھا کہ

﴿ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ ﴾ (۳/ آل عمران :۳۱)

''اگر تم خدا کو پیار کرتے ہو تو میری پیروی کرو، خدا تمہیں پیار کرے گا۔''

اس سے واضح ہوتا ہے کہ روزہ، اعتکاف اور لیلۃ القدر کی حقیقت اسلام میں کیا ہے؟ اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے؟ اس لیے اس ماہِ اقدس میں بقدرِ امکان انہیں حالات وجذبات میں متکیف ہونا چاہیے، جس میں وہ حامل قرآن متکیف تھا، تا کہ وہ دنیا کی ہدایت یابی اور راہنمائی کی

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی : ۳ ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بدء الوحی: ۴۰۳، ۴۰۹ میں اور سیرۃ ابن ھشام بدء بعثۃ، ج۱، ص: ۱۵۰ میں ہے۔

[2] روایت سے اگرچہ بتصریح یہ نہیں معلوم ہوتا کہ آپ غارِ حرا میں روزے رکھتے تھے، تاہم قرائن واشارات سے سمجھا جاتا ہے کہ آپ اور عبادات کے ساتھ غارِ حرا میں روزے بھی رکھتے تھے۔ جیسا کہ بخاری (بدء الوحی) اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے جس کا ایک جز روزہ ہے۔ آج کل کے بعض علمائے مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزہ سے رہتے تھے۔ (دیکھو خضری مصری کی تاریخ التشریع الاسلامی، صفحہ:۶ وصفحہ ۳۱)۔

یادگار تاریخ ہو۔ یہ جذبات و حالات جن کو قرآن کے مبلغ کی پیروی میں ہم اپنے اوپر طاری کرتے ہیں، یہی اس ہدایت کے ملنے پر ہماری شکر گزاری اور خدا کی بڑائی ہے۔

فرضیت صیام کا مناسب موقع ۲ھ

اگر اسلامی عبادات کا قالب روح سے خالی ہوتا اور ان سے صرف جسم کی ریاضت مقصود ہوتی تو نماز سے پہلے روزہ فرض کیا جاتا، روزہ عرف عام میں فاقہ کشی کا نام ہے اور عرب کو ملک کی اقتصادی حالت کی وجہ سے اکثر یہ سعادت نصیب ہو جایا کرتی ہے۔ ظہورِ اسلام کے بعد کفار نے مسلمانوں کو جن پریشانیوں میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس نے ان کو عرب کے معمولی طریقہ کسبِ معاش کی طرف سے بھی غیر مطمئن کر دیا تھا، جن لوگوں نے آنحضرت ﷺ کی حمایت کی تھی تمام قبائل نے ان سے تمدنی تعلقات منقطع کر لیے تھے، اس حالت میں صرف روزہ ایک ایسا فریضہ تھا، جو عرب کی عام حالت اور مسلمانوں کی موجودہ زندگی کے لیے موزوں ہو سکتا تھا۔ نماز و حج کی طرح اس میں کسی قسم کی مزاحمت کا بھی اندیشہ نہ تھا، وہ ایک خاموش طریقہ عبادت تھا، جو بلا روک ٹوک جاری رہ سکتا تھا۔ لیکن اسلام نے عبادات کو امراضِ روحانی کی دوا قرار دیا ہے، جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراض روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارف دنیا کی شیفتگی اور لذات حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی مرض پیدا ہو سکتے تھے، مکہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے۔ بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا۔ اس لیے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ آنحضرت ﷺ مدینہ میں تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی۔ انصار کی ایثار نفسی نے مسلمانوں کو بوجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور اس میں روز بروز وسعت پیدا ہوتی گئی، اب وہ وقت آ گیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریضہ بتائے اس لیے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا، جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا۔ [1] اس سے یہ شبہ دور ہو جاتا ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوا ہے کہ چونکہ آغازِ اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا، اس لیے ان کو روزہ کا خوگر کیا گیا، حالانکہ اصولِ اسلام کی رو سے فاقہ مستوں کو روزہ کی جتنی ضرورت ہے۔ شکم سیروں کے لیے وہ اس سے زیادہ ضروری ہے۔ علامہ ابن قیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا، اس لیے روزہ وسط اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ توحید نماز اور احکام قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے۔ اس لیے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزوں تھا۔ [2]

---

[1] تاریخ ابن جریر طبری واقعات ۲ھ ج ۳ ص: ۱۲۸۱ اور زرقانی بر مواہب ج ۱ ص: ۴۷۰ مصر، و زاد المعاد ابن قیم ج ۱ ص: ۱۵۸۔

[2] زاد المعاد، ج ۱، ص: ۱۵۸۔

ایام روزہ کی تحدید

روزہ ایک قسم کی دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہیے تھا، اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا اور مسلمانوں کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادات کا اثر قبول کرتی ہے، لیکن اگر ایک دوروز کا تنگ اور محدود زمانہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت تھی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا، اس لیے اسلام نے روزہ کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ اس کے لیے مقرر کیا اس ایک مہینہ کی تخصیص کی بھی ضرورت تھی، تا کہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لیے وہی زمانہ موزوں تھا، جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا۔ یعنی رمضان چنانچہ آنحضرت ﷺ اس کے بعد جب تک زندہ رہے اور تمام صحابہ نے یہ مہینہ ہمیشہ روزہ میں گزارا اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دنیا میں اسی مہینہ کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر حسبِ توفیق روزہ رکھتی ہے۔ چونکہ روزہ بہر حال مشقت کی چیز ہے، اس لیے قرآن پاک میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور سے کی گئی ہے، تا کہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو۔ پہلے تو زمانہ کی تخصیص کے بغیر یہ کہا گیا ہے:

﴿ يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

"اے ایمان والو! تم پر روزہ فرض کیا گیا ہے۔"

اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ کچھ تم ہی پر اکیلے فرض نہیں کیا گیا بلکہ

﴿ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

"جیسا کہ تم سے پہلی قوموں پر بھی فرض کیا گیا تھا۔"

اب بھی مدت نہیں بتائی گئی، اس کے بعد فرمایا گیا:

﴿ اَيَّامًا مَّعْدُوْدٰتٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

"چند گنے ہوئے دن۔"

مدت کی تعیین اب بھی نہیں، البتہ اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا، جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جائے اور فرمایا چند گنے ہوئے دن۔ اس کے بعد اسلامی روزوں کی آسانیوں کا ذکر شروع کر دیا گیا، تا کہ طبیعت متوجہ رہے۔ فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

"تو جو بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں کی گنتی۔"

مگر اسی طرز ادا سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے کہ اگر خاص زمانہ نہ ہوتا

تو یہ کہنا بے کار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو، نیز یہ بھی اشارتاً پتہ چلتا ہے کہ جو دن ہوں گے وہ گنے ہوئے مقرر ہوں گے، ورنہ ﴿مَعْدُوْدَاتٍ﴾ (گنے ہوئے) ﴿عِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ﴾ (دوسرے دنوں کی گنتی) اور پھر آگے چل کر ﴿وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ﴾ (تاکہ تم شمار کو پورا کر لو) نہ کہا جاتا، پھر اس کے بعد دوسری آسانی بتائی:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ﴾ (۲/ البقرة:۱۸٤)

''اور جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے۔''

اب کہا جاتا ہے کہ مگر اس اجازت کے بعد بھی روزہ ہی رکھو تو بہتر ہے:

﴿فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ وَاَنْ تَصُوْمُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴾

(۲/ البقرة:۱۸٤)

''تو جو کوئی شوق سے کوئی نیکی کرے، تو یہ بہتر ہے اس کے لیے اور روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم جانو۔''

ان آیتوں میں دیکھیے کہ قضا اور کفارہ کی اجازت کے باوجود روزہ رکھنا مستحسن فرمایا اور روزہ کی اہمیت ظاہر کی اتنی تمہیدوں کے بعد روزہ کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور جس کو ہلکا کر کے دکھانے کے لیے فرمایا گیا تھا کہ ﴿اَيَّامًا مَّعْدُوْدَاتٍ﴾ چند گنے ہوئے دن ظاہر ہے کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں انتیس اور تیس دنوں کے روزے چند گنتی کے دن ہی تو ہیں۔ [1] بہرحال رمضان کو ماہِ صیام قرار دینے سے پہلے اس مہینہ کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی فرمایا:

﴿شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ﴾

(۲/ البقرة:۱۸۵)

''وہ رمضان کا مہینہ جس میں قرآن اتارا گیا اس قرآن میں لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور

---

[1] عربی زبان سے کوئی ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے، جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہیے کہ ایام العرب کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں، زیادہ سے زیادہ نو لڑائیوں میں محدود کر دے، اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دنیا کے اور ہزار ہا انقلابات کو ایام اللہ کہا ہے (۱۴/ ابراہیم۔۵) ان کو نو تک کے انقلابات عالم میں محدود کر دے، یمن سے شام تک کے سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتے تھے، اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا: ﴿سِيْرُوْا فِيْهَا لَيَالِيَ وَاَيَّامًا اٰمِنِيْنَ﴾ (۳٤/ السبا:۱۸) اور ﴿فِي الْاَيَّامِ الْخَالِيَةِ﴾ (٦۹/ الحاقة:۲٤) ''گزرے ہوئے دن۔'' جن کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر اور ﴿وَتِلْكَ الْاَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ﴾ (۳/ ال عمران:۱٤۰) کو زمانہ کے برسوں اور صدیوں پر کیا ہے، وہ نو دن سے زیادہ نہ بڑھ سکیں، جمع قلت وکثرت کا یہ قاعدہ وہ بھی کلی نہیں، بلکہ عموماً ان الفاظ کے لیے ہے جن کی جمع قلت وکثرت دونوں مستعمل ہیں، ایام کا لفظ ان میں نہیں، اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے اور وہ ایوام ہے، جو تعلیل کے بعد ایام بولا جاتا ہے، سند کے لیے دیکھو رضی شرح کافیہ، جلد دوم، ص:۱۵۴، ۱۵۵ بحث جمع مکسر اور لسان العرب لفظ یوم، ج ۳، ص:۱۰۲۱۔

ہدایت اور حق و باطل کی تمیز کی دلیلیں ہیں۔''

اب وہ مناسب موقع آیا جس میں یہ فرمایا جائے کہ ان چند دنوں کے روزے اسی رمضان میں، جس کی یہ عظمت ہے، تم پر فرض کیے گئے، ارشاد ہوا:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔''

اب پورے ماہ رمضان کے روزوں کی تعیین وتحدید اور ایاماً معدودات کی تشریح ہوگئی، عربی کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان [1] ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے، وہ فعل اس ظرفِ زمان کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً: اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے مہینے بھر روزہ رکھا تو کہیں گے: صَامَ شَهْرًا۔ اس کے یہ معنی نہ ہوں گے کہ مہینہ میں چند دن روزے رکھے، بلکہ ایک مہینہ پورا سمجھا جائے گا اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے ایک سال روزہ رکھا تو عربی میں یوں کہیں گے: صَامَ سَنَةً (سال بھر روزہ رکھا) اس سے یہ ثابت ہوا کہ اس آیت پاک میں پورے رمضان بھر روزہ رکھنے کا ذکر ہے اور چونکہ لفظ شہر یعنی مہینہ کہا گیا ہے، اس لیے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینہ کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا، قمری سال جس کا عرب میں رواج تھا، [2] اس کے مہینے کبھی تیس اور کبھی ۲۹ دن کے ہوئے ہیں، جیسی روایت ہو وہی ماہ صیام پر بھی صادق آئے گا۔ جیسا کہ سرور کائنات ﷺ، تمام صحابہ کرام خلفائے راشدین اور جمیع فرق اسلام کے عمل اور تواتر سے ثابت اور واضح ہے اور احادیثِ صحیحہ میں اس کی پوری تصریحات مذکور ہیں۔

ایک نکتہ

قرآن پاک نے اس رمضان کے روزہ کا حکم ان الفاظ میں دیا ہے:

﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تو جو اس مہینہ کو پائے تو اس مہینہ بھر کے روزہ رکھے۔''

لفظ شَهِدَ کے لغوی معنی کسی مقام یا زمانہ میں موجود اور حاضر رہنے کے ہیں، اسی سے شہادت اور شاہد کے الفاظ نکلے ہیں، اس سے معلوم ہوا کہ یہ روزے اسی پر واجب ہیں، جو اس ماہ صیام میں موجود اور حاضر ہو اس ماہِ صیام میں غیر موجود اور غیر حاضر ہونے کی دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ ماہ صیام آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دنیا میں موجود نہ ہو، جس میں وہ ماہ صیام آیا یا دوسری صورت یہ ہے شخص اپنی جگہ پر موجود ہو، مگر ماہِ صیام کا وہاں گزر نہ ہو، یہ صورت ان قطعات ارضی میں پیش آئے گی، جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہیں، جو باقی متمدن

[1] تفصیل کے لیے دیکھو رضی جلد اول بحث مفعول فیہ و ظرف زمان صفحہ: ۱۶۲ مطبع نولکشور ۱۸۶۸ء)

[2] جیسا کہ قرآن پاک کی اس آیت کریمہ سے ثابت ہے ﴿ يَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِىَ مَوَٰقِيتُ لِلنَّاسِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۹) ''لوگ آپ سے پوچھتے ہیں پہلی رات کے چاندوں (ہلال) کے بارے میں کہہ دیجئے کہ وہ لوگوں کو وقت اور حج کی تاریخ بتانے کے لیے ہے۔''

دنیا میں ہے۔ مثلاً: جن مقامات میں کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں کہ وہاں رمضان کی آمد کا سوال ہی نہیں۔ ہاں اگر وہاں کے مسلمان چاہیں تو بقیہ متمدن ممالک کے کیلنڈر (تقویم) کو معیار مان کر روزے رکھیں اور کھولیں (جیسا کہ حدیث دجال سے جو صحاح میں ہے ثابت ہے۔ [1] لیکن جہاں اٹھارہ اٹھارہ اور بیس بیس گھنٹوں کے دن ہوتے ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی عجیب قدرت ہے کہ وہاں موسم ٹھنڈا اور بارد بنایا ہے، تاکہ روزہ کی تکلیف دن کی مدت بڑھنے سے جو ہو سکتی تھی، وہ موسم کی برودت سے کم ہو جائے، چنانچہ انگلستان میں مجھے خود اور بہت سے مسلمانوں کو روزہ رکھنے کا اتفاق ہوا اور بالکل تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔ [2]

معذورین

جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ صیام کے ادا کرنے سے معذور ہوں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ نے آسانیاں رکھی ہیں، اس لیے ارشاد ہے:

﴿ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

"اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے اور سختی تمہارے ساتھ نہیں چاہتا۔"

اس اصولی تمہید کے بعد مسافر اور بیمار کو رخصت عطا فرمائی ہے کہ رمضان کے کسی روزہ کے یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کر لے۔

بیمار کے دو معنی ہیں، یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا یا بار بار کے تجربوں کے بعد، شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے، تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے، فرمایا:

﴿ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

"تو جو تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں روزہ کی گنتی پوری کرے۔"

اسی سلسلہ میں ایک اور آیت ہے جس کی تفسیر اور تاویل میں صحابہ کے عہد سے اختلاف ہے، وہ آیت یہ ہے:

﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

"اور جن لوگوں کو روزہ کی طاقت نہ ہو فدیہ ادا کریں ایک مسکین کا کھانا۔"

① بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے، ان

[1] صحیح مسلم، کتاب الفتن، باب ذکر الرجال: ۷۳۷۳۔

[2] پہلے اور دوسرے ایڈیشن میں اس موقع پر ان لوگوں کے لیے جو اتنی مدت کے دن میں روزہ کے بجائے کفارہ کی اجازت لکھی گئی تھی وہ میری غلطی تھی جس سے میں رجوع کرتا ہوں۔ "س"

روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا ہر روزہ کی جگہ دیں، رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔

② دوسری روایت یہ ہے کہ ﴿ یطیقونه ﴾ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اس صورت میں آیت کا یہ مطلب ہوا کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں، وہ روزہ کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں، بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا، حضرت شاہ ولی اللہ صاحب رحمہ اللہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے۔ [1]

③ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے معذور ہوں، جیسے بڈھے اور حاملہ۔

اصل یہ ہے کہ لفظ ﴿ يُطِيقُونَ ﴾ کے لغوی معنی کی تحقیق نہیں کی گئی ہے، اطاقت کو وسعٔ کے معنی میں سمجھا گیا ہے اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہیں، وہ ایک مسکین کا کھانا دیں، تو اس ترجمہ کے مطابق یا تو نسخ ماننا پڑے گا اور یا آج کل کے بعض آزاد خیالوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ جو روزہ کی طاقت رکھتے ہیں، وہ بھی روزہ کے بجائے فدیہ دے کر روزہ سے بچ سکتے ہیں، حالانکہ یہ صریح غلط ہے اس کے معنی تو ہوں گے کہ غربا روزے رکھیں اور امرا فدیہ دے کر روزہ سے مستثنیٰ ہو جائیں، ایسی تفریق اسلام کے فرائض میں کبھی روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے اور آیت مابعد کہ ﴿ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵) ''جو رمضان کے مہینہ میں ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔'' کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقت کے معنی کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں اس لیے یطیقون کا ترجمہ یہ ہوگا کہ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔ [2] اب روزہ کے سلسلے میں معذوروں کی دو صورتیں ہوئیں، ایک یہ کہ یہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو، جیسے مرض یا خوف یا سفر تو ان

[1] الفوز الکبیر، باب ناسخ ومنسوخ، ص:۱۹۔ [2] اطاقه طاقة کا باب افعال سے مصدر ہے اس کے ثلاثی مصدر سے فعل نہیں بنتا فعل بنانے کے لیے باب افعال مستعمل ہے اور طاقۃ کے معنی لسان العرب (ج ۲، ص:۶۲۸) اور تاج العروس (ج ۶، ص:۴۲۷) وغیرہ میں یہ لکھے ہیں: والطوق الطاقة اى اقصى غايته وهو اسم لمقدار ما يمكن ان يفعله به بمشقة منه طوق کے معنی طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت اور وہ اس مقدار کا نام ہے جس کو کوئی مشقت ومشکل کے ساتھ کر سکے۔ طاقت کے اس معنی کی تائید قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔ قرآن پاک میں ہے: ﴿ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶) ''اے ہمارے پروردگار! اور ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے۔'' ''جس کی ہم کو طاقت نہیں'' کے یہ معنی ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں، یعنی جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے، کیونکہ قرآن پاک کے نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا، فرمایا:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

''اللہ کسی نفس کو حکم نہیں دیتا، لیکن اس کا جو اس کی وسعت میں ہو۔''

اس سے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ! ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جس کو ہم اٹھا ہی نہیں سکتے ہوں، (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

کے لیے یہ آیت ہے:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''تو جو تم میں سے مریض ہو یا سفر پر ہو تو دوسرے دنوں میں گنتی ہے۔''

یعنی عذر کے وقت وہ روزہ نہ رکھے اور اس چھوڑے ہوئے روزے کی گنتی دوسرے مناسب وقت قضا رکھ کر پوری کر لے، اس میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہوگئی۔ اگر حاملہ یا مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری...... کا خوف ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے اور اس عذر کے دُور ہونے کے بعد قضا رکھ لے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابل ازالہ ہو، جیسے کوئی دائم المرض ہو، بہت ہی کمزور ہو اور بوڑھا (شیخ فانی) ہو جو بہ مشکل روزہ رکھتا ہو، تو وہ روزہ قضا کرے اور ہر روزہ کے بدلے ایک مسکین کا کھانا دے دے، اس کے لیے یہ آیت ہے:

﴿ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''اور ان پر جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔''

(❀❀ گزشتہ سے پیوستہ) صحیح نہ ہوگا بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنی یہ ہوں گے جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا کہ

﴿ لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۴۹)

''آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں۔''

اس کے معنی یہ نہیں کہ ہم مقابلہ نہیں کر سکتے، بلکہ یہ معنی ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ حدیثوں سے بھی ایسا معلوم ہوتا ہے ابو داؤد، کتاب الصیام، باب من قال مثبتة للشیخ والحبلی: ۲۳۱۸۔ میں ہے:

((عن ابن جبیر عن ابن عباس ﴿وعلى الذين يطيقونه فدية طعام مسكين﴾ قال كانت رخصة للشيخ الكبير والمرأة الكبيرة وهما يطيقان الصيام ان يفطرا ويطعما مكان كل يوم مسكينا))

''ابن جبیر حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو روزہ بہ مشکل رکھ سکتے ہیں، ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے، فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورت کے لیے اجازت ہے کہ وہ دونوں بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہیں اور وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلہ ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔''

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ یطیقان الصیام کے معنی یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی، اس کے معنی یہی ہوں گے کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

پہلا ایڈیشن لکھتے وقت دوسرے علما کی تائید مجھے نہیں مل سکی اب الحمد للہ یہ تائید بھی ہاتھ آ گئی ہے، سر آمد علمائے اہل حدیث شارح عون المعبود، شرح ابی داؤد، ج ۲، ص: ۲۶۶ میں اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

لکن مع شدۃ وتعب ومشقۃ عظیمۃ، اسی طرح محدثینِ حنفیہ کے سب سے وسیع النظر شیخ الحدیث مولانا انور شاہ صاحب رحمہ اللہ کے متعدد تلامذہ نے اس کی تصدیق کی کہ شاہ صاحب کی یہی تحقیق تھی، فالحمد للہ۔

ان وجوہ سے ﴿وعلى الذين يطيقونه فدية﴾ کا ترجمہ یہ نہ ہوگا کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں، بلکہ یہ ہوگا کہ جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں۔

اور ظاہر ہے کہ جب یہ مشکل روزہ پر قادر ہو، اس کو فدیہ کی اجازت ہے تو جو بالکل قادر نہ ہو تو اس کو تو بالاولی فدیہ کی اجازت ہوگی ﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

روزہ پر اعتراض اور اس کا جواب

علم اور فطرت شناسی کے بعض مدعی جو عام عبادات و پرستش کی غرض و غایت یہ قرار دیتے ہیں کہ وحشی انسانوں کا تخیل یہ ہے کہ خدا ہماری جسمانی تکلیف اٹھانے سے خوش ہوتا ہے، وہ روزہ کی حقیقت بھی صرف اسی قدر سمجھتے ہیں کہ وہ خدا کی خوشنودی کے لیے جسمانی زحمت کشی ہے اور ان غلط فہمیوں کے لیے دیگر مذاہب میں گو لغزش گاہیں موجود ہیں، چنانچہ جوگیوں اور جینیوں میں روزہ کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اس معنی کی طرف اشارہ کرتی ہیں، یہودیوں کی اصطلاح میں روزہ کے لیے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے۔ چنانچہ توراۃ میں روزہ کے لیے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے۔ سفر الاحبار (۱۶۔۲۲۹ العہد القدیم ،ص:۱۸۵) میں ہے:

''اور یہ تمہارے لیے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ میں تم سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو خواہ پردیسی، جس کی بود و باش تم میں ہے، اپنی جان کو دکھ دے۔''

توراۃ کے سفر العدد (۲۹۔۷ العہد القدیم ،ص:۲۶۳) میں ہے:

''اور اس ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی اور تم اپنی جانوں کو دکھ دو اور کچھ کام نہ کرو۔''

یہ اصطلاح توراۃ کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے، لیکن قرآن مجید نے اس کے لیے جو لفظ استعمال کیا ہے وہ صوم ہے۔ صوم کے لغوی معنی احتراز و اجتناب اور خاموشی کے ہیں، جس سے صاف ظاہر ہے کہ اسلام کا روزہ کس حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے، خدا نے قرآن پاک میں مسلمانوں کو جہاں روزہ کا حکم دیا ہے، وہاں یہ الفاظ بھی اضافہ فرمادیے ہیں:

﴿ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''خدا تمہارے ساتھ نرمی چاہتا ہے سختی نہیں چاہتا۔''

اسلام کا عام قانون ہے:

﴿ لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۸۶)

''خدا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔''

قرآن نے اپنے مبلغ کی توصیف ان الفاظ میں کی ہے:

﴿ يَاْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهٰىهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰۗىِٕثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ اِصْرَهُمْ وَالْاَغْلٰلَ الَّتِيْ كَانَتْ عَلَيْهِمْ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۵۷)

''وہ ان کو نیکیوں کا حکم دیتا ہے برائیوں سے روکتا ہے اور گندی چیزوں کو حرام کرتا ہے اور اس طوق اور زنجیروں کو جو ان کے اوپر پڑی ہیں، ان سے اتارتا ہے۔''

ان امور کا منشا یہ ہے کہ اسلامی عبادات واحکام میں کوئی چیز بھی اس غرض سے نہیں رکھی گئی کہ اس سے انسان کی جان کو دکھ پہنچایا جائے، روزہ بھی اسی سلسلہ میں داخل ہے اور اسی لیے اسلام نے روزہ کی ان سختیوں کو جو لوگوں نے بڑھا رکھی تھیں بتدریج کم کر دیا۔

روزہ میں اصلاحات

اسلام نے روزہ کی سختیوں کو جس حد تک کم کیا اور اس میں جو سہولتیں پیدا کیں وہ حسب ذیل ہیں:

① سب سے اول یہ کہ اسلام سے پہلے جو الہامی یا غیر الہامی مذاہب تھے۔ ان میں اکثر روزہ صرف پیرووں کی کسی خاص جماعت پر فرض تھا۔ مثلاً: ہندوؤں میں غیر برہمن کے لیے کوئی روزہ ضروری نہیں پارسیوں کے یہاں صرف دستور اور پیشوا کے لیے روزہ ہے۔ یونانیوں میں صرف عورتوں کے لیے روزہ تھا لیکن سوال یہ ہے کہ اگر روزہ کوئی اچھی چیز ہے تو تمام پیروانِ مذہب کے لیے برابر طور سے ضروری ہے۔ اسلام میں پیشوا غیر پیشوا، عورت، مرد کی کوئی تخصیص نہیں، اس نے تمام پیرووں کو عام حکم دیا اور اس میں کسی چیز کی کوئی تخصیص نہیں کی۔

﴿فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''اس مہینہ میں جو موجود ہو وہ مہینہ بھر روزہ رکھے۔''

② اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب میں عموماً شمسی سال معتبر ہے۔ شمسی سال میں روزہ کی جو تاریخیں جن موسموں میں متعین ہوں گی، ان میں تغیر وتبدل ناممکن ہے، اس بنا پر اگر وہ گرمی یا سردی کے موسم میں چھوٹے یا بڑے دنوں میں واقع ہوتے ہیں، تو یہ تو وہ مختلف ملکوں میں ہمیشہ کے لیے تکلیف دہ یا ہمیشہ کے لیے آرام دہ ہیں۔ اسلام کے روزوں کی تاریخیں قمری مہینوں سے ہیں، جو موسم اور چھوٹے اور بڑے دنوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔ اس سے اسلامی روزہ کا مہینہ ہر ملک میں ہر موسم میں آتا ہے اور اس بنا پر اس کی سختی ونرمی بدلتی رہتی ہے۔

③ جہاں تک دیگر مذاہب کی الہامی کتابوں کے پڑھنے کا موقع ملا ہے، روزہ کی تاکید اور حکم کے متعلق کسی حالت انسانی کی تخصیص واستثنا نظر سے نہیں گزری، توراۃ میں تو یقیناً مذکور نہیں، بلکہ یہاں تک ہے کہ اگر کسی وجہ سے روزہ نہ رکھے تو وہ کٹ جائے گا یا قتل ہو جائے گا، بلکہ یہ ہے کہ اس پردیسی پر بھی روزہ فرض ہوگا جو گو یہودی نہیں، مگر یہودیوں کے پاس آ کر رہا ہو۔ [1] لیکن قرآن مجید نے نہایت فطرت شناسی کے ساتھ ہر قسم کے معذور ومجبور لوگوں کو اس حکم سے مستثنیٰ کر دیا۔ بچے مستثنیٰ ہیں، عورتیں ایام حمل ورضاعت اور دیگر مخصوص

[1] سفر الاحبار: ۱۶۔ ۲۹؛ العهد القديم، ص: ۱۸۵۔

ایام میں روزہ سے مستثنیٰ ہیں۔ بڈھے، بیمار اور مسافر مستثنیٰ ہیں، کمزور اشخاص جو روزہ پر فطرتاً قادر نہیں، مستثنیٰ ہیں بیمار و مسافر اور عارضی معذور، بیماری، حالت سفر اور عذر کے دفع ہونے کے بعد اتنے دنوں کی قضا بعد کو رکھیں اور جو دائمی طور سے معذور ہیں، وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں، فرمایا:

﴿ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۴)

''اگر تم میں کوئی بیمار ہو یا مسافر ہو وہ رمضان کے بعد اور دنوں میں روزہ رکھ لے اور وہ لوگ جو بمشکل روزے رکھ سکتے ہوں، ان پر ایک مسکین کا کھانا ہے۔''

ترمذی میں ہے:

عن انس قال النبی ﷺ: ((ان اللّٰہ وضع عن الحامل والمرضع الصوم)) [1]

''حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ فرمایا نبی ﷺ نے کہ خدا نے حاملہ اور دودھ پلانے والی سے روزہ اتار لیا۔''

یعنی رمضان میں روزہ رکھنے سے ان کو اپنی یا بچہ کی جان کا خطرہ ہو تو روزہ قضا کر کے رفعِ عذر کے بعد قضا رکھیں۔

④ اور مذہبوں میں روزہ کے ایام نہایت غیر معتدلانہ تھے، یا تو چالیس چالیس روزہ کا فاقہ تھا یا روزہ کے دنوں میں غلہ اور گوشت کے علاوہ پھل تک کھانے کی اجازت تھی، اسلام نے اس میں بھی توسط اختیار کیا یعنی روزہ کے اوقات میں گو ہر قسم کے کھانے پینے سے روک دیا، مگر اس کی مدت ایک مہینہ تک صرف آفتاب [2] کے طلوع سے غروب تک چند گھنٹوں کی رکھی۔

⑤ جینیوں کے یہاں ایک ایک روزہ ہفتوں کا ہوتا تھا، عرب کے عیسائی راہب کئی کئی روز کا روزہ رکھتے تھے۔ یہودیوں کے ہاں پورے چوبیس گھنٹے کا روزہ تھا۔ اسلام نے صرف صبح سے شام تک کا ایک روزہ قرار دیا۔

﴿ ثُمَّ أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''پھر روزہ کو رات تک ختم کرو۔''

⑥ یہودیوں کے ہاں یہ روزہ تھا کہ روزہ کھولنے کے وقت ایک دفعہ جو کھا لیتے، کھا لیتے، پھر نہیں کھا سکتے تھے یعنی اسی وقت سے دوسرا روزہ شروع ہو جاتا، عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے، کھا لیتے سو جانے کے بعد کھانا پھر ناجائز تھا۔ ابتدا اسلام میں بھی یہی قاعدہ تھا۔ ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا، ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا نہیں تیار ہوا تھا، ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں، وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے، کھانا پک

---

[1] ترمذی، ابواب الصوم:۷۱۵ معناہ۔ [2] مصنف کی مراد طلوع فجر سے ہے۔

چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئی، وہ سو چکے تھے۔ اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے، دوسرے روز پھر روزہ کا دن تھا ان کو غش آ گیا۔ اس پر یہ آیت اتری:

﴿ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْاَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''اور اس وقت تک کھاؤ اور پیو جب تک رات کا تاریک خط صبح کے سپید خط سے ممتاز نہ ہو جائے۔''

⑦ جاہلیت میں دستور تھا کہ روزہ کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے، لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری تھی، اکثر لوگ اس میں مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے۔ اس لیے اسلام نے صرف روزہ کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی اور رات کو اجازت دے دی:

﴿ اُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ اِلٰى نِسَآئِكُمْ ؕ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُوْنَ اَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْئٰنَ بَاشِرُوْهُنَّ وَابْتَغُوْا مَا كَتَبَ اللّٰهُ لَكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۷)

''روزہ کی شب میں بیویوں سے مقاربت تمہارے لیے حلال کی گئی، وہ تمہاری پوشاک ہیں اور تم ان کی، خدا جانتا تھا کہ تم اپنے نفس سے خیانت کرتے تھے تو اس نے معاف کیا، اب بیوی سے ملو جلو اور خدا نے تمہارے مقدر میں جو کچھ رکھا ہے (یعنی اولاد) اس کی تلاش کرو۔''

⑧ بھول چوک اور خطا و نسیان اسلام میں معاف ہے، اس بنا پر اگر بھولے سے روزہ دار کچھ کھا پی لے یا کوئی اور کام بھول کر ایسا کر بیٹھے جو روزہ کے خلاف ہے، تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا۔

عن ابی ہریرۃ ((من أكل او شرب ناسيا فلا يفطر فانما هو رزق رزقه الله)) [1]

''ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے جو بھول کر کھائے یا پیے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کہ یہ تو خدا کی روزی ہی تھی۔''

⑨ اسی طرح ان افعال سے جو گو روزہ کے منافی ہیں، لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوئے، بلکہ بلا ارادہ از خود سرزد ہوئے ہیں، روزہ نہیں ٹوٹتا۔

قال النبی ﷺ: ((الا لا يفطر من قاء ولا من احتلم)) [2]

''پیغمبر خدا ﷺ نے فرمایا: جس کو قے ہوگئی [3] یا سوتے میں غسل کی ضرورت پیش آ گئی اس کا روزہ نہیں ٹوٹتا۔''

---

[1] ترمذی، ابواب الصوم، باب ماجاء فی الصائم یأکل او یشرب ناسیا:۷۲۱۔

[2] ابوداود، کتاب الصیام، باب فی الصائم یحتلم نہارا فی رمضان:۲۳۷۶۔

[3] قے ہونے کی فقہ حنفی میں کئی صورتیں ہیں ان میں سے بعض میں روزہ ٹوٹ جاتا ہے اور بعض میں نہیں۔

⑩ یہودیوں میں اکثر روزے چونکہ مصائب کی یادگار اور غم کی علامت تھے، اس لیے روزہ کی حالت میں وہ زیب و زینت نہیں کرتے تھے اور غم کی صورت بنائے رہتے تھے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے فرمایا:

''پھر جب تم روزہ رکھو، ریا کاروں کے مانند اپنا چہرہ اداس نہ بناؤ کیوں کہ وہ اپنا منہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ظاہر ہوں، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے، پر جب تو روزہ رکھے اپنے سر پر چکنا لگا اور منہ دھوتا کہ تو آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزہ دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے، آشکارا تجھے بدلہ دے۔'' (متی ٦۔١٦ تا ١٨ العهد الجديد، ص: ١١)

اسلام میں بھی روزہ کی اصل خوبی یہی ہے۔ اس لیے روزہ کی حالت میں سر میں تیل ڈالنا، سرمہ لگانا، خوشبو ملنا اسلام میں روزہ کے منافی نہیں، منہ دھونے اور مسواک کرنے کی بھی تاکید ہے۔ اس سے طہارت اور پاکی کے علاوہ یہ غرض بھی ہے کہ روزہ دار ظاہری پریشان حالی اور پراگندگی کی نمائش کر کے ریا میں گرفتار نہ ہو اور نہ یہ ظاہر ہو کہ وہ اس فرض کے ادا کرنے میں اور خدا کے اس حکم کے بجالانے میں نہایت تکلیف، مشقت اور کوفت برداشت کر رہا ہے، بلکہ ہنسی، خوشی رضامندی اور مسرت ظاہر ہو۔

⑪ روزہ دوسری عبادتوں کے مقابلہ میں ظاہر ہے کہ کچھ نہ کچھ تکلیف اور مشقت کی چیز ہے، اس لیے ضرورت تھی کہ عام افراد امت کو اس میں غلو اور تعمق سے باز رکھا جائے، خود آنحضرت ﷺ اکثر و بیشتر روزے رکھتے تھے۔ مہینوں میں کچھ دن مقرر تھے، ہفتوں میں بھی کچھ دن مقرر تھے، ان کے علاوہ کبھی کبھی رات دن کا متصل روزہ بھی رکھتے تھے۔ لیکن دوسرے روزوں کو صرف استحباب تک رکھا اور رات دن کے متصل روزہ کی تو مطلقاً ممانعت فرمائی۔ بعض صحابہ نے سبب دریافت کیا تو فرمایا:

((ایکم مثلی انی ابیت یطعمنی ربی ویسقینی))

''تم میں مجھ سا کون ہے؟ مجھے تو میرا خدا کھلاتا پلاتا ہے (یعنی روحانی غذا)۔''

لوگوں نے اصرار کیا تو آپ نے کئی کئی دن تک متصل روزے رکھنے شروع کیے۔ جب مہینہ گزر گیا تو بطور سرزنش کے فرمایا کہ اگر مہینہ ختم نہ ہو گیا ہوتا تو میں اس سلسلہ کو اور بھی بڑھاتا۔ [1]

روزہ کے مقاصد

اس تفصیل کے بعد ہم کو غور کرنا ہے کہ اسلام میں روزہ کے کیا مقاصد ہیں، گو سطور بالا سے کسی قدر ان کا انکشاف ہو چکا ہے۔ مگر ہم مزید تفصیل سے ان کی وضاحت کرنا چاہتے ہیں۔

محمد رسول اللہ ﷺ کی کوئی تعلیم ربانی محض حکم کے طور پر نہیں ہے۔ بلکہ وہ سرتا پا حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہے اس کے فرائض کی عمارت روحانی، اخلاقی، اجتماعی اور مادی فوائد اور منفعتوں کے چہار گانہ ستونوں پر

[1] بخاري، كتاب الصوم، باب التنكيل لمن اكثر الوصال: ١٩٦٥۔

قائم ہے اوران مصلحتوں ان منفعتوں کے اصول اور جوہر کو خود محمد رسول اللہ ﷺ کے صحیفہ الہامی نے ظاہر کر دیا ہے اور بتا دیا ہے۔ چنانچہ روزہ کے مقاصد اور اس کے اغراض بھی اس نے جیسا کہ ابھی کہا گیا ہے، تین مختصر فقروں میں بیان کر دیے ہیں:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا هَدَاكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تاکہ خدا نے جو تم کو ہدایت کی ہے، اس پر اس کی بڑائی اور عظمت ظاہر کرو۔''

﴿ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''تاکہ اس ہدایت کے ملنے پر تم خدا کا شکر کرو۔''

﴿ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''تاکہ تم پرہیز گار بنو (یا تم میں تقویٰ پیدا ہو)۔''

اوپر گزر چکا ہے کہ شریعت والے پیغمبروں کے حالات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان میں سے ہر ایک نے شریعت کے اترنے سے پہلے ایک مدت متعینہ تک ملکوتی زندگی بسر کی اور تا بہ امکان کھانے پینے کی انسانی ضرورتوں سے وہ پاک رہے اور انہوں نے اس طرح اپنی روح کو عالم بالا سے اتصال کے لائق بنایا۔ یہاں تک کہ وہ مکالمۂ الٰہی سے سرفراز ہوئے اور پیغام ربانی نے ان پر نزول کیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چالیس روز اسی طرح بسر کیے، تب توراۃ کی لوحیں ان کے سپرد ہوئیں، حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے بھی چالیس روز اسی طرح گزارے، تب حکمت کا سرچشمہ ان کی زبان اور سینہ سے اُبلا، محمد رسول اللہ ﷺ غار حرا میں ایک مہینہ یعنی ۳۰ دن مصروف عبادت رہے، اس کے بعد فیضان الٰہی کا نور اس غار کے دہانہ سے طلوع ہوا۔

حاملِ قرآن کی پیروی

اس سے معلوم ہوا کہ اس روزہ کی فرضیت سے سب سے پہلا مقصد انبیا علیہم السلام کے ان متبرک و مقدس ایام کی تقلید اور پیروی ہے۔ یہودی بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پیروی میں ۴۰ دنوں کا روزہ مناسب اور صرف چالیسویں دن کا روزہ فرض سمجھتے ہیں۔ عیسائیوں کو بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تقلید اور پیروی میں یہی چاہیے تھا۔ مگر انہوں نے پال کی پیروی میں جیسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اور احکام و سنن کی اتباع نہیں کی اس کی بھی نہ کی۔ اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حکم ہوا کہ وہ اپنے رسول ﷺ کی پیروی میں یہ چند دن اسی طرح گزاریں، چنانچہ فرمایا:

﴿ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''اے مسلمانو! جیسے تم سے پہلے لوگوں پر (ان کے رسولوں کی پیروی اور ہدایت ملنے کے شکریہ

میں) روزہ فرض کیا گیا تھا تم پر بھی فرض کیا گیا۔''

دین الٰہی کی تکمیل، نبوت کے اختتام اور تعلیم محمدی ﷺ کے کمال کی یہ بھی بڑی دلیل ہے کہ گزشتہ امتوں نے اپنے اپنے پیغمبروں کی تقلید اور پیروی کے جس سبق کو چند ہی روز میں بھلا دیا۔ محمد رسول اللہ ﷺ کی لاکھوں اور کروڑوں امت اس کو اب تک یاد رکھے ہوئے ہے اور اپنے رسول کی پیروی میں وہ بھی ایک مہینہ تک اسی طرح دن کو کھانے پینے اور دوسرے نفسانی خواہشوں سے اپنے کو پاک رکھتی اور ملکوتی زندگی بسر کرتی ہے۔

شکریہ

یہ روزہ انبیا علیہم السلام کی صرف پیروی اور تقلید ہی نہیں ہے۔ بلکہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے اپنے پیغمبر صادق کے ذریعہ انسانوں پر کیا شکریہ ہے اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتاب الٰہی، وہ تعلیم ربانی، وہ ہدایت روحانی جو ان ایام میں انسانوں کو عنایت ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلماتی سے نورانی بنایا، پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوج کمال تک پہنچایا، ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے، ان کی جہالت کو علم و معرفت سے، ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا، جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے الٹ دیئے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا، جس نے ذرہ بے مقدار کو آفتاب اور مشت خاک کو ہم دوش ثریا بنا دیا۔ قرآن پاک اپنے ان الفاظ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے:

﴿ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۵)

''اور (یہ رمضان کا روزہ) اس لیے (فرض ہوا) تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو کہ تم کو اس نے ہدایت دی اور تاکہ تم اس کا شکریہ ادا کرو۔''

اس ہدایتِ ربانی اور کتاب الٰہی کے عطیہ پر شکر گزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینہ کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو نمازوں (تراویح) میں پڑھتے اور سنتے ہیں اور اس مہینہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر، اللہ اکبر کا ترانہ بلند کرتے ہوئے، عیدگاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

تقویٰ

روزہ کا سب سے بڑا معنوی مقصد تقویٰ اور دل کی پرہیزگاری اور صفائی ہے۔ محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ فرمایا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ

تَتَّقُوْنَ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۳)

''اے ایمان والو! تم پر بھی اسی طرح روزہ فرض کیا گیا جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا، تا کہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

① تقویٰ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جس کے حاصل ہونے کے بعد دل کو گناہوں سے جھجک معلوم ہونے لگتی اور نیک باتوں کی طرف اس کو بے تابانہ تڑپ ہوتی ہے اور روزہ کا مقصود یہ ہے کہ انسان کے اندر یہی کیفیت پیدا ہو، بات یہ ہے کہ انسانوں کے دلوں میں گناہوں کے اکثر جذبات بہیمی قوت کی افراط سے پیدا ہوتے ہیں، روزہ انسان کے ان جذبات کی شدت کو کمزور کرتا ہے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے ان نوجوانوں کا علاج جو اپنی مالی مجبوریوں کے سبب نکاح کرنے کی قدرت نہیں رکھتے اور ساتھ ہی اپنے نفس پر بھی قابو نہیں رکھتے روزہ بتایا ہے اور فرمایا ہے کہ ''روزہ شہوت کو توڑنے اور کم کرنے کے لیے بہترین چیز ہے۔'' [1]

② اسلام کے مختلف احکام پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ روزہ کی مشروعیت میں ایک خاص نکتہ یہ ہے کہ اس میں اس بات کا خاص اشارہ ہے کہ ۱۲ مہینوں میں ایک مہینہ ہر مسلمان کو اس طرح بسر کرنا چاہیے کہ دن رات میں ایک وقت کھانا کھائے اور ہو سکے تو ایک وقت کا کھانا اپنے فاقہ زدہ محتاج اور غریب بھائیوں کو کھلا دے۔ ان تمام احکام پر نظر ڈالیے جو فدیہ اور کفارہ سے متعلق ہیں تو معلوم ہوگا کہ ان سب مواقع میں روزہ کا بدل غریبوں کو کھانا کھلانا قرار دیا گیا ہے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ روزہ اور غریبوں کو کھانا کھلانا یہ دونوں باہم ایک دوسرے کے قائم مقام ہیں، ایسے لوگ جو فطرتاً کمزور یا دائم المرض یا بہت بڈھے ہیں اور جو بہ مشکل روزہ رکھ سکتے ہوں ان کو روزہ کے بجائے حکم ہوتا ہے:

﴿وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِيْنٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸٤)

''اور جو لوگ مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہوں، وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دیں۔''

حج میں اگر کسی عذر یا بیماری کے سبب سے احرام سے پہلے سر منڈانا پڑے:

﴿فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹٦)

''تو روزہ یا خیرات یا قربانی فدیہ دے۔''

جو لوگ حج اور عمرہ ایک احرام میں ادا کریں، جس کو تمتع کہتے ہیں، ان پر قربانی واجب ہے جو غریبوں ہی میں تقسیم کی جاتی ہے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

﴿فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹٦)

''تو دس روزے رکھیں، تین حج میں اور سات گھر آ کر۔''

[1] صحيح بخاری، كتاب الصوم، باب الصوم لمن خاف على نفسه العزبة: ۱۹۰۵۔

حج میں جانور کا شکار منع ہے، اگر کوئی جان بوجھ کر ایسا کرے تو اس پر اسی جانور کے مثل کی قربانی لازم آتی ہے، جو منیٰ لے جا کر ذبح کی جائے، اگر یہ نہ ہو سکے تو:

﴿ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا ﴾ (٥/ المآئدة:٩٥)

''یا چند مسکینوں کا کھانا یا اسی کے برابر روزے۔''

اگر کوئی بالا رادہ قسم کھا کر توڑ دے تو اس پر دس مسکینوں کا کھانا واجب ہے یا ایک غلام کو آزاد کرنا، اگر یہ نہ ہو سکے:

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ﴾ (٥/ المآئدة:٨٩)

''تو تین دن کے روزے۔''

اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو محرمات سے تشبیہ دے کر اس کو اپنے اوپر حرام کر لے اور پھر اس کی طرف رغبت کرے تو اس پر ایک غلام کا آزاد کرنا لازم ہے، لیکن اگر یہ اس کی قدرت میں نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ﴾ (٥٨/ المجادله:٤)

''تو دو مہینے متواتر روزہ رکھے۔''

اور یہ بھی ممکن نہ ہو:

﴿ فَاِطْعَامُ سِتِّيْنَ مِسْكِيْنًا ﴾ (٥٨/ المجادلة:٤)

''تو ساٹھ مسکینوں کو کھانا کھلانا۔''

ان احکام سے یہ بخوبی ظاہر ہے کہ روزہ درحقیقت صدقہ و خیرات غریبوں کے کھلانے بلکہ غلاموں کو آزاد کرنے کا قائم مقام ہے۔

③ روزہ ہی امیروں اور پیٹ بھروں کو بتاتا ہے کہ فاقہ میں کیسی اذیت اور بھوک اور پیاس کی تکلیف ہوتی ہے اور اسی وقت اس کو اپنے غریب اور فاقہ سے نڈھال بھائیوں کی تکلیف کا احساس ہوتا ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ چند لقموں سے ان کی تکلیف کو دور کرنا کتنا بڑا ثواب ہے۔ جو خود بھوکا نہ ہوا س کو بھوک کی اور جو خود پیاسا نہ ہوا س کو پیاس کی تکلیف کا احساس کیوں کر ہو گا۔ بقول حافظ ابن قیم ؒ سوز جگر کے سمجھنے کے لیے پہلے سوختہ جگر ہونا ضروری ہے۔ روزہ اسی احساس کو زندہ اور ایثار، رحم اور ہمدردی کے جذبہ کو بیدار کرتا ہے۔ چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کا حال یہ تھا کہ بعض صحابہ کہتے ہیں کہ رمضان میں آپ کی سخاوت بادِ رواں کی طرح ہوتی تھی [1] اور اسی کا اثر ہے کہ آج تک مسلمانوں کے ہاں اس مہینہ میں غریبوں اور فقیروں کی امداد و اعانت اور ان کو شکم سیر کیا جاتا ہے۔

---

[1] صحیح بخاری، کتاب بدء الوحی: ٦، وکتاب الصوم، باب اجود ماکان النبی ﷺ یکون فی رمضان:١٩٠٢۔

④ انسان گو کتنا ہی نعمت و ناز کے گودوں میں پلا ہو اور مال و دولت سے مالا مال ہو، تاہم زمانہ کا انقلاب اور زندگی کی کشمکش اس کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنے جسم کو مشکلات کا عادی اور سختیوں کا خوگر بنائے، جہاد کے ہر متوقع میدان کے لیے بھوک اور پیاس کے تحمل اور صبر اور ضبط سے اپنے آپ کو آشنا رکھنے کی ضرورت ہے۔ یہی سبب ہے کہ مسلمان مجاہد اور سپاہی میدان جنگ میں بھوک اور پیاس کی تکلیف کو جس طرح ہنسی خوشی برداشت کرتا ہے، دوسرا نہیں کرتا، یہ گویا ایک قسم کی جبری فوجی ورزش ہے جو ہر مسلمان کو سال میں ایک مہینہ کرائی جاتی ہے، تاکہ وہ ہر قسم کے جسمانی مشکلات کے اٹھانے کے لیے ہر وقت تیار رہے اور دنیا کی کشمکش، جدوجہد، سختی و محنت کا پوری طرح مقابلہ کر سکے، اسی لیے روزہ کو قرآن پاک نے کبھی صبر کے لفظ سے بھی ادا کیا ہے، تاکہ اس سے روزہ کی یہ حقیقت بھی ظاہر ہو جائے۔

⑤ جس طرح حد سے زیادہ فاقہ اور بھوک انسان کے جسم کو کمزور کر دیتی ہے، اس سے کہیں زیادہ، حد سے زیادہ کھانا انسان کے جسم کو مختلف امراض اور بیماریوں کا نشانہ بنا دیتا ہے۔ طب کے تجربے اور مشاہدے یہ ثابت کرتے ہیں کہ اکثر حالتوں میں انسان کا بھوکا رہنا اس کی صحت کے لیے ضروری ہے۔ مختلف بیماریوں کا یہ قطعی علاج ہے۔ طبی ہدایت ہے کہ کم از کم ہفتہ میں ایک وقت کھانا کا ناغہ کیا جائے، اسلام میں ہفتہ وار مسنون و مستحب روزے بھی ہیں، مگر اسی کے ساتھ سال میں ایک دفعہ جسمانی فضلہ کی تخفیف کے لیے فرضاً روزہ رکھنا نہایت نفع بخش ہے، جو مسلمان رمضان کے روزے رکھتے ہیں، ان کو ذاتی تجربہ ہوگا کہ ایک مہینہ کا روزہ کتنی بیماریوں کو دور کر دیتا ہے۔ بشرطیکہ انہوں نے از خود کھانے پینے اور افطار و سحور میں بے اعتدالی نہ کی ہو، اس لیے یہ ایک قسم کا سالانہ جبری جسمانی علاج بھی ہے۔

⑥ انسان اگر اپنے دن رات کے اشغال اور مصروفیتوں پر غور کرے تو اسے معلوم ہوگا کہ اس کے وقت کا ایک اچھا خاصہ حصہ محض کھانے پینے اور اس کے اہتمام میں صرف ہو جاتا ہے۔ اگر انسان ایک وقت کا کھانا پینا کم کر دے تو اس کے وقت کا بڑا حصہ بچ جائے، یہ وقت خدا کی عبادت اور مخلوق کی خدمت میں صرف کیا جا سکتا ہے، اگر ہمیشہ نہیں تو کم از کم سال میں ایک دفعہ تو اس غیر ضروری ضرورت کو کم کر کے یہ سعادت حاصل کی جائے۔

⑦ انسان کی دماغی اور روحانی یکسوئی اور صفائی کے لیے مناسب فاقہ بہترین علاج ہے۔ جب انسان کا معدہ ہضم اور فتور سے خالی اور دل و دماغ تبخیرہ معدہ کی مصیبت سے پاک ہو، چنانچہ بڑے بڑے اکابر کا تجربہ اس حقیقت پر گواہ صادق ہے۔

⑧ روزہ بہت سے گناہوں سے انسان کو محفوظ رکھتا ہے، اس لیے یہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔ چنانچہ اوپر جہاں روزہ اور خیرات کی یکسوئی اور باہم بدل ہونے کا ذکر کیا گیا ہے، وہیں سے یہ بھی ظاہر

ہوتا ہے کہ وہ گناہوں اور غلطیوں کا کفارہ بھی ہے۔ بلکہ توراۃ میں تو اس کو خاص کفارہ ہی کہا گیا ہے۔ [1] اور اسلام میں بھی بہت سے موقعوں میں یہ کفارہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ اگر قسم کھا کر کوئی اس کو توڑنے کا گناہ کرے تو اس گناہ کی معافی کی یہ صورت ہے کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلائے اگر اس کی سکت نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا حَلَفْتُمْ ؕ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ؕ ﴾

(۵/ المآئدۃ:۸۹)

''تو تین دنوں کے روزے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے، جب قسم کھا بیٹھو اور اپنی قسموں کا لحاظ رکھو۔''

اسی طرح حج کی حالت میں شکار کرنے پر اگر قربانی نہ ہو سکے اور چند مسکینوں کو کھانا نہ کھلایا جا سکے تو:

﴿ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ؕ عَفَا اللّٰهُ عَمَّا سَلَفَ ؕ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۹۵)

''یا اس کے برابر روزہ تاکہ وہ اپنے گناہ کی سزا چکھے اللہ نے معاف کیا جو ہو چکا''

علیٰ ہذا اگر کوئی ذمی کسی مسلمان کے ہاتھ سے غلطی سے قتل ہو جائے تو اس مسلمان پر خون بہا یعنی ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا لازم آتا ہے، اگر غلام آزاد کرنے کی صلاحیت نہ ہو:

﴿ فَصِيَامُ شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ ۡ تَوْبَةً مِّنَ اللّٰهِ ؕ ﴾ (۴/ النسآء:۹۲)

''تو اس گناہ کو اللہ سے بخشوانے کے لیے دو مہینے کے لگاتار روزے رکھے۔''

اس سے اندازہ ہوگا کہ روزہ بہت سے گناہوں کا کفارہ بھی ہے۔

⑨ اس حقیقت کو ایک اور روشنی میں دیکھیے تو روزہ کی یہ امتیازی خصوصیت نمایاں ہو جائے گی روزہ کی بھوک اور فاقہ ہمارے گرم و مشتعل قویٰ کو تھوڑی دیر کے لیے سرد کر دیتا ہے۔ کھانے اور پینے کی مصروفیت سے ہم آزاد ہوتے ہیں، دوسرے سخت کاموں سے بھی ہم اس وقت پرہیز کرتے ہیں، دل و دماغ شکم سیر معدہ کے فاسد بخارات کی پریشانی سے محفوظ ہوتے ہیں۔ ہمارے اندرونی جذبات میں ایک قسم کا سکون ہوتا ہے، یہ فرصت کی گھڑیاں، یہ قویٰ کے اعتدال کی کیفیت، یہ دل و دماغ کی جمعیت خاطر، یہ جذبات کا سکون ہونا۔ ہمارے غور و فکر، اپنے اعمال کے محاسبہ، اپنے کاموں کے انجام پر نظر اور اپنے کیے پر ندامت اور پشیمانی اور خدائے تعالیٰ کی باز پرس سے ڈر کے لیے بالکل موزوں ہے اور گناہوں سے توبہ اور ندامت کے احساس کے لیے یہ فطری اور طبعی ماحول پیدا کر دیتا ہے اور نیکی اور نیک کاموں کے لیے ہمارے وجدانی ذوق و شوق کو ابھارتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ رمضان کا زمانہ تمام تر عبادتوں اور نیکیوں کے لیے مخصوص کیا گیا ہے۔ اس میں تراویح ہے۔ اس میں اعتکاف رکھا گیا ہے۔ اس میں زکوٰۃ نکالنا مستحب ہے اور خیرات کرنا سب سے بہتر

[1] احبار ۱۶۔ ۳۰ سے ۳۴ تک العہد القدیم، ص: ۸۵ و ۲۳ ۔ ۲۷، ص: ۱۹۶۔

ہے، حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی فیاضی تو گو سدا بہار تھی لیکن، رمضان کے موسم میں وہ تیز ہواؤں سے بھی زیادہ ہو جاتی تھی۔ [1]

⑩ ان باتوں کو سامنے رکھ کر یہ آسانی سے سمجھا جا سکتا ہے کہ روزہ صرف ظاہری بھوک اور پیاس کا نام نہیں ہے، بلکہ یہ درحقیقت دل اور روح کی بھوک اور پیاس کا نام ہے کہ اللہ تعالیٰ نے روزہ کی متوقع غرض و غایت تقویٰ قرار دی ہے، اگر روزہ سے روزہ کی یہ غرض و غایت حاصل نہ ہو تو یہ کہنا چاہیے کہ گویا روزہ ہی نہیں رکھا گیا یا یوں کہنا چاہیے کہ جسم کا روزہ ہو گیا، لیکن روح کا روزہ نہ ہوا۔ اسی کی تشریح محمد رسول اللہ ﷺ نے اپنے ان الفاظ میں فرمائی ہے کہ ''روزہ رکھ کر بھی جو شخص جھوٹ اور فریب کے کام کو نہ چھوڑے تو خدا کو اس کی ضرورت نہیں ہے کہ انسان اپنا کھانا پینا چھوڑ دے۔'' [2] ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''روزہ برائیوں سے روکنے کی ڈھال ہے تو جو روزہ رکھے اس کو چاہیے کہ لغو اور فحش باتیں نہ کہے اور نہ جہالت (غصہ) کرے، یہاں تک کہ اگر کوئی اس سے لڑنے مرنے پر آمادہ ہو اور گالی بھی دے تو یہی کہے کہ میں روزہ سے ہوں۔'' [3] بعض حدیثوں میں ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا: ''روزہ اس وقت تک ڈھال ہے، جب تک اس میں سوراخ نہ کرو۔'' [4] صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ! اس میں سوراخ کس چیز سے ہو جاتا ہے فرمایا: ''جھوٹ اور غیبت سے۔'' [5] چنانچہ بعض علما کی رائے میں جس طرح کھانے اور پینے سے روزہ ٹوٹ جاتا ہے اسی طرح گناہ سے بھی روزہ ٹوٹ جاتا ہے۔ [6]

⑪ تمام عبادات میں روزہ کو تقویٰ کی اصل اور بنیاد اس لیے بھی قرار دیا گیا ہے کہ یہ ایک مخفی خاموش عبادت ہے، جو ریا اور نمائش سے بری ہے، جب تک خود انسان اس کا اظہار نہ کرے، دوسروں پر اس کا راز افشا نہیں ہو سکتا اور یہی چیز تمام عبادات کی جڑ اور اخلاق کی بنیاد ہے۔

⑫ اسی اخلاص اور بے ریائی کا یہ اثر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فرمایا کہ روزہ دار میرے لیے اپنا کھانا پینا اور ملذذات کو چھوڑتا ہے، اس لیے:

((الصوم لی وانا اجزی به)) [7]

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب اجود ما کان..... : ۱۹۰۲۔ [2] صحیح بخاری، کتاب الصیام، باب من لم یدع قول الزور: ۱۹۰۳؛ ترمذی، ابواب الصوم، باب ما جاء فی التشدید فی الغیبة: ۷۰۷؛ ابوداود، کتاب الصیام، باب الغیبة للصائم: ۲۳۶۲؛ ابن ماجه، ابواب الصیام، باب ماجاء فی الغیبة والرفث للصائم: ۱۶۸۹۔

[3] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل یقول انی صائم اذا شتم: ۱۹۰٤؛ صحیح مسلم، کتاب الصیام، باب حفظ اللسان للصائم: ۲۷۰۳؛ نسائی، کتاب الصیام: ۲۲۱۸، ۲۲۱۹؛ ابوداود، باب الغیبة للصائم: ۲۳٦۳؛ مؤطا امام مالك، كتاب الصیام، باب جامع الصیام: ٦٨٩۔ [4] سنن دارمی، کتاب الصوم، باب الصائم یغتاب فیخرق صومه: ۱۷۳۲؛ نسائی، کتاب الصیام: ۲۲۳۵، ۲۲۳۷۔

[5] طبرانی فی الاوسط: ٤٥٣٦۔ [6] فتح الباری، ج ٤، ص: ۸۸۔

[7] صحیح بخاری، کتاب الصوم، باب هل یقول انی صائم: ۱۹۰٤ ومؤطا امام مالك: ٦٩٠۔

''روزہ میرے لیے ہے اور میں اس کی جزا دوں گا۔''

جزا تو ہر کام کی وہی دیتا ہے، لیکن صرف اس کی عظمت اور بڑائی کو ظاہر کرنے کے لیے اس کی جزا کو خود اپنی طرف منسوب فرمایا اور بعض علما کے نزدیک اسی کا اشارہ قرآن پاک کی اس آیت میں ہے:

﴿ اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۱۰)

''صبر کرنے والوں کو مزدوری بے حساب پوری کی جائے گی۔''

اور اتنا ظاہر ہے کہ روزہ کی مشقت اٹھانا بھی صبر کی ایک قسم ہے، اس لیے روزہ دار بھی ''صابرین'' کی جماعت میں داخل ہو کر اجر بے حساب کے مستحق ہوں گے۔

⑬ روزہ بھی چونکہ صبر کی ایک قسم ہے، بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ صبر اور تحمل و برداشت کی مشق اور ورزش کی ایک بہترین اور آسان ترین صورت ہے، اسی لیے مشکلات کے حل کرنے کے لیے دعا اور صبر کرنے کی خاص ہدایت ہوئی ہے:

﴿ وَاسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

''اور (مشکلات پر) دعا اور صبر کے ذریعہ سے مدد حاصل کرو۔''

دعا مانگنے کی ریاضت تو ہر وقت ممکن ہے کہ وہ انسان کی اختیاری چیز ہے، لیکن صبر کرنے کی مشق کرنا اختیاری نہیں، کیوں کہ قدرتی مشکلات اور مصائب کا پیش آنا انسان کے اختیار میں نہیں، اس لیے اس کی مہارت اور مشق کے لیے شریعت نے روزہ رکھا ہے، اسی لیے اس آیت بالا کی تفسیر میں صبر کے معنی روزہ کے بھی لیے گئے ہیں۔ [1]

⑭ یہی وجہ ہے کہ روزہ بھی ان اعمال حسنہ میں سے ہے، جن کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں سے خطا پوشی، گناہوں کی معافی اور اجر عظیم کا وعدہ فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

﴿ وَالصَّآئِمِیْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِیْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِیْنَ اللّٰهَ كَثِیْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِیْمًا ﴾ (۳۳/ الاحزاب:۳۵)

''اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرم گاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو زیادہ یاد کرنے والے مرد اور یاد کرنے والی عورتیں، ان کے لیے اللہ نے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ روزہ جس طرح ہمارے بعض مادی جرائم کا کفارہ ہے۔ اسی طرح ہمارے روحانی گناہوں کا بھی کفارہ ہے۔

[1] تفسیر ابن جریر طبری، تفسیر آیت مذکورہ، ج ۱، ص: ۱۹۹ مصر۔

حج

﴿وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ﴾ (۳/ ال عمران: ۹۷)

حج اسلام کی عبادت کا چوتھا رکن اور انسان کی خداپرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔اس کے لفظی معنی ''قصد اور ارادہ'' کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد اور ارادہ سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں کی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بنائی ہوئی مسجد خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔

انسانی تمدن کی ابتدائی تاریخ پڑھنے والوں کو معلوم ہے کہ انسانی جماعت کی ابتدائی شکل خاندان اور خانوادہ کی صورت میں تھی، اس سے آگے بڑھی تو چند خیموں اور جھونپڑیوں کی ایک مختصر سی آبادی بنی۔ پھر وہ شہر کی صورت میں منتقل ہوئی، اس سے ترقی کر کے اس نے ایک قوم ایک ملک کا قالب اختیار کیا اور بالآخر وہ تمام دنیا پر چھا گئی۔ مکہ اس انسانی ترقی کے تمام مدارج اور مراتب کی ایک مرتب تاریخ ہے، وہ حضرت ابراہیم خلیل علیہ السلام کے عہد میں ایک خاندان کا تبلیغی مستقر بنا۔ پھر حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ میں وہ چند خیموں اور جھونپڑیوں کی مختصر سی آبادی کی صورت میں ظاہر ہوا۔ پھر رفتہ رفتہ اس نے عرب کے مذہبی شہر کی جگہ حاصل کر لی اور محمد رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ اسلامی دنیا کا مذہبی مرکز قرار پایا۔ دنیا کی ابتدائی آبادی کے عہد میں یہ دستور تھا کہ ہر آبادی کے محصورانہ احاطہ میں دو خاص باعظمت مکان بنائے جاتے تھے۔ ایک اس آبادی کے بادشاہ کا محل یا قلعہ اور دوسرے اس آبادی کے کاہن کا معبد ہوتا تھا۔ عموماً ہر آبادی کسی نہ کسی دیوتا یا ستارہ کی طرف منسوب ہو کر اس کی حفاظت اور پناہ میں ہوتی تھی اور اسی محافظ دیوتا یا ستارہ کی وہاں پوجا ہوتی تھی۔ اس کے معبد کا صحن دارالامن ہوتا تھا۔ نذرانہ کی تمام رقمیں اور پیداواریں اس میں جمع ہوتی تھیں اور جیسے جیسے اس آبادی کی بادشاہی اور حکمرانی بڑھتی جاتی تھی، اس دیوتا کی حکومت کا رقبہ بھی بڑھتا جاتا تھا۔ [1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا آبائی وطن عراق تھا، جہاں کلدانیوں کی آبادی اور حکومت تھی۔ یہاں بھی بدستور ستاروں کی پوجا ہوتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نبوت پا کر ستارہ پرستی کے خلاف دنیا میں سب سے پہلی آواز بلند کی اور ایک خدا کی پرستش کی دعوت دی، ان کے خاندان اور قوم کے لوگوں نے ان کو اس کے لیے تکلیفیں دیں اور بالآخر ان کو اپنا وطن چھوڑ کر شام مصر اور عرب کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ یہ تمام وہ مقامات تھے، جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں، آثار، قومیات، لسانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی اور یہیں سے نکل کر وہ یمن اور خلیج فارس کے سواحل سے عراق پہنچی تھیں اور شام و فلسطین گئی تھیں اور مصر میں ہکسوس یا چرواہے (بدو) بادشاہوں کے نام سے حکمران تھیں۔ [2]

---

[1] توراۃ اور بابل، کلدان و یونان وغیرہ کی پرانی تاریخوں اور آثار قدیمہ میں اس بیان کے شواہد ملیں گے اور میری تصنیف ''ارض القرآن'' میں ان کے اقتباسات مذکور ہیں۔ [2] میری تصنیف ارض القرآن، ج ۱، ص: ۷۰ اور مابعدہ میں اس پر مفصل بحث ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مختلف شہروں کے سفر کے بعد عرب وشام کی سرحد کا رخ کیا اور بحرمیت کے پاس اردن میں اپنے بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو آباد کیا۔ اپنے بیٹے حضرت اسحاق، کو کنعان (فلسطین) میں بسایا۔ اپنے دوسرے بیٹوں مدین وغیرہ کو حجاز کی طرف بحر احمر کے ساحل پر اس مقام پر جگہ دی، جس کو ان کے انتساب سے آج تک مدین کہتے ہیں اور اس سے آگے بڑھ کر فاران کی وادی میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سکونت مقرر کی۔ یہ تمام مقامات وہ شاہراہ تھی، جس پر سے مصر وشام سے حجاز ویمن اور حجاز ویمن سے مصر وشام آنے جانے والے تاجروں سوداگروں اور قافلوں کا تانتا لگا رہتا تھا۔ اپنی اولاد کو اس خاص سلسلہ سے آباد کرنے سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے دو مقصد تھے، ایک یہ کہ تجارتی قافلوں کی آمد و رفت کی بنا پر اس کو غلہ اور ضروری سامان کے ملنے میں تکلیف نہ ہو اور ساتھ ہی وہ بھی اس سوداگری میں بہ آسانی شریک ہو سکے اور دوسرا یہ کہ خدا کی خالص توحید کی تبلیغ کے لیے قوموں کے یہ گزرگاہ بہترین تبلیغی مرکز تھے، یہاں وہ عراق وشام کی جبار و قہار قوموں کے حدود سے جو مشہور بت پرست اور ستارہ پرست تھیں، علیحدہ رہ کر لوگوں میں دین حق کو پھیلا سکتی تھی۔

بیت اللہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دستور یہ تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا، وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر اور قربان گاہ بنا لیتے تھے۔ چنانچہ تورات کتاب پیدائش میں ان کی تین قربانگاہوں یا خدا کا گھر بنانے کے واقعات مذکور ہیں۔

''تب خداوند نے ابرام کو دکھائی دے کے کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا اور اس نے وہاں خداوند کے لیے جو اس پر ظاہر ہوا ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں سے روانہ ہو کے اس نے بیت ایل (بیت اللہ) کے پورب کے ایک پہاڑ کے پاس اپنا ڈیرہ کھڑا کیا، بیت ایل اس کے پچھم اور عَیْ اس کے پورب تھا اور وہاں اس نے خدا کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور خداوند کا نام لیا، (۱۲۔۷و۸ العہد القدیم ،ص:۱۹)

اس کے بعد ہے۔

''اور وہ (ابراہیم) سفر کرتا ہوا دکھن سے بیت اللہ میں اس مقام تک پہنچا، جہاں اس نے شروع میں ایک قربان گاہ بنائی اور وہاں ابراہیم نے خدا کا نام لیا۔'' (۱۳۔۳،۴،ص:۲۰)

پھر ایک اور جگہ پہنچے جہاں ان کو خدا کی وحی اور برکت کا پیام پہنچا اور حکم ہوا:

''اٹھ اور اس ملک کے طول وعرض میں پھر کہ میں اسے تجھ کو دوں گا اور ابراہیم نے اپنا ڈیرہ اٹھایا اور ممرے کے بلوطوں میں جو جبروں میں ہیں، جا رہا اور وہاں ایک قربان گاہ بنائی۔''

(۱۳۔۱۷۔۱۸،ص:۲۰)

اسی قسم کی قربان گاہیں اور خدا کے گھر حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، اور حضرت موسیٰ علیہم السلام نے بھی

بنائے اور آخر حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام نے بیت المقدس کی تعمیر کی جو بنی اسرائیل کا کعبہ اور قبلہ قرار پایا۔ حضرت اسحاق علیہ السلام کے حال میں ہے کہ جہاں ان پر وحی اور وعدہ کی بشارت نازل ہوئی:

"اور اس نے وہاں مذبح بنایا اور خداوند کا نام لیا اور وہاں اپنا خیمہ کھڑا کیا اور وہاں اسحاق علیہ السلام کے نوکروں نے کنواں کھودا۔" (پیدائش ۲۶۔۲۵، ص:۴۱)

حضرت یعقوب علیہ السلام کو جہاں مقدس رؤیا ہوئی، وہاں:

"اور یعقوب صبح سویرے اٹھا اور اس پتھر کو جسے اس نے اپنا تکیہ کیا تھا، کھڑا کیا اور اس کے سرے پر تیل ڈالا اور اس مقام کا نام بیت ایل رکھا اور یہ پتھر جو میں نے ستون کھڑا کیا خدا کا گھر ہوگا اور سب میں سے جو تو مجھے دے گا دسواں حصہ (عشر) تجھے (خدا کو) دوں گا۔"

(۲۸۔۱۸۔۲۲، ص:۴۵)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے:

"اور اگر تو میرے لیے پتھر کی قربان گاہ بنائے، تو تراشے ہوئے پتھر کی مت بنائیو، کیونکہ اگر تو اس کے لیے اوزار لگائے گا تو اسے ناپاک کرے گا اور تو میری قربان گاہ پر سیڑھی سے ہرگز مت چڑھیو، تاکہ تیری برہنگی اس پر ظاہر نہ ہو۔" (خروج ۲۰۔۲۵۔۲۶، ص:۱۲۰)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خدا کے حکم کے بموجب

"اور پہاڑ کے تلے ایک قربان گاہ اور بنی اسرائیل کے بارہ فرقوں کے لیے بارہ ستون بنائے اور سلامتی کے ذبیحے بیلوں سے خداوند کے لیے ذبح کیے اور موسیٰ علیہ السلام نے آدھا خون لے کے باسنوں میں رکھا اور آدھا قربان گاہ پر چھڑکا۔" (خروج ۲۴۔۴۔۶ و ۷، ص:۱۲۵)

اوپر کے اقتباسات میں اس قسم کی تعمیر یا مکان کا ایک نام (مذبح، قربان گاہ) بتایا گیا ہے اور دوسرا بیت ایل یعنی بیت اللہ اور خدا کا گھر، اس سے ثابت ہوا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی نسل میں اس قسم کی قربان گاہ اور بیت اللہ بنانے کا دستور تھا، اسی قسم کا وہ گھر ہے جو مکہ معظمہ میں، کعبہ، مسجد حرام اور مسجد ابراہیم کے نام سے آج تک قائم ہے، بلکہ اس کی نسبت اسلام کا یہ دعویٰ ہے کہ وہ دنیا میں خدا کا پہلا گھر ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی اور اس کے شرائط

اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں یہ بحث تفصیل سے آچکی ہے کہ قرآن پاک کے بموجب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے جس محبوب اور اکلوتے بیٹے کی قربانی کا خواب دیکھا تھا اور توراۃ کے مطابق جس کی قربانی کا حکم ہوا تھا، وہ حضرت اسماعیل علیہ السلام تھے اور یہ بحث بھی وہیں گزر چکی ہے کہ قربانی کرنے سے توراۃ کے محاورہ میں یہ مقصود ہے کہ وہ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کر دیا جائے، وہ نذر کردہ،

جانوروں پر ہاتھ رکھ دیتا تھا اور وہ جانور اس کی طرف قربانی کیے جاتے تھے، جو لوگ خدا کی عبادت گاہ کی خدمت کے لیے نذر کیے جاتے تھے، وہ نذر کے دنوں میں سر نہیں منڈاتے تھے، جب نذر کے دن پورے ہو جاتے تھے تب ان کا سر مونڈا جاتا تھا، جو قربانی یا نذر پیش کی جاتی تھی وہ پہلے قربان گاہ پر ہلائی یا پھرائی جاتی تھی، اس کے بعد وہ قربانی کی جاتی یا جلائی جاتی تھی۔

ملت ابراہیمی کی حقیقت قربانی ہے

توراۃ اور قرآن پاک دونوں سے یہ ثابت ہے کہ ملت ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصلی خصوصیت تھی اور اسی امتحان اور آزمائش میں پورے اترنے کے سبب سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالا مال کی گئی، توراۃ کی کتاب پیدائش میں ہے:

"خداوند فرماتا ہے، اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا ہاں اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا، میں نے اپنی قسم کھائی کہ میں برکت دیتے ہی تجھے برکت دوں گا اور بڑھاتے ہی تیری نسل کو آسمان کے ستاروں اور دریا کے کنارے کے ریت کے مانند بڑھاؤں گا اور تیری نسل اپنے دشمنوں کے دروازوں پر قابض ہو جائے گی اور تیری نسل سے زمین کی ساری قوم برکت پائے گی، کیونکہ تو نے میری بات مانی"۔ (۲۲۔۱۶۔۱۷۔۱۸، ص:۲۳)

قرآن پاک میں ہے:

﴿ وَاِذِ ابْتَلٰٓى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ۭ قَالَ اِنِّىْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ۭ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۴)

"اور جب ابراہیم کے پروردگار نے چند باتوں میں اس کی آزمائش کی، پھر اس نے ان کو پورا کیا، تو خدا نے اس سے کہا، کہ میں تجھ کو لوگوں کے لیے پیشوا بنانے والا ہوں۔"

﴿ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۳۰۔۱۳۱)

"اور ہم نے ابراہیم کو دنیا میں چنا اور وہ آخرت میں یقیناً نیکوں میں سے ہے، جب اس کے خدا نے اس سے کہا کہ اپنے کو سپرد کر دے، اس نے کہا میں نے اپنے کو دنیا کے پروردگار کے سپرد کر دیا۔"

﴿ يّٰٓاِبْرٰهِيْمُ ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ﴾

(۳۷/ الصّٰفّٰت:۱۰۴۔۱۰۵)

"اے ابراہیم! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم یونہی اچھے کام کرنے والوں کو بدلہ دیتے ہیں۔"

یہی وہ برکت ہے جس کو مسلمان دن میں پانچ مرتبہ خدا کے سامنے یاد کرتے ہیں:

((اَللّٰھُمَّ بَارِكْ عَلٰی مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِ مُحَمَّدٍ كَمَا بَارَكْتَ عَلٰی اِبْرَاھِیْمَ وَعَلٰی اٰلِ اِبْرَاھِیْمَ))

''خدایا! تو محمد اور محمد ﷺ کی (جسمانی وروحانی) نسل پر برکت نازل کر، جس طرح تو نے ابراہیم اور ابراہیم کی (جسمانی وروحانی) نسل پر برکت نازل کی۔''

لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی، بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی، یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی، یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی، یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا، یہ تسلیم ورضا اور صبر وشکر کا وہ امتحان تھا، جس کو پورا کیے بغیر دنیا کی ''پیشوائی'' اور آخرت کی ''نیکی'' نہیں مل سکتی، یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا، بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظلِ مجاز تھا۔

اسلام قربانی ہے

اسلام کے لفظی معنی ''اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت اور بندگی کے لیے گردن جھکا دینا ہے'' اور یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کے اس ایثار اور قربانی سے ظاہر ہوتی ہے، یہی سبب ہے کہ ان باپ بیٹوں کی اس اطاعت اور فرمانبرداری کے جذبہ کو صحیفہ محمدی ﷺ میں اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے، فرمایا:

﴿ فَلَمَّآ اَسْلَمَا وَتَلَّهٗ لِلْجَبِیْنِ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت ۳۷:۱۰۳)

''جب ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل اسلام لائے، (یا فرمانبرداری کی یا اپنے کو خدا کے سپرد کر دیا) اور ابراہیم نے اپنے بیٹے (اسماعیل) کو پیشانی کے بل زمین پر لٹایا۔''

﴿ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۱۳۰۔۱۳۱)

''اور کون ابراہیم کی ملت کو پسند نہ کرے گا، لیکن وہ جو خود بیوقوف بنے، ہم نے اس کو دنیا میں مقبول کیا اور وہ آخرت میں بھی نیکوں میں سے ہوگا، جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ اسلام لا، (یا فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے) اس نے کہا: میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی، (یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا)۔''

الغرض ملت ابراہیمی کی حقیقت یہی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس کے آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا تھا، یہی اسلام کی حقیقت ہے اور یہی ابراہیمی ملت ہے اور اسی بارِ امانت کو اٹھانے کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام بار بار خدا سے دعا فرماتے تھے، کہ ان کی نسل میں اس بوجھ کے اٹھانے والے ہر زمانہ میں موجود رہیں اور بالآخران کی نسل میں وہ امین پیدا ہو، جو اس امانت کو لے کر تمام دنیا میں وقف عام کر دے، چنانچہ دعا فرمائی تو یہ فرمائی:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ۝ ﴾ (۸/ البقرۃ:۱۲۸ـ۱۲۹)

”ہمارے پروردگار! ہم کو مسلمان (یا اپنا فرماں بردار) بنا اور ہماری نسل میں سے ایک مسلمان (یا اپنی فرمانبردار) جماعت بنا اور ہم کو مناسک (حج کے دستور) بتا اور ہم کو معاف کر، بے شک تو معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! اس میں اپنا ایک رسول بھیج جو تیری آیتیں ان کو پڑھ کر سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت سکھائے اور ان کو پاک اور صاف کرے، تو غالب اور حکمت والا ہے“۔

یہ رسول محمد رسول اللہ ﷺ تھے، یہ کتاب قرآن پاک تھی، یہ حکمت سینہ محمدی ﷺ کا خزانہ علمی و عملی تھا اور یہ مناسک اسلام کے ارکان حج تھے۔

یہ قربانی کہاں ہوئی؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی کہاں کی، توراۃ میں اس مقام کا نام مورہ یا موریہ بتایا گیا ہے، بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطون کے جھنڈ، یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے، لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے، چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے، جو عبرانی، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ میں ۱۸۹۰ء میں اوکسفورڈ یونیورسٹی کے مطبع میں چھپا ہے، اس میں اس مقام کا نام ”مُریا“ لکھا ہے اور اس کے فارسی ترجمہ میں جو انہی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء میں لندن میں چھپا ہے، اس کا تلفظ ”موریا“ کیا ہے اور درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کعبہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے، اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے:

”خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم! عرض کرد لبیک، گفت کہ اکنون پسر خودرا کہ یگانہ تست و اورا دوست می داری یعنی اسحاق رابردار و بزمین موریا برد، و اور ادر آن جا بریکے از کوہ ہائے کہ بتو نشان می دہم برائے قربانی سوختنی بگذران،

بامدادان (صبح) ابراہیم برخاستہ الاغ (گدہا) خودرا بیاراست و دونفراز نوکران خودرا باپسر خویش "اسحاق" برداشتہ و ہیزم برائے قربانی سوختنی شکستہ روانہ شد، و بسوئے آں مکانی کہ خدا اورا فرمودہ بود، رفت، و در روز سوم ابراہیم چشماں خودرا بلند کردہ آن مکان را از دوردید، آنگاہ ابراہیم بخادمان گفت شما ایں جابمانید، تامن باپسر بد انجا رویم، و عبادت (دوسرے ترجموں میں سجدہ ہے) کردہ نزد وشما باز آئیم" (پیدائش ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے اور مسلمان متکلمین نے قطعی دلیلوں سے اس تحریف و اضافہ کو ثابت کیا ہے، اس کتاب کی پہلی جلد کے مقدمہ میں اس پر مختصر بحث گزر چکی ہے اور ہماری جماعت میں سے، جناب مولانا حمید الدین صاحب مرحوم نے "الرای الصحیح فی من ھو الذبیح" نام ایک عربی رسالہ خاص اس مسئلہ پر مدلل و مفصل لکھا ہے، اس لیے یہاں بحث بے محل ہے، بہر حال حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے جو مقام بتایا گیا تھا، وہ سرزمین مروہ تھی، وہ اس مقام سے جہاں وہ قیام پذیر تھے، چند روز کی مسافت پر تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزاری جائے، وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو، خاص کر اس لیے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف و مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جا سکے کہ "میں وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں"۔ یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتیں اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لیے کسی دوسرے مقام کو ثابت کر سکے اور نہ عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاق علیہ السلام کی نسل (بنی اسرائیل) میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس یا مسیح علیہ السلام کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے کسی یادگاری اثر کا تعلق پہلے تھا، نہ اب ہے۔

برخلاف اس کے بنو اسماعیل یعنی اسماعیلی عربوں میں اس قربانی اور اس کے خصوصیات کی ایک ایک یادگار ہزار ہا برس سے محفوظ چلی آئی تھی اور گو اس میں امتداد زمانہ اور تغیرات کے سبب سے کسی قدر کمی بیشی، یا بعد کی گمراہیوں کے سبب سے اس میں بعض مشرکانہ رسوم کی آمیزش ہو گئی تھی، تاہم اصل شے باقی تھی، عرب میں بت پرست بھی تھے، ستارہ پرست بھی تھے، کافر بھی تھے، مشرک بھی تھے، بلکہ عیسائی بھی تھے اور یہودی بھی تھے، مگر عربوں کے قدیم اشعار سے ثابت ہے، کہ ان سب کو خانہ کعبہ اور حج کے مراسم کی اہمیت کا یکساں اعتراف تھا، یہاں تک کہ عیسائی عرب بھی اس کی قسمیں کھاتے تھے اور غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ میں جہاں مشرکوں کے بتوں کی صفیں تھیں، حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت مریم علیہا السلام کی تصویریں بھی تھیں۔ [1]

---

[1] اخبار مکہ للازرقی، ج۱، ص:۱۰٤ وفتح الباری ابن حجر، کتاب المغازی، باب این رکز النبی ﷺ، ج۸، ص:۱٤ وسیرۃ ابن ہشام، ذکر الاسباب الموجبۃ للمسیر الی مکۃ وفتح مکۃ، ج۲، ص:۲۷۳۔

مکہ اور کعبہ

کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفا کے خیال کے مطابق عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا ''سمت القدم'' ہے، وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا، سب بڑے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا کہ

﴿ اَوَّلَ بَيۡتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ ﴾ (۳/ ال عمران: ۹۶)

''سب سے پہلا خدا کا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا۔''

وہ وہی تھا، لیکن حضرت ابراہیم علیہ السلام سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدہ میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا، تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چہار دیواری بلند کر کے، دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے، چنانچہ قرآن پاک کے بیان کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں بھی ﴿ بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۹) (پرانا گھر) تھا، کوئی نیا گھر نہ تھا، حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام نے مل کر، اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر، پھر نئے سرے سے ان پر چہار دیواری کھڑی کی، فرمایا ﴿ اِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۷) (ابراہیم علیہ السلام جب اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے) اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی، حضرت ابراہیم علیہ السلام و اسماعیل علیہ السلام نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا، حضرت ابراہیم علیہ السلام نے عراق، شام، مصر، ہر جگہ پھر کر، آخر اسی گمنام گوشہ کو منتخب کیا، جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چار طرف سے پہاڑیوں سے گھرا تھا، اس لیے قرآن پاک نے کہا:

﴿ وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔا ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۶)

''اور ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ میرے ساتھ کسی کو شریک نہ بنا۔''

اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی، البتہ دیواریں بے نشان تھیں، تو ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو اسی گھر کی جگہ بتا دی اور اس کو ان کی جا پناہ اور ٹھکانا بنا دیا کہ بت پرستوں کے شر اور فتنہ سے محفوظ رہ کر دین حق کی تبلیغ کریں۔ توراۃ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے یہ معبد موجود تھا، کیوں کہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی یا نذر یا عبادت کی جائے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو، اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کرنے کے لیے لائے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا تھا کہ وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں، ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو، اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف اس گھر کی ایجاد نہیں، بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے۔ ﴿ وَطَهِّرۡ بَيۡتِىَ ﴾ ''اور میرے گھر کو عبادت گاہوں کے لیے پاک و صاف کر۔'' اس وقت تک اس

سرزمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا، یہ لفظ تو مجموعہ توراۃ میں حضرت سلیمان علیہ السلام کے زمانہ سے ملتا ہے، اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا کہ یہ شام کے جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا اور کبھی اس کا نام بیابان تھا اور آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا لفظ عرب (عربیہ) کے اصلی معنی بیابان وصحرا ہی کے ہیں۔ ❶ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جس وقت یہ فرمایا تھا:

﴿ رَبَّنَآ اِنِّیْٓ اَسْکَنْتُ مِنْ ذُرِّیَّتِیْ بِوَادٍ غَیْرِ ذِیْ زَرْعٍ ﴾ (١٤/ ابراھیم :٣٧)

''خداوندا! میں نے اپنی کچھ اولاد کو ایک بن کھیتی کی ترائی میں لا کر بسایا ہے۔''

تو حقیقت میں یہ بن کھیتی کی ترائی اور بے آب و گیاہ میدان اس وقت اس کی ایک امتیازی صفت تھی اور آخر یہی صفت اس ملک کا خاص نام بن گئی اور اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں حضرت اسماعیل علیہ السلام کو آباد کرتے ہوئے یہ دعا مانگی تھی:

﴿ وَّارْزُقْ اَھْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾ (٢/ البقرة :١٢٦)

''اور خداوندا! یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں کی روزی پہنچا۔''

مکہ قدیم زبانوں کے بعض محققوں کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے، جس کے اصلی معنی ''گھر'' کے ہیں ❷ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں، ایک تو یہ کہ یہ آبادی اس وقت قائم ہوئی، جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور لغوی دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس شہری آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داوٗد علیہ السلام کی زبور میں سب سے پہلے نظر آتا ہے۔ پہلی جلد کے مقدمہ میں اس کا حوالہ گزر چکا ہے۔ یہاں یہ اضافہ کرنا ہے کہ قدیم شامی زبان میں بک کے معنی آبادی یا شہر کے ہیں، جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے، یعنی بعل کا شہر (بعل دیوتا کا نام ہے) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے اور کعبہ کی ابتدائی تعمیر کے وقت یہی نام قرآن پاک میں آیا ہے:

﴿ اِنَّ اَوَّلَ بَیْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِیْ بِبَکَّةَ ﴾ (٣/ آل عمران :٩٦)

''پہلا گھر جو لوگوں کی عبادت کے لیے بنایا گیا، وہ وہی ہے جو مکہ میں ہے۔''

کعبہ کے لغوی معنی چوکھونٹے کے ہیں، چونکہ یہ گھر چوکھونٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے بھی مشہور ہوا۔

---

❶ اس تحقیق پر مفصل بحث میری تصنیف ارض القرآن کی پہلی جلد میں ہے از صفحہ: ۵۷ تا صفحہ: ۶۰ طبع اول۔

❷ تاریخ العرب قبل الاسلام جرجی زیدان، ص: ٢٤٤ مصر۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے، یونان کا مشہور مؤرخ ڈیوڈورس جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ایک صدی پہلے گزرا ہے، وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے:

''ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے، جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔ [1]

ثمود کا مقام شام وحجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں، ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزت سارے عرب کرتے ہوں، خانہ کعبہ ہے، رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے، پروکوپس مؤرخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار ریلز یر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا، اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے، کیوں کہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا، اس پر سپہ سالار نے کہا:

''تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے، جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔'' [2]

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

ان تمام شہادتوں سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اہل عرب یا بنی اسماعیل ہمیشہ سے اپنے ان موروثی مراسم کو ادا کرتے تھے اور اس کی اکثر خصوصیات کو پوری حفاظت کے ساتھ باقی رکھے ہوئے تھے۔ جاہلیت کے اشعار میں حج اور ارکان حج کا ذکر بکثرت ملتا ہے۔ [3] یہاں تک کہ عیسائی عرب شعرا بھی عزت کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے تھے۔ عرب کے بازاروں اور میلوں کی روایات کے قائم رکھنے میں بھی اس موسمِ حج کا اچھا خاصہ حصہ تھا۔ [4] اور اسی کے سبب سے محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت کو ہجرت سے پہلے ہی عرب کے دور دراز گوشوں میں یہاں تک کہ یمن و بحرین تک میں پہنچنے میں کامیابی ہوئی، کیوں کہ حج کے موسم میں عرب کے تمام قبیلے مکہ کی وادی میں اس موروثی رسم کو ادا کرنے کے لیے جمع ہو جاتے تھے۔

حج ابراہیمی یادگار ہے

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے بیٹے کی قربانی کا جو خواب دیکھا اور اس پر لبیک کہا تھا اور جس کی تعمیل کے لیے وہ اس دور دراز مقام میں آئے تھے اور عین اس وقت جب چھری لے کر بیٹے کو خدا کی راہ میں قربان کرنا چاہا تھا اور بیٹے نے بھی خدا کا حکم سن کر گردن جھکا دی تھی، تو آواز آئی تھی:

---

[1] گبن کی تاریخ عروج و زوال روم، باب: ۵۰۔ [2] نتائج الافهام فی تقویم العرب قبل الاسلام محمود پاشا فلکی مطبع امیریہ بولاق مصر، ص: ۳۵ بحوالہ (فرنچ) ایشیاٹک جرنل اپریل ۱۸۸۳ء۔

[3] مولانا حمید الدین صاحب نے اپنے تصنیف الامعان فی اقسام القرآن، ص: ۳۶ تا ۳۸ میں اس قسم کے اشعار جمع کر دیے ہیں۔ [4] کتاب الامکنۃ والازمنۃ امام مرزوقی طبع حیدرآباد، ج ۲، ص: ۱۶۱ باب: ۴۰۔

﴿ اَنْ يّٰۤاِبْرٰهِيْمُۙ۝ قَدْ صَدَّقْتَ الرُّءْيَا ۚ اِنَّا كَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ۝ اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْبَلٰٓؤُا الْمُبِيْنُ۝ وَفَدَيْنٰهُ بِذِبْحٍ عَظِيْمٍ۝ ﴾ (۳۷/ الصّٰفّٰت: ۱۰۴۔۱۰۷)

'' یہ کہ اے ابراہیم علیہ السلام! تو نے اپنا خواب سچ کر دکھایا، ہم ایسا ہی نیکوکاروں کو بدلہ دیتے ہیں...... اور ایک بڑی قربانی دے کر ہم نے اس کے بیٹے کو چھڑا لیا''

اس وقت ان کو معلوم ہوا کہ اس خواب کی تعبیر بیٹے کو خدا کے گھر کی خدمت اور توحید کی دعوت کے لیے مخصوص کر دینا اور اس کے ذریعہ سے اس گھر کو دائرہ ارضی میں خدا پرستی کا مرکز بنانا ہے:

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِىَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ۝ وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ قَالَ وَمَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِيْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗٓ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ۭ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ۝ وَاِذْ يَرْفَعُ اِبْرٰهٖمُ الْقَوَاعِدَ مِنَ الْبَيْتِ وَاِسْمٰعِيْلُ ۭ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ۭ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ۝ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَآ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۠وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ۝ رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيْهِمْ ۭ اِنَّكَ اَنْتَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ۝ وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ۭ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِي الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِي الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۵۔۱۳۱)

'' اور یاد کرو جب ہم نے اس گھر کو لوگوں کا مرجع اور امن بنایا اور (کہا کہ) ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ اور ابراہیم و اسماعیل سے عہد لیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف اور قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کرو اور یاد کرو جب ابراہیم نے کہا کہ میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور اس کے بسنے والوں کو کچھ پھلوں کی روزی دے جو ان میں سے خدا اور پچھلے دن پر ایمان لائے، خدا نے کہا اور جس نے انکار کیا اس کو تھوڑا فائدہ پہنچاؤں گا، پھر اس کو دوزخ کے عذاب کے حوالہ کروں گا اور وہ کتنی بری بازگشت ہے اور یاد کرو جب ابراہیم اور اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے (اور یہ دعا مانگ رہے تھے کہ) ہمارے رب! (ہماری اس تعمیر کو) ہم سے قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ اے ہمارے رب! اور ہم کو اپنا ایک تابع دار (مسلم) فرقہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے ارکان بتا اور ہم پر اپنی رحمت رجوع کر (ہماری توبہ قبول کر) تو توبہ قبول کرنے والا اور رحم والا ہے،

اے ہمارے رب! ان میں انہیں میں سے ایک کو رسول بنا کر بھیج جو ان کو تیری آیتیں سنائے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور ان کو پاک وصاف بنائے، بے شک تو غالب اور دانا ہے اور ابراہیم علیہ السلام کے دین سے کون منہ پھیرے گا، بجز اس کے جو اپنے آپ کو نادان بنائے، حالانکہ ہم نے اس کو (ابراہیم کو) دنیا میں چنا اور آخرت میں وہ نیکوکاروں میں سے ہوگا یاد کرو جب اس کے رب نے اس سے کہا کہ تابعدار (مسلم) بن جا، اس نے کہا کہ عالم کے پروردگار کا میں تابع دار (مسلم) بن گیا۔"

﴿ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرٰهِيمَ مَكَانَ الْبَيْتِ أَنْ لَّا تُشْرِكْ بِي شَيْئًا وَّطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِينَ وَالْقَآئِمِينَ وَالرُّكَّعِ السُّجُودِ۝ وَأَذِّنْ فِي النَّاسِ بِالْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَّعَلٰى كُلِّ ضَامِرٍ يَّأْتِينَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ۝ لِّيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْ بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۚ فَكُلُوا مِنْهَا وَأَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيرَ۝ ثُمَّ لْيَقْضُوا تَفَثَهُمْ وَلْيُوفُوا نُذُورَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوا بِالْبَيْتِ الْعَتِيقِ۝ ذٰلِكَ ۚ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾

(٢٢/ الحج: ٢٦۔٣٠)

"اور یاد کرو جب ہم نے ابراہیم کے لیے اس گھر کی جگہ کو ٹھکانا بنایا کہ کسی کو میرا ساجھی نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف قیام اور رکوع اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے، وہ تیرے پاس پیادہ اور (دور کے سفر سے تھکی ماندی) دبلی سواریوں پر ہر دور دراز راستہ سے آئیں گے، تا کہ وہ اپنے نفع کی جگہوں پر حاضر ہوں اور ہم نے ان کو جو چوپائے جانور روزی دیے ہیں، ان پر ان (کی قربانی) پر چند جانے ہوئے دنوں میں خدا کا نام لیں تو ان میں سے کچھ تم کھاؤ اور بدحال فقیر کو کھلاؤ، اس کے بعد اپنا میل کچیل دور کریں اور اپنی منتیں پوری کریں اور اس قدیم گھر کا چکر لگائیں، یہ سن چکے اور جو کوئی اللہ کے آداب کی بڑائی رکھے تو وہ اس کے لیے اس کے رب کے پاس بہتر ہے۔"

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا الْبَلَدَ آمِنًا وَّاجْنُبْنِي وَبَنِيَّ أَنْ نَّعْبُدَ الْأَصْنَامَ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ النَّاسِ ۚ فَمَنْ تَبِعَنِي فَإِنَّهٗ مِنِّي ۚ وَمَنْ عَصَانِي فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ۝ رَبَّنَآ إِنِّيٓ أَسْكَنْتُ مِنْ ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ ۙ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ فَاجْعَلْ أَفْئِدَةً مِّنَ النَّاسِ تَهْوِيٓ إِلَيْهِمْ وَارْزُقْهُمْ مِّنَ الثَّمَرٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ۝ رَبَّنَآ إِنَّكَ تَعْلَمُ مَا نُخْفِي وَمَا نُعْلِنُ ۗ وَمَا يَخْفٰى عَلَى اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ۝ ﴾ (١٤/ ابراهيم: ٣٥۔٣٩)

''اور یاد کرو جب ابراہیم نے یہ دعا کی کہ، اے میرے پروردگار! اس شہر کو امن والا بنا اور مجھ کو اور میری اولاد کو بتوں کی پرستش سے بچا، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہتوں کو گمراہ کیا ہے تو جو میری پیروی کرے گا، وہ مجھ سے ہوگا اور جو میری نافرمانی کرے گا تو، تو بخشنے والا مہربان ہے، اے ہمارے پروردگار! ہم نے اپنی کچھ اولاد کو اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے، اے ہمارے پروردگار! یہ اس لیے، تاکہ یہ تیری نماز کھڑی کریں، تو کچھ لوگوں کے دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف مائل ہوں اور ان کو کچھ پھلوں کی روزی دے، تاکہ یہ تیرے شکرگزار رہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھے معلوم ہے جو ہم چھپائیں اور جو ظاہر کریں اور اللہ سے زمین میں اور نہ آسمان میں کچھ چھپا ہے۔''

﴿ قُلْ صَدَقَ اللّٰهُ ۟ فَاتَّبِعُوْا مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ؕ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۝ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِيْ بِبَكَّةَ مُبٰرَكًا وَّهُدًى لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ فِيْهِ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ مَّقَامُ اِبْرٰهِيْمَ ۚ وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا ؕ وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلًا ؕ وَمَنْ كَفَرَ فَاِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۹۵۔۹۷)

''کہہ کہ خدا نے سچ فرمایا، تو ابراہیم کے دین کی پیروی کر، شرک سے منہ موڑ کر اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا، بے شک وہ پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا، وہی ہے جو مکہ میں ہے بابرکت اور دنیا کے لیے راہ نما اس میں کچھ کھلی ہوئی نشانیاں ہیں، ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ اور جو اس میں داخل ہوا وہ امن پا جائے اور خدا کا لوگوں پر اس گھر کا قصد کرنا فرض ہے، جس کو اس کے راستہ (سفر) کی طاقت ہو اور جو اس قدرت کے باوجود اس سے باز رہے، تو خدا دنیا والوں سے بے نیاز ہے۔''

یہ وہ آیتیں ہیں جن کا تعلق اس موضوع سے ہے، ان میں نہایت وضاحت کے ساتھ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کو بت پرست اور ستارہ پرست ملکوں سے ہٹا کر جن میں وہ سرگرداں اور آوارہ پھر رہے تھے اور ایک امن کے سنسان مقام کی تلاش میں تھے، تاکہ وہ خدائے واحد کی پرستش کے لیے ایک گھر بنائیں، یہ ٹھکانا عنایت کیا، جو ازل سے اس کام کے لیے منتخب تھا، تاکہ وہ یہاں خدا کے گھر کی منہدم چہار دیواری کو کھڑی کریں اور پھر اس کو توحید کا مرکز اور عبادت گزاروں کا مسکن بنائیں۔

یہ مقام ویران اور پیداوار سے خالی تھا، اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی کہ خداوند! یہاں تیرے مقدس گھر کے پڑوس میں اپنی کچھ اولاد بساتا ہوں، ان کو روزی پہنچانا اور لوگوں کے دلوں کو مائل کرنا کہ وہ ادھر آتے رہیں اور ان کو اس لیے یہاں بساتا ہوں، تاکہ وہ آس پاس کی بت پرست قوموں کی بت پرستی

سے بچے رہیں اور تیری خالص عبادت بجالائیں، ان میں جو نیکوکار ہوں، وہ میرے ہیں اور جو بدکار اور گمراہ ہوں ان کا تو مالک ہے، تو رحم والا اور معاف کرنے والا ہے اور خداوند! میری اولاد میں ایک رسول بھیجنا، جو ان کو نیک تعلیم دے۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس مقام اور اس گھر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بہت سی یادگار نشانیاں ہیں اور ان کے کھڑے ہونے اور نماز پڑھنے کی جگہ اور قربانی کا مقام ہے، اس لیے لوگوں کو چاہیے کہ دور دور سے یہاں آئیں اور اپنے دینی و دنیاوی فائدوں کو حاصل کریں اور اس قدیم خانہ خدا کا طواف کریں اور یہاں اسماعیل علیہ السلام کی یادگار میں قربانی کر کے غریبوں کو کھلائیں اپنی نذر پوری کریں اور اس حالت میں وہ امن و سلامتی کے مجسم پیکر ہوں، نہ وہ کسی پر ہتھیار اٹھا سکتے ہوں، نہ ایک چیونٹی تک کو مار سکتے ہوں اور وہ اس حالت میں ظاہری زیبائش و آرائش اور عیش و آرام اور پر تکلف مصنوعی زندگی سے بھی پاک ہوں اور چند روز یہاں ابراہیمی یادگاروں پر ٹھہر کر ابراہیمی زندگی بسر کر کے ابراہیمی طریقہ پر خدا کو یاد کریں۔

اوپر توراۃ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد کا دستور تھا کہ وہ جہاں کہیں کوئی ربانی کرشمہ دیکھتے تھے، تمدن کے اس ابتدائی عہد میں کسی بڑی تعمیر کے بجائے وہ بن گھڑے پتھر کو کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے، وہاں قربانی کرتے اور خدا کی عبادت کرتے تھے۔ اس قسم کا گھر یہ خانہ کعبہ تھا، یہ بھی توراۃ کے حوالوں سے گزر چکا ہے کہ خدا کے گھر کی خدمت اور عبادت کے لیے جو شخص نذر کیا جاتا تھا، وہ اتنے دنوں تک سر نہیں منڈاتا تھا، نذر پوری کر لینے کے بعد وہ سر پر استرا لگاتا تھا، پھر جہاں یہ مذکور ہے کہ اس گھر کی چھت پر نہ چڑھنا کہ تیری برہنگی نہ ظاہر ہو۔ (خروج ۲۔۲۶) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اس وقت بن سلا کپڑا پہنتے تھے اور کمر میں تہ بند باندھتے تھے۔ توراۃ کے فارسی اقتباس میں جو اوپر نقل ہوا ہے، مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کے لیے آواز دی تو حضرت ابراہیم، نے جواب میں "لبیک" کہا اور اردو میں ہے کہ "میں حاضر ہوں" کہا یہی صدا لبیك اللّٰھم لبیك اسلامی حج میں اٹھتے بیٹھتے لگائی جاتی ہے، یہ بھی گزر چکا ہے کہ جس کو نذر یا قربانی کرتے تھے، اس کو قربان گاہ کے چاروں طرف پھراتے تھے یا نثار کرتے تھے۔ حج میں یہ طواف کہلاتا ہے، غرض ان ہی سب ابراہیمی مراسم کے مجموعہ کا نام اسلام میں حج ہے۔

حج کی حقیقت

ان تفصیلات کے بعد معلوم ہوا ہوگا کہ حج کی حقیقت خدا کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرح خدا کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے، یعنی ان دو برگزیدہ بندوں کی پیروی میں اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے تسلیم و رضا اور فرمانبرداری اور اطاعت کیشی کے ساتھ اپنی گردن جھکا دینا اور اس معاہدہ کو اور عبودیت کے اظہار کو اسی طرح بجالانا جس طرح

وہ ہزاروں برس پہلے بجالائے اور خدا کی نوازشوں اور بخششوں سے مالا مال ہوئے، یہی ملت ابراہیمی اور یہی حقیقی اسلام ہے، یہی روح اور یہی باطنی احساس اور جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم کر کے ظاہر کرتے ہیں، تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ ان دنوں بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں، وہ خود اپنے کو حضرت اسماعیل علیہ السلام کی طرح خدا کے حضور میں نذر کرنے جاتے ہیں، اس لیے اتنے دنوں تک سر کے بال نہ منڈاتے ہیں، نہ ترشواتے ہیں، دنیا کے عیش ونشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں، نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ رنگین کپڑے پہنتے ہیں، نہ سر چھپاتے ہیں اور اسی والہانہ انداز سے جس طرح ابراہیم واسماعیل علیہما السلام تین دن کے سفر کے گرد وغبار میں اٹے ہوئے دوڑے ہوئے خدا کے گھر میں آئے تھے، آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خدا کی پکار پر لبیک کہا تھا، وہی تین ہزار برس پہلے کا ترانہ ان کی زبانوں پر ہوتا ہے:

((لَبَّيْكَ اَللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ، لَبَّيْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ لَبَّيْكَ، اِنَّ الْحَمْدَ وَالنِّعْمَةَ لَكَ وَالْمُلْكَ لَا شَرِيْكَ لَكَ)) [1]

''میں حاضر ہوں اے اللہ! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں، تیرا کوئی شریک نہیں، سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے، تیرا کوئی شریک نہیں۔''

یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ان تمام مقامات اور حدود میں بلند کرتے پھرتے ہیں جہاں جہاں ان دونوں بزرگوں کے نقش قدم پڑے تھے اور چونکہ وہ خود اپنے آپ کو روحانی طور پر خدا کی قربان گاہ پر نذر کرنے چلتے ہیں۔ اس لیے اپنے آپ کو سات دفعہ اس بیت ایل یا بیت اللہ کے چاروں طرف پھرا کر تصدیق کرتے ہیں، پھر جہاں سے جہاں تک (صفا سے مروہ تک) حضرت ابراہیم علیہ السلام دوڑ کر گئے تھے کہ مروہ پر پہنچ کر بیٹے کی قربانی کریں گے، وہاں ہم دوڑتے ہیں اور دعا کرتے ہیں اور گناہوں کی بخشش چاہتے ہیں اور عرفات کے سب سے بڑے میدان میں جمع ہو کر اپنی تمام گزشتہ عمر کے گناہوں اور کوتاہیوں کی معافی چاہتے ہیں، خدا کے حضور میں گڑگڑاتے ہیں، روتے ہیں، قصور معاف کراتے ہیں اور آیندہ زندگی کے لیے خدا کے ہاتھ پر اس کی عبودیت، بندگی اور اطاعت کا نیا عہد و پیمان باندھتے ہیں اور یہی درحقیقت حج کا اصلی رکن ہے [2] یہ تاریخی میدان اس تاریخی عہد کی یاد ان بزرگوں کے نقش قدم اور ان کی دعا کے مقامات اور تجلیات ربانی کے مناظر دور دراز سفر اور ہر قسم کی محنت کے بعد اکثروں کو عمر میں ایک دفعہ اس مقام پر آسکنے کا موقع اور لاکھوں بندگان خدا کا ایک ہی وحدت کے رنگ میں، ایک ہی لباس اور شکل وصورت ایک ہی حالت

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب التلبیۃ وصفتها ووقتها: ۲۸۱۱۔

[2] ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی من ادرك الامام بجمع فقد ادرك الحج: ۸۸۹۔

اور جذبہ میں سرشار ایک بے آب و گیاہ اور خشک میدان اور جلتے ہوئے پہاڑوں کے دامن میں اکھٹے ہوکر دعاو مغفرت کی پکار، گزشتہ عمر کی کوتاہیوں اور بربادیوں کا ماتم، اپنی بدکاریوں کا اقرار اور پھر اس احساس کے ساتھ کہ یہی وہ مقام ہے جہاں ابراہیم خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک بہت سے انبیا اسی حالت اور اسی صورت میں اور یہیں پر کھڑے ہوئے تھے۔ یہ روحانی منظر، ایسا کیف، ایسا اثر، ایسا گداز، ایسی تاثیر پیدا کرتا ہے جس کی لذت تمام عمر فراموش نہیں ہوتی، پھر اپنی نذر کے دن پورے کر کے اپنی طرف سے ایک جانور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پیروی اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل میں جسمانی طور سے ذبح کرتے ہیں اور اس وقت اسی اطاعت، اسی فدویت، اسی سرفروشی اور اسی قربانی کا اپنی زبان سے اقرار کرتے ہیں، جو کبھی اسی میدان میں اسی موقع پر اور اسی حالت اور اسی شکل میں دنیا کے سب سے پہلے داعی توحید نے اپنے عمل اور اپنی زبان سے ظاہر کی تھی اور وہی جذبات اس وقت حاجیوں کے دلوں میں موجزن ہوتے ہیں اور ان کی زبانوں سے حضرت ابراہیم علیہ السلام ہی کے الفاظ کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں: [1]

﴿ اِنِّىْ وَجَّهْتُ وَجْهِىَ لِلَّذِىْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَاۤ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۚ﴾

(٦/ الانعام: ٨٠)

''میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اس کی طرف منہ کیا جس نے آسمانوں کو اور زمین کو پیدا کیا، موحد بن کر اور میں ان میں نہیں جو خدا کا شریک بناتے ہیں۔''

﴿ اِنَّ صَلَاتِىْ وَنُسُكِىْ وَمَحْيَاىَ وَمَمَاتِىْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۙ لَا شَرِيْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِيْنَ ۝﴾ (٦/ الانعام: ١٦٢۔١٦٣)

''میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور میرا مرنا سب اللہ کے لیے ہے، جو تمام دنیا کا پروردگار ہے، اس کا کوئی شریک نہیں اور یہی حکم مجھ کو ہوا ہے، میں سب سے پہلے فرمانبرداری (اسلام کا) اقرار کرتا ہوں۔''

یہی حج کی حقیقت اور یہی اس عظیم الشان عبادت کے مراسم اور ارکان ہیں۔

حج کی اصلاحات

حج کی فرضیت دوسری عبادات سے بالکل مختلف تھی، عام اہل عرب نماز کے اوقات، ارکان اور خصوصیات سے عملاً نابلد تھے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ان کو تعلیم دی اور بتدریج ان کو ترقی دی، زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی۔ اس لیے عام صدقہ اور خیرات کے آغاز سے زکوٰۃ کی عملی فرضیت تک متعدد منزلیں طے کرنی پڑیں، روزے نے بھی یوم عاشورا سے لے کر رمضان تک مختلف قالب بدلے، لیکن حج

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، مختلف ابواب۔

عرب کا ایک ایسا عام شعار تھا، جس کے تمام اصول وارکان پہلے سے موجود تھے، صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال بدل گیا تھا، یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئی تھیں، اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے بہ یک دفعہ حج کے فرض ہونے کا اعلان کر دیا۔

ان اصلاحات کی تفصیل حسب ذیل ہے:

① ہر عبادت کی اصلی غرض ذکرِ الٰہی، طلب مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے، لیکن اہل عرب نے حج کو ذاتی وخاندانی نام ونمود کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب تمام مناسکِ حج سے فارغ ہو چکتے تھے تو تمام قبائل منیٰ میں آ کر قیام کرتے تھے، مفاخرت عرب کا ایک قومی خاصہ تھا اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہیں مل سکتا تھا، اس بنا پر ہر قبیلہ ذکر الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباء واجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی:

﴿ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۰۰)

”جس طرح اپنے باپ دادوں کا ذکر کرتے ہو، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ بلند آہنگی کے ساتھ خدا کی یاد کرو۔“

② قربانی کرتے تھے تو اس کے خون کو خانہ کعبہ کی دیواروں پر لگاتے تھے کہ خدا سے تقرب حاصل ہو جائے، یہود میں بھی یہ رسم تھی کہ قربانی کے خون کا چھینٹا قربان گاہ پر دیتے تھے اور قربانی کا گوشت جلا دیتے تھے، محمد رسول اللہ ﷺ کے ذریعہ یہ دونوں باتیں مٹا دی گئیں اور یہ آیت اتری:

﴿ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۷)

” خدا کے پاس قربانیوں کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا، اس کے پاس صرف تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔“

اور آگے چل کر یہ بھی بتا دیا کہ اس قربانی کا مقصد یہ ہے کہ غریبوں کی ضیافت کی جائے اور اس جشنِ ابراہیمی کے موقع پر ان کو شکم سیر کیا جائے۔

③ اہلِ یمن کا دستور تھا کہ جب حج کی غرض سے سفر کرتے تھے تو زادِ راہ لے کر نہیں چلتے تھے اور کہتے تھے کہ ہم متوکل علی اللہ ہیں، نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ جب مکہ میں پہنچتے تھے تو بھیک مانگنے کی نوبت آتی تھی، اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [1]

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۹۷)

”زادِ راہ ساتھ لے کر چلو کیوں کہ بہترین زادِ راہ پرہیزگاری ہے۔“

---

[1] بخاری، کتاب الحج، باب قول اللّٰہ: وتزوّدوا ...... : ۱۵۲۳۔

④ قریش نے عرب کے دوسرے قبیلوں کے مقابل میں جو امتیازات قائم کر لیے تھے ان کی بنا پر قریش کے سوا تمام قبیلے ننگے ہو کر خانہ کعبہ کا طواف کرتے تھے۔ اس غرض سے خانہ کعبہ میں لکڑی کا ایک تختہ رکھا ہوا تھا، جس پر تمام لوگ کپڑے اتار اتار کر رکھ دیتے تھے۔ ❶ ان لوگوں کی ستر پوشی صرف قریش کی فیاضی کر سکتی تھی، یعنی اس موقع پر قریش کی طرف سے حسبةً للہ کپڑا تقسیم کیا جاتا تھا اور مرد مردوں کو اور عورتیں عورتوں کو خاص طواف کے لیے کپڑا مستعار دیتی تھیں اور وہ لوگ اسی کپڑے میں طواف کرتے تھے، لیکن جو لوگ اس فیاضی سے محروم رہ جاتے تھے، ان کو برہنہ طواف کرنا پڑتا تھا۔ ❷ اسلام نے اس بے حیائی کے کام کو قطعاً موقوف کر دیا اور یہ آیت اتری:

﴿ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ ﴾ (۷/ الاعراف: ۳۱)

''ہر عبادت کے وقت اپنے کپڑے پہنو۔''

اور سنہ ۹ھ کے موسم حج میں آنحضرت ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس اعلان کے لیے بھیجا کہ آئندہ کوئی ننگا ہو کر طواف نہ کرنے پائے، چنانچہ اس کا اعلان کیا گیا اور اس وقت سے یہ رسم اٹھ گئی۔ ❸

⑤ قریش کی ایک امتیازی خصوصیت یہ بھی تھی کہ اور تمام قبائل عرفات میں قیام کرتے تھے، لیکن وہ خود حدود حرم کے اندر سے باہر نکلنا اپنے مذہبی منصب کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے مزدلفہ میں ٹھہرتے تھے، اسلام نے قریش کے اس امتیاز کا خاتمہ کر دیا۔ چنانچہ یہ آیت اتری: ❹

﴿ ثُمَّ اَفِيْضُوْا مِنْ حَيْثُ اَفَاضَ النَّاسُ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۹۹)

''کوچ وہیں سے کرو جہاں سے تمام لوگ کرتے ہیں۔''

⑥ صفا اور مروہ کے درمیان میں جو وادی ہے، اس سے تیزی کے ساتھ دوڑ کر گزرتے تھے اور یہ ایک مذہبی سنت قرار پا گئی تھی، لیکن اسلام نے اس کو کوئی سنت نہیں قرار دیا۔ ❺ یعنی اس کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی۔

⑦ جاہلیت کے زمانہ میں حج کی مذہبی حیثیت تو یوں ہی سی رہ گئی تھی، ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی، جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا تھا جو میلوں میں ہوتا ہے، شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی، غرض فسق و فجور کا ہر تماشا وہاں ہوتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے یک لخت ان باتوں کو بند کر دیا اور حج کو تقدس، تورّع، نیکی اور ذکر الٰہی کا سرتاپا مرقع بنا دیا، حکم آیا:

---

❶ طبقات ابن سعد تذکرۃ حمزۃ سید الشھداء، القسم الاول، ج۳، ص:۶۔

❷ بخاری، کتاب الحج، باب الوقوف بعرفۃ: ۱۶۶۵۔ ❸ بخاری، کتاب الحج، باب لا یطوف بالبیت عریان: ۱۶۲۲۔ ❹ بخاری، کتاب الحج، باب الوقوف بعرفۃ: ۱۶۶۵۔ ❺ صحیح بخاری، کتاب الحج، باب ما جاء فی السعی بین الصفا والمروۃ: ۱۶۴۴۔

﴿ فَمَنْ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''پھر جس نے ان مہینوں میں حج کی نیت کی تو پھر حج میں عورت سے نہ چھیڑ چھاڑ ہے، نہ فحاشی ہے، نہ لڑائی دنگا ہے اور تم جو نیکی کرو گے، اللہ کو معلوم ہو گی۔''

⑧ مناسکِ حج کے بعد جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے، ان میں دو گروہ ہو گئے تھے، ایک کہتا تھا کہ جو لوگ ایامِ تشریق ہی میں واپس آتے ہیں وہ گناہگار ہیں، دوسرا ان لوگوں کو الزام لگاتا تھا، جو دیر میں واپس ہوتے تھے چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گروہ گناہگار نہ تھا، اس لیے قرآن مجید نے دونوں کو جائز رکھا:

﴿ فَمَنْ تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَنْ تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۰۳)

''جو شخص عجلت کر کے ایامِ تشریق کے دو ہی دنوں میں واپس آیا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے اور جس نے دیر کی اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے، بشرطیکہ اس نے تقویٰ اختیار کیا۔''

⑨ ایک خاموش حج ایجاد کر لیا تھا، یعنی حج کا احرام باندھتے تھے تو چپ رہتے تھے۔ چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایک عورت کو خاموش دیکھا تو وجہ پوچھی، معلوم ہوا کہ اس نے خاموش حج کا احرام باندھا ہے، انہوں نے اس کو منع کیا اور کہا کہ یہ جاہلیت کا کام ہے۔ ❶

⑩ خانہ کعبہ تک پیادہ پا جانے کی نذر کرتے تھے اور اس کو بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ چنانچہ آنحضرت ﷺ نے ایک بڈھے کو دیکھا کہ اپنے دو بیٹوں کے سہارے پیادہ جا رہا ہے، وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ اس نے پیادہ پا چلنے کی نذر مانی ہے۔ ارشاد ہوا کہ ''خدا اس سے بے نیاز ہے کہ یہ اپنی جان کو عذاب میں ڈالے۔'' چنانچہ آپ ﷺ نے اس کو سواری پر جانے کا حکم دیا۔ ❷ اسی طرح عورتیں خانہ کعبہ تک کھلے سر اور برہنہ پا جانے کی نذر مانتی تھیں، آپ نے ایک بار اسی قسم کی ایک عورت کو دیکھا تو فرمایا کہ ''خدا اس پریشان حالی کا کوئی معاوضہ نہ دے گا، اس کو سوار ہونا اور دوپٹہ اوڑھنا چاہیے۔'' ❸ اسی سبب سے قربانی کے لیے گھر سے جو جانور لاتے تھے، اس پر صرف اس خیال سے کہ وہ قربانی کا جانور ہے، سوار نہیں ہوتے تھے۔ چنانچہ ایک بار آپ نے دیکھا کہ ایک شخص اونٹ ہانکے ہوئے لے جا رہا ہے۔ فرمایا کہ ''اس پر سوار ہو لو۔'' اس نے جواب دیا کہ یہ قربانی کا اونٹ ہے، چنانچہ آپ ﷺ نے تین بار اس کو اونٹ پر سوار ہونے کی تاکید کی۔ ❹

⑪ انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے، بلکہ پچھواڑے

❶ بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاهلیة: ۳۸۳٤۔ ❷ ترمذی، ابواب النذور والایمان، باب ما جاء فی من یحلف بالمشی ولا یستطیع: ۱۵۳۷۔ ❸ ایضًا: ۱۵۳٦۔

❹ بخاری، کتاب الحج، باب رکوب البدن: ۱٦۸۹، ۱٦۹۰۔

سے کود کر آتے تھے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھر میں گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت وملامت کی، اس پر قرآن مجید کی یہ آیت نازل ہوئی: ❶

﴿ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۸۹)

''گھر کے پچھواڑے سے آنا کوئی نیکی نہیں ہے، نیکی صرف اس کی ہے جس نے تقویٰ حاصل کیا اور گھروں میں دروازے کی راہ سے آؤ۔''

⑫ بعض لوگ طواف کرتے تھے تو اپنے گنہگار اور مجرم ہونے کی حیثیت کو مختلف نامناسب طریقوں سے ظاہر کرتے تھے، کچھ لوگ ناک میں نکیل ڈلوا لیتے تھے اور اس کو پکڑ کر ایک شخص کھینچتا پھرتا تھا، آنحضرت ﷺ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اسی طریقہ سے طواف کر رہا ہے تو اس کی نکیل کٹوا دی۔ ❷ اسی طرح آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے رسی سے اپنا ہاتھ ایک شخص سے باندھ دیا ہے اور وہ اس کو طواف کرا رہا ہے، آپ نے رسی کاٹ دی اور فرمایا کہ ''اس کا ہاتھ پکڑ کر طواف کراؤ۔'' ❸ ایک بار آپ نے دیکھا کہ دو شخص ایک رسی میں جڑے ہوئے ہیں، وجہ پوچھی تو دونوں نے کہا کہ ہم نے یہ نذر مانی ہے کہ اسی طرح جڑے ہوئے خانہ کعبہ کا حج کریں گے، آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''اس شکنجے کو دور کرو، یہ نذر نہیں ہے، نذر وہ ہے جس سے خدا کی ذات مقصود ہو۔'' ❹

⑬ اہل عرب ایام حج میں عمرہ نہیں کرتے تھے، کہتے تھے کہ جب سواریاں حج سے واپس آ جائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اس وقت عمرہ جائز ہو سکتا ہے۔ لیکن رسول اللہ ﷺ نے خاص ایامِ حج میں عمرہ کیا اور عملاً اس بے ضرورت رسم کو مٹا دیا۔ ❺

⑭ جاہلیت کے زمانہ میں کچھ لوگ تو حج کی نیت کرتے تھے۔ وہ ان دنوں تجارت نہیں کرتے تھے اور اس کو طریقہ حج کے خلاف سمجھتے تھے، اس لیے اکثر لوگ جو صرف تجارت اور بیوپار کے لیے آتے تھے، وہ حج میں شریک نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ وہ صرف میلہ کی خاطر جمع ہوتے تھے، ان کو حج سے کوئی سروکار نہ تھا، وہ عکاظ اور ذوالمجاز وغیرہ بازاروں میں جمع ہو کر صرف تجارت اور بیوپار کرتے تھے۔ اسلام آیا تو یہ دونوں طریقے الگ الگ جاری تھے۔ اس کا نقصان یہ تھا کہ حاجی تجارت کے منافع سے محروم رہتے تھے اور غیر حاجیوں کا جو مجمع ہوتا تھا وہ صرف تماشائیوں کی بھیڑ ہوتی تھی، بازاری مقصد کے لوگ ہوتے تھے، جن میں ہر قسم کی برائیاں جاری ہوتی تھیں۔ اسلام نے اس تفریق کو مٹا دیا اور کہہ دیا کہ تجارت اور بیوپار حج کے تقدس وحرمت کے خلاف

---

❶ بخاری، کتاب الحج، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: واتوا البیوت من ابوابھا: ۱۸۰۳۔

❷ نسائی، کتاب مناسك الحج، باب الکلام فی الطواف: ۲۹۲۳۔

❸ بخاری، کتاب الحج، باب الکلام فی الطواف: ۱۶۲۰۔ ❹ فتح الباری، ج ۳، ص: ۳۸۶۔

❺ صحیح بخاری، کتاب مناقب الانصار، باب ایام الجاھلیۃ: ۳۸۳۲۔

نہیں، اس لیے یہ دونوں فریضے ایک ساتھ ادا ہو سکتے ہیں۔ فرمایا: [1]

﴿ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۸)

''تمہارے لیے یہ گناہ نہیں کہ (حج کے زمانہ میں) فضلِ الٰہی (تجارت) کی تلاش کرو۔''

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہر شخص جو اس موقع پر جمع ہوتا تھا، حج کی نیت سے جمع ہوتا تھا، اس سے جاہلیت کے زمانہ کے اجتماعی مفاسد کا خاتمہ ہو گیا اور ساتھ ہی اس اجتماع کے جائز تجارتی مشاغل کی ترقی ہو گئی۔

⑮ صفا و مروہ کے طواف کے متعلق پہلے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ انصار مناۃ کا احرام باندھتے تھے۔ جو مشلّل میں قائم کیا گیا تھا اور طواف نہیں کرتے تھے، ان کے علاوہ تمام عرب صفا و مروہ کا طواف کرتے تھے، خدا نے جب پہلے خانہ کعبہ کے طواف کا حکم دیا اور صفا و مروہ کے متعلق کوئی آیت نازل نہیں ہوئی تو آخر الذکر گروہ نے آنحضرت ﷺ سے سوال کیا کہ یہ کوئی ناجائز فعل ہے؟ انصار نے بھی اس کے متعلق استفسار کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی: [2]

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۷)

''صفا و مروہ خدا کا شعار ہیں، پس جو شخص حج یا عمرہ کرے، اس کے لیے ان دونوں کا پھیرا لگانا گناہ نہیں ہے۔''

حج کے ارکان

اب اس اصلاح ترمیم و اضافہ کے بعد حج کی حقیقت جن ارکان سے مرکب ہوئی، ان کی تفصیل اور ان کی مشروعیت کی مصلحتیں حسب ذیل ہیں:

احرام

تمام اعمال اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں، لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ نماز کے لیے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے۔ احرام بھی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمولی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آ جاتا ہے۔ اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہو جاتی ہیں، جو دنیوی عیش و نشاط، زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں، وہ شکار نہیں کر سکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی

[1] اس آیت کے شانِ نزول میں روایتیں مختلف ہیں، کچھ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے، اہل عرب حج میں تجارت کرنا برا جانتے تھے اس لیے یہ آیت اتری۔ دوسری روایتوں میں ہے کہ اہل عرب ان دنوں تجارت کرتے تھے، اسلام جب آیا تو صحابہ نے یہ سمجھا کہ اب حج خالص خدا کے لیے ہو گیا، اس لیے اب اس میں تجارت مناسب نہیں یہ آیت اس خیال کی تردید کے لیے اتری، لیکن تمام روایتوں کے جمع کرنے سے وہ حقیقت معلوم ہوتی ہے، جو اوپر متن کتاب میں لکھی گئی ہے اور روایتوں کے جمع کرنے سے اس کی تصدیق ہوتی ہے (دیکھو تفسیر طبری، الجزء الثانی ص:۱۵۸ تا ۱۶۰ و اسباب النزول واحدی میں آیت مذکورہ)۔

[2] صحيح بخاری، كتاب الحج، باب وجوب الصفا و المروة:١٦٤٣

جان لینا بہر حال خود غرضی ہے۔ بیوی سے متمتع نہیں ہو سکتا کہ یہ نفسانی وشہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے۔ سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ وجلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اسی بنا پر اہل عرب برہنہ طواف کرتے تھے۔ لیکن خدا کی بارگاہ میں یہ بھی ایک بے ادبی تھی۔ اس لیے اسلام نے اس کو جائز نہیں رکھا اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ وگدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں اور انسان کے ابتدائی دور کا بن سلا کپڑا زیب بر کیا جائے، ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے اس طرح لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لیے باہر رہے۔ یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے، جو اس لیے اس وقت کے لیے پسند کیا گیا تاکہ اس مبارک عہد کی کیفیت ہماری ظاہری شکل وصورت سے بھی ظاہر ہو، یہ گویا شہنشاہ عالم وعالمیان کے دربار میں حاضری کی وردی ہے جو بالکل سادہ، بے تکلف اور زیب وزینت سے خالی مقرر کی گئی ہے۔

طواف

یعنی خانہ کعبہ کے چاروں طرف گھوم کر اور پھر کر دعائیں مانگنا، اس رسم کو ادا کرنا ہے، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد میں نذر اور قربانی کی قربان گاہ کے چاروں طرف پھرا کر ادا کی جاتی تھی، چنانچہ حاجی اپنے آپ کو قربان گاہ پر چڑھاتا ہے، اس لیے وہ اس کے چاروں طرف پھرتا ہے اور اس گردش کی حالت میں وہ اپنی مغفرت کی دعائیں اللہ تعالیٰ سے مانگتا ہے جس کا ایک ضروری ٹکڑا آخر میں یہ ہوتا ہے کہ ﴿ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي الْاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۱) ''خداوندا ہم کو دنیا میں نیکی دے اور آخرت میں نیکی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا۔''

طواف حقیقت میں ایک قسم کی ابراہیمی نماز ہے، جو اس پرانے عہد کی یادگار ہے، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''خانہ کعبہ کا طواف بھی گویا نماز ہے، صرف فرق یہ ہے کہ تم اس میں بول سکتے ہو، مگر نیک بات کے سوا اس حالت میں کچھ اور نہ بولو۔'' [1] اور حکم ہوا کہ

﴿ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۹)

''اور اس پرانے گھر کا طواف کریں۔''

حجر اسود کا استلام

حجر اسود کے لفظی معنی کالے پتھر کے ہیں، یہ کالے رنگ کا ایک پتھر ہے، جو خانہ کعبہ کی دیوار کے ایک گوشہ میں قد آدم بلند لگا دیا گیا ہے۔ خانہ کعبہ بیسیوں دفعہ گرا اور بنا کبھی سیلاب میں بہہ گیا اور کبھی آگ میں

[1] ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی الکلام فی الطواف:۹۶۰؛ نسائی، کتاب مناسك الحج، باب اباحة الکلام فی الطواف:۲۹۲۵؛ دارمی، کتاب المناسك، باب الکلام فی الطواف:۱۸٤۷؛ مستدرك حاکم، کتاب المناسك، ج۱، ص: ٤٥٩۔

جل گیا، اس بنیاد کا جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پڑی تھی، ایک پتھر بھی اس میں باقی نہیں، مگر اس عہد عتیق کی یادگار صرف ایک پتھر رہ گیا تھا، جس کو اہل عرب نے جاہلیت میں بھی بڑی حفاظت سے قائم رکھا اور ساڑھے تیرہ سو برس سے اسلام میں وہ اسی طرح نصب ہے (الا یہ کہ ۳۱۷ھ میں باطنیہ اس کو کچھ دنوں کے لیے نکال کر لے گئے اور پھر واپس کر گئے) یہ پتھر کعبہ کے اس گوشہ کی دیوار میں لگا ہے، جس کی طرف رخ کر کے کھڑے ہوں تو بیت المقدس سامنے پڑے گا اور اسی لیے حجر اسود کے مقابل گوشہ کا نام رکن شامی ہے، اس گوشہ کی تخصیص سے بیت المقدس کی سمت کا اشارہ مضمر ہے، اس گوشہ میں اس پتھر کے لگانے سے مقصود یہ ہے کہ خانہ کعبہ کے طواف کے شروع اور ختم کرنے کے لیے وہ ایک نشان کا کام دے، ہر طواف کے ختم کے بعد اس پتھر کو بوسہ بھی دے سکتے ہیں۔ سینہ سے بھی لگا سکتے ہیں، ہاتھ یا کسی لکڑی یا اور کسی چیز سے اس کو چھو کر اس چیز کو چوم سکتے ہیں۔ یہ نہ سہی تو اس کی طرف صرف اشارہ پر بھی قناعت کر سکتے ہیں اور یہ پتھر کہنے کے لیے تو ایک معمولی پتھر ہے، جس میں نہ کوئی آسمانی کرامت ہے نہ کوئی غیبی طاقت ہے۔ صرف ایک یادگاری پتھر ہے۔ مگر ایک مشتاق زیارت کی نگاہ میں اس تخیل کے ساتھ کہ تمام دنیا بدل گئی، شہر مکہ کا ذرہ ذرہ بدل گیا، کعبہ کی ایک ایک اینٹ بدل گئی، مگر یہ وہ پتھر ہے جس پر ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک کے مقدس لب یا مبارک ہاتھ بالیقین پڑے ہیں اور پھر تمام خلفائے راشدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ائمہ اعلام، اکابر اسلام اور حکمائے عظام رحمہم اللہ کے ہاتھوں نے اس کو مس کیا ہے اور آج ہمارے گناہگار لب اور ہاتھ بھی اس کو مس کر رہے ہیں۔ ہمارے دلوں اور آنکھوں میں تاثیر اور کیفیت کی ایک عجیب لہر پیدا کر دیتا ہے اور بایں ہمہ ہم مسلمان یہی سمجھتے ہیں کہ یہ ایک پتھر ہے جس میں کوئی قدرت نہیں اور جیسا کہ بادہ توحید کے ایک ہشیار متوالے [1] نے اس کو چوم کر کہا: اے کالے پتھر! میں خوب جانتا ہوں کہ تو ایک معمولی پتھر ہے، نہ نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ نقصان، لیکن میں اس لیے تجھے بوسہ دیتا ہوں کہ میں نے محمد رسول اللہ ﷺ کو تجھے بوسہ دیتے دیکھا تھا۔ [2] الغرض یہ بوسہ تعظیم کا نہیں، بلکہ اس محبت کا نتیجہ ہے جو اس یادگار کے ساتھ ابراہیم علیہ السلام اور اسماعیل علیہ السلام کی روحانی اولاد کو ہے، ورنہ اگر کوئی نہ اس کو چھوئے اور نہ بوسہ دے نہ اشارہ کرے تو اس سے اس کے ادائے حج میں کوئی نقصان لازم نہیں آتا۔

صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا

صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں تھیں، جو گو اب برائے نام رہ گئی ہیں، تاہم کچھ کچھ ان کے نشانات باقی ہیں، صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ

[1] یعنی حضرت عمر بن خطاب۔ [2] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب استحباب تقبیل الحجر: ۳۰۶۹؛ ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی تقبیل الحجر: ۸۶۰؛ بخاری، کتاب الحج: ۱۵۹۷؛ نسائی: ۲۹۴۰؛ ابن ماجہ: ۲۹۴۳۔

کر اکیلے حضرت اسماعیل کو لے کر آگے بڑھے تھے اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضرت اسماعیل علیہ السلام کی قربانی کرنی چاہی اور آخر منادی غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیل علیہ السلام کی جگہ مینڈھا قربانی کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت حاجرہ علیہا السلام حضرت اسماعیل علیہ السلام کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ علیہا السلام صفا و مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا، یہ صفا مروہ کی سعی انہیں کی اس مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے، بہر حال حج میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعا مانگتے ہیں، پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوئے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں مقامات ہیں، جہاں ربانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیم اور ہاجرہ علیہما السلام کو نظر آئے۔

﴿ اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اَنْ يَّطَّوَّفَ بِهِمَا ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۸)

"بے شک صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں تو جو خانہ کعبہ کا حج کرے یا عمرہ کرے، اس پر اس کا پھیرے لگانا گناہ نہیں۔"

وقوفِ عرفہ

عرفات میں نویں ذوالحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوال کے بعد سے غروب تک یہاں دعا اور خدا کی حمد میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے، یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے، ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں، یہیں جبل رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور انہیں ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی ایک عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماع عظیم روز حشر کی یاد دلاتا ہے اور یہی سبب ہے کہ سورۂ حج کا آغاز حشر کے بیان سے ہوتا ہے، یہ اجتماع اور اس کے بے نظیر موثر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمت الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے، ہر شخص کو داہنے بائیں آگے پیچھے دور تک یہی منظر نظر آتا ہے، تو وہ خود اثر میں ایسا ڈوب جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہ جاتی ہے۔

قیام مزدلفہ

حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے، عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے ہیں، اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہِ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور ہو جاتے، اسی لیے انہوں نے ذرا سا سکون اور آرام اٹھانے کے لیے مزدلفہ کو ایک بیچ کی منزل قرار دے لیا تھا، اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہیں

وہ مسجد واقع ہے، جس کو مشعر حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام تھا، اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوع فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا، ضروری قرار دیا:

﴿ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۸)

''تو جب عرفات سے چلو تو مشعر حرام کے پاس خدا کو یاد کرو اور اس کو یاد کرو جس طرح اس نے تم کو بتایا اور تم اس سے پہلے حق کی راہ کو بھولے ہوئے تھے۔''

منیٰ کا قیام

یہ معلوم ہو چکا ہے کہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے، جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی، اسی لیے آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ ''قربان گاہ مروہ اور ہر مکہ کی تمام گلیاں ہیں۔'' [1] رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرہ نے مکانی وسعت حاصل کی اور قربانیوں کی کوئی حد نہ رہی، ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان شہر اور آبادی کی صورت میں بدل چکا تھا، اس لیے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کیا جس کا نام منیٰ ہے، یہاں تمام حاجی دو تین دن ٹھہر کر باہم ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے جان پہچان پیدا کرتے ہیں، یہیں قربانی کی جاتی ہے، باہم دعوتیں ہوتی ہیں، بازار لگتے ہیں، خرید و فروخت ہوتی ہے۔

جاہلیت میں عرب کے لوگ یہاں جمع ہو کر اپنے باپ دادوں کی بزرگی پر فخاری کیا کرتے تھے جو اکثر لڑائی بھڑائی کی صورت اختیار کر لیتی تھی، اس بیہودہ رسم کے روکنے کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ بجائے اس کے خدا کی حمد و عبادت کا حکم دیا جائے اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کی مفاخرت کی بجائے مسلمانوں کے باہم تعارف، محبت، مساوات اور یکجہتی کا مقام قرار دیا جائے فرمایا:

﴿ وَٱذْكُرُوا۟ ٱللَّهَ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْدُودَٰتٍ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۳)

''خدا کو چند گنتی کے دنوں میں یاد کرو۔''

قربانی

یہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے ذبح کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے اور اس کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جائے جس میں لوگ ایک دوسرے کو، دوست احباب کو اور فقرا اور مساکین کو کھانا کھلائیں:

﴿ وَيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومَٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۖ فَكُلُوا۟ مِنْهَا وَأَطْعِمُوا۟ ٱلْبَآئِسَ ٱلْفَقِيرَ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۸)

---

[1] مؤطا امام مالك، كتاب الحج، باب ماجاء فى النحر فى الحج: ۸۹۵؛ ابو داود، كتاب المناسك، باب الصلوة بجمع: ۱۹۳۷؛ ابن ماجه، كتاب مناسك، باب الذبح: ۳۰۴۸۔

’’اور مقررہ دنوں میں خدا کا نام اس پر لیا جائے جو جانور خدا نے روزی میں دیا تو اس میں سے کچھ خود کھاؤ اور مصیبت کے مارے فقیر کو کھلاؤ۔‘‘

اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی ایثار ہی کی تمثیل ہے:

﴿ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ إِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۶)

’’تو جو عمرہ اور حج دونوں کا ایک ساتھ فائدہ اٹھائے تو جو قربانی اس سے ممکن ہو وہ کرے جس کو یہ بھی میسر نہ ہو تو تین دن کے روزے حج میں اور سات دن واپس ہو کر۔‘‘

حلق راس

منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں، یہ اس پرانی رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے۔ ❶ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے، تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ❷ چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے۔ اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی:

﴿ مُحَلِّقِيْنَ رُءُوْسَكُمْ وَمُقَصِّرِيْنَ ۙ ﴾ (٤٨/ الفتح ۲۷)

’’اپنے سروں کو منڈا کر یا بال ترشوا کر۔‘‘

﴿ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۗ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۶)

’’اور اپنے سر نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنی جگہ پر نہ پہنچ جائے۔‘‘

رمی جمار

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر ان کے دل میں وسوسہ ڈالا انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا۔ جس کے لفظی معنی کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اسی لیے شیطان کو ’’رجیم‘‘ یعنی ’’کنکری مارا گیا‘‘ کہتے ہیں۔ صاحب نظام القرآن ❸ کا نظریہ ہے کہ ابرہہ کے لشکر نے مکہ پر جب چڑھائی کی تھی تو چند غدار ثقفی عربوں نے اس کی راہنمائی کی، باقی عربوں نے اس ناگہانی حملہ کا بدویانہ سنگ اندازی سے مقابلہ کیا۔ جس کا ذکر سورۂ فیل کی آیت ﴿ تَرْمِيْهِمْ

---

❶ تورات عہد قدیم قاضی اصحاح: ۱۳ آیت: ۵۔ گنتی اصحاح: ص: ۴۰۳، ۶ آیت: ۵، ص: ۲۱۸۔

❷ ابن سعد جز ثانی قسم اول، ص: ۳۷ سریہ المنذر بن عمرو وسیرۃ ابن ہشام ذکر بیر معونہ واقعہ عمرو بن امیہ و جزنا صیۃ واعتقہ، ج ۲، ص: ۱۴۰۔ ❸ مولانا حمید الدین فراہی المتوفی: ۱۹۳۰ء۔

﴿بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ﴾ (۱۰۵/ الفیل :٤) میں ہے، اس سے اللہ تعالیٰ نے اس لشکر کو تباہ کیا اور وہ غدار بھی ہلاک ہوئے یہ کنکریوں کا پھینکنا اسی "ترمیھم" کی سنگ باری کی یادگار ہے۔ خدا کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان کے وسوسوں سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں، چونکہ کنکری مارنا یا پھینکنا بظاہر ایک بیکار کام معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے اس کی تصریح فرمادی کہ اس کنکری پھینکنے سے مقصود اس بہانہ سے خدا کی یاد کو قائم رکھنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ ❶ قرآن پاک نے بھی اسی حقیقت کی طرف اپنے الفاظ میں اشارہ کیا ہے:

﴿فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ اٰبَآءَكُمْ اَوْ اَشَدَّ ذِكْرًا﴾

(۲/ البقرۃ: ۲۰۰)

"جب سب ارکان ادا کر چکو تو اپنے باپ دادوں کو جیسے یاد کرتے تھے ویسے ہی خدا کو یاد کرو بلکہ اس سے بڑھ کر۔"

اسی رمی جمار پر مراسم حج کا خاتمہ ہوتا ہے۔

ان رسوم کی غایت

اُوپر کی تفصیلات سے واضح ہوتا ہے کہ حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریق عبادت کی یادگار ہیں جس کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہے اور ہمارے جذبات واحساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے تغیر واصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔ اسی لیے آنحضرت ﷺ نے نہایت وضاحت کے ساتھ فرمایا کہ "کنکری مارنے، صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔" ❷ اور قرآن پاک کا اشارہ بھی اسی طرف ہے:

﴿وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ﴾ (۲۲/ الحج: ۲۸)

"اور تاکہ ان مقررہ دنوں میں خدا کا نام یاد کرو۔"

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ شان اور ربانی نشان کے جلوہ گاہ ہیں جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت وبرکت کے واقعات یاد آتے ہیں اور اسی لیے قرآن پاک کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر اللہ اور

❶ ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء کیف ترمی الجمار: ۹۰۲ قال الترمذی حدیث حسن صحیح۔

❷ ترمذی، ابواب الحج، باب کیف ترمی الجمار: ۹۰۲؛ دارمی، کتاب المناسك، باب الذکر فی الطواف: ۱۸۵۳؛ مستدرك حاكم، كتاب المناسك، ج۱، ص: ٤٥٩۔

حرمت اللہ ہے یعنی خدا کے نشانات اور خدا کی محترم باتیں اور چیزیں اور انہیں شعائر اللہ اور حرمت اللہ کی تعظیم وزیارت کا نام ارکانِ حج ہے۔ سورۂ حج میں حج کے بعض ارکان کی تفصیل کے بعد ہے:

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۰)

''اور جو اللہ کی محترم چیزوں کا ادب کرے تو وہ اس کے پروردگار کے نزدیک بہتر ہے۔''

صفا ومروہ کی نسبت ہے:

﴿ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَآئِرِ اللّٰهِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۸)

''اور صفا اور مروہ خدا کا شعار ہیں۔''

اور سورۂ حج میں فرمایا:

﴿ ذٰلِكَ وَمَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ ﴾ (۲۲/ الحج :۳۲)

''یہ ہے اور جو اللہ کے شعائر کا ادب کرے تو یہ دلوں کی پرہیز گاری ہے۔''

ان آیتوں سے ظاہر ہوا کہ حج کا ایک بڑا مقصد ان محترم مقامات کا ادب واحترام ہے، تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایتیں وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا کرتا رہے۔

حج کے آداب

حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاک بازی اور امن وسلامتی کی پوری تصویر ہو وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے، کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو بھی نہ مارے، شکار تک اس کے لیے جائز نہیں۔ کیوں کہ وہ اس وقت ہمہ تن صلح وآشتی اور امن و امان ہوتا ہے:

﴿ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

''تو جو ان مہینوں میں حج اپنے اوپر فرض کرے تو حج میں نہ عورت کے ساتھ بے پردہ ہونا اور نہ گناہ کرنا اور نہ جھگڑا کرنا ہے اور جو بھی نیک کام کرو اللہ اس کو جانتا ہے۔''

﴿ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَأَنْتُمْ حُرُمٌ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۱)

''حلال نہ جانو شکار کو احرام کی حالت میں۔''

اسی طرح جو لوگ حج کی نیت سے روانہ ہوں ان کو راستہ میں تکلیف دینا یا ان کے مال اور سامان کو لوٹنا یا چرانا بھی خاص طور سے منع کیا گیا کہ یہ اس خانہ الٰہی کے پاس ادب کے خلاف ہے، تاکہ عرب جیسے بے امن ملک میں ان ڈاکوؤں اور رہزنوں اور بدمعاشوں کی وجہ سے قافلوں کا آنا جانا نہ رکے۔

﴿ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ (۵/ المآئدة: ۲)

''اور نہ اس ادب کے گھر کے قصد کرنے والوں کو حلال سمجھو جو اپنے پروردگار کی مہربانی اور خوشنودی کو تلاش کرنے نکلے ہیں۔''

اگر کسی حاجی سے کسی جانور کے قتل کی حرکت قصداً صادر ہو تو اس پر اس کا خون بہا لازم آتا ہے، جس کا نام کفارہ ہے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی یا چند محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اتنا ہی روزہ رکھنا فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْتُلُوا الصَّيْدَ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ وَمَنْ قَتَلَهٗ مِنْكُمْ مُّتَعَمِّدًا فَجَزَاۗءٌ مِّثْلُ مَا قَتَلَ مِنَ النَّعَمِ يَحْكُمُ بِهٖ ذَوَا عَدْلٍ مِّنْكُمْ هَدْيًۢا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ اَوْ كَفَّارَةٌ طَعَامُ مَسٰكِيْنَ اَوْ عَدْلُ ذٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوْقَ وَبَالَ اَمْرِهٖ ﴾ (۵/ المآئدة: ۹۵)

''اے ایمان والو! جب تم احرام میں ہو تو شکار کو مت مارو اور تم میں جو جان کر مارے گا تو اس کے مارے ہوئے کے برابر بدلہ ہے مویشی میں سے اس کا فیصلہ تم میں سے دو بہتر آدمی کریں کہ اس کو کعبہ تک پہنچا کر قربانی کی جائے یا اس کے گناہ کا اتارا ہے کچھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا اسی کے برابر روزے، تا کہ وہ مجرم اپنے جرم کی سزا چکھے۔''

اس سے ثابت ہوا کہ حج تمام تر صلح و سلامتی اور امن و آشتی ہے اس مقصد کے خلاف حاجی سے اگر کوئی حرکت ہو جائے تو اس کا کفارہ اس پر واجب آ جاتا ہے۔

حج کی مصلحتیں اور حکمتیں

محمد رسول اللہ ﷺ جس شریعت کا تکمیلی صحیفہ لے کر آئے اس کی سب سے بڑی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ دین و دنیا کی جامع ہے اور اس کا ایک ایک حرف مصلحتوں اور حکمتوں کے دفتروں سے معمور ہے وہ اپنے احکام اور عبادات کے فائدہ و منفعت اور غرض و غایت کے بتانے کے لیے کسی باہر کی امداد کا محتاج نہیں۔ بلکہ اس نے ان اسرار کے چہرہ سے خود اپنے ہاتھ سے پردہ ہٹایا ہے۔ نماز، زکوٰۃ اور روزہ کی طرح حج کے مقاصد اور فوائد بھی خود اسلام کے صحیفہ ربانی میں مذکور ہیں۔

قرآن نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی زبان سے خانہ کعبہ کی تعمیر اور اسماعیل علیہ السلام کی نذر اور مکہ میں ان کے قیام کے سلسلہ میں جو دعا مانگی وہ تمام تر ان فوائد و مقاصد کی جامع ہے۔ آئیں ان آیتوں پر ایک دفعہ اور نظر ڈال لیں:

﴿ وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ۭ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ۭ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّاۗىِٕفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝ وَاِذْ قَالَ

إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا بَلَدًا ءَامِنًا وَٱرْزُقْ أَهْلَهُۥ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۲۵۔۱۲۶)

''اور جب ہم نے اس گھر (کعبہ) کو لوگوں کا مرجع و مرکز اور امن بنایا اور ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بنایا اور ہم نے ابراہیم اور اسماعیل، کے یہ ذمہ کیا کہ تم دونوں میرے گھر کو طواف کرنے والوں اور کھڑے ہونے والوں اور رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک وصاف کرو اور جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرے پروردگار! اس کو امن والا شہر بنا اور اس کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دے۔''

﴿ رَبَّنَا وَٱجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَآ أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَآ ۖ إِنَّكَ أَنتَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ ۝ رَبَّنَا وَٱبْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۸۔۱۲۹)

''اے ہمارے پروردگار! اور ہم کو اپنا تابع دار گروہ بنا اور ہماری اولاد میں سے کچھ کو اپنا فرماں بردار گروہ بنا اور ہم کو ہمارے حج کے دستور بتا اور ہم کو معاف کر، تو بے شک معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور ان میں انہیں میں سے ایک رسول بھیجنا۔''

﴿ وَإِذْ بَوَّأْنَا لِإِبْرَٰهِيمَ مَكَانَ ٱلْبَيْتِ أَن لَّا تُشْرِكْ بِى شَيْـًٔا وَطَهِّرْ بَيْتِىَ لِلطَّآئِفِينَ وَٱلْقَآئِمِينَ وَٱلرُّكَّعِ ٱلسُّجُودِ ۝ وَأَذِّن فِى ٱلنَّاسِ بِٱلْحَجِّ يَأْتُوكَ رِجَالًا وَعَلَىٰ كُلِّ ضَامِرٍ يَأْتِينَ مِن كُلِّ فَجٍّ عَمِيقٍ ۝ لِّيَشْهَدُوا۟ مَنَٰفِعَ لَهُمْ وَيَذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ فِىٓ أَيَّامٍ مَّعْلُومَٰتٍ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّنۢ بَهِيمَةِ ٱلْأَنْعَٰمِ ۖ ﴾ (۲۲/ الحج:۲۶۔۲۷)

''اور جب ہم نے ابراہیم کو یہ گھر کی جگہ ٹھکانا دی، کہ میرا شریک نہ بنانا اور میرے گھر کو طواف کرنے والوں، کھڑے ہونے والوں، رکوع کرنے والوں اور سجدہ کرنے والوں کے لیے پاک وصاف کر اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دے وہ تیرے پاس پیادہ اور سفر کی ماری دبلی پتلی ہو جانے والی اونٹنیوں پر سوار ہو کر اور دور دراز راستہ سے آئیں گے، تاکہ فائدے کی جگہوں میں آ کر جمع ہوں اور چند مقررہ دنوں میں اس بات پر خدا کا نام یاد کریں کہ ہم نے ان کو جانور روزی کیے۔''

﴿ وَإِذْ قَالَ إِبْرَٰهِيمُ رَبِّ ٱجْعَلْ هَٰذَا ٱلْبَلَدَ ءَامِنًا وَٱجْنُبْنِى وَبَنِىَّ أَن نَّعْبُدَ ٱلْأَصْنَامَ ۝ رَبِّ إِنَّهُنَّ أَضْلَلْنَ كَثِيرًا مِّنَ ٱلنَّاسِ ۖ فَمَن تَبِعَنِى فَإِنَّهُۥ مِنِّى ۖ وَمَنْ عَصَانِى فَإِنَّكَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ رَّبَّنَآ إِنِّىٓ أَسْكَنتُ مِن ذُرِّيَّتِى بِوَادٍ غَيْرِ ذِى زَرْعٍ عِندَ بَيْتِكَ ٱلْمُحَرَّمِ رَبَّنَا لِيُقِيمُوا۟ ٱلصَّلَوٰةَ فَٱجْعَلْ أَفْـِٔدَةً مِّنَ ٱلنَّاسِ تَهْوِىٓ إِلَيْهِمْ وَٱرْزُقْهُم مِّنَ ٱلثَّمَرَٰتِ لَعَلَّهُمْ يَشْكُرُونَ ۝ ﴾

(۱۴/ ابراھیم:۳۵۔۳۷)

’’جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا: میرے پروردگار! اس آبادی کو امن والی بنا اور مجھے اور میری اولاد کو اس سے بچا کہ ہم بتوں کی پوجا کریں، میرے پروردگار! ان بتوں نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کیا، تو جس نے میرا کہا مانا وہ مجھ سے ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو تو بخشنے والا رحم کرنے والا ہے، ہمارے پروردگار! میں نے اپنی کچھ اولاد اس بن کھیتی کی ترائی میں تیرے مقدس گھر کے پاس آباد کی ہے۔ ہمارے پروردگار! تاکہ وہ نماز کھڑی رکھیں تو لوگوں کے کچھ دلوں کو ایسا بنا کہ وہ ان کی طرف جھکیں اور ان کو پھلوں کی روزی دے، تاکہ شکر گزار رہوں۔‘‘

ان آیتوں میں حسب ذیل باتوں کی تصریح ہے:

① خانہ کعبہ اہل توحید کا ایک مرکز و مرجع اور ملت ابراہیمی کا موطن و مسکن ہے۔

② حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہاں اپنی اولاد کو اس غرض سے بسایا کہ اس مقدس گھر کی خدمت گزاری اور خدائے واحد کی عبادت کرتی رہے اور بت پرست قوموں کے میل جول اور اختلاط سے وہ محفوظ رہے، تاکہ پہلے کی طرح یہ گھر پھر بے نشان نہ ہو جائے اور آخر ان میں وہ رسول مبعوث ہو جس کی صفتیں ایسی ہوں۔

③ یہ لوگ ایک ویرانہ میں جس میں کھیتی نہیں آباد ہوئے ہیں اور صرف اس غرض سے آباد ہوئے ہیں کہ تیرے گھر کو آباد رکھیں تو تو اس بے ثمر اور شور زمین میں ان کی روزی کا سامان کرنا اور لوگوں کے دلوں کو ان کی طرف جھکانا کہ وہ ان سے محبت کریں۔

④ حکم ہوا کہ لوگوں میں اس گھر کے حج کا اعلان عام کر ہر قریب اور دور کے راستہ سے لوگ لبیک کہیں گے، تاکہ یہاں آکر دین و دنیا کا فائدہ حاصل کریں اور چند مقررہ ایام میں خدا کا نام لیں۔

⑤ جو لوگ یہاں عبادت اور حج کی نیت سے آئیں خداوندا! تو ان کے گناہ معاف کر تو بڑا مہربان اور رحیم ہے۔

⑥ خداوندا! میری اولاد وہی ہے جو میرے مشرب و مذہب اور میرے راستہ پر چلے، اس لیے تمام وہ لوگ جو ملت ابراہیمی کے پابند ہوں آل ابراہیم ہیں اور وہی حضرت ابراہیم کی دعاؤں اور برکتوں کے مستحق ہیں۔

الغرض حج کے یہی منافع اور مقاصد ہیں جن میں سے ہر ایک کے ماتحت متعدد فوائد اور اغراض ہیں۔

مرکزیت

خانہ کعبہ اس دنیا میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا نقطۂ قدم ہے یہ وہ آئینہ ہے جس میں اس کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر تمام کرۂ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ اُبلا اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ مطلع ہے جن

کی کرنوں نے زمین کے ذرہ ذرہ کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافیائی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوئے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیتوں میں بستے ہیں۔ مختلف زبانیں بولتے ہیں۔ مختلف لباس پہنتے ہیں۔ مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب ہی کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں اور ایک ہی مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن ومعاشرت، رنگ روپ اور دوسرے تمام امتیازات کو مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت (آل ابراہیم) ایک ہی تمدن ومعاشرت (ملت ابراہیمی) اور ایک ہی زبان (عربی) میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں، جس سے انسانیت کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں، ایک لباس احرام میں، ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں خدا سے باتیں کرتی ہیں یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ وجدل اور فتنہ وفساد کے اسباب ہیں، اس لیے یہ حرم ربانی نہ صرف اسی معنی میں امن کا گھر ہے کہ یہاں ہر قسم کی خونریزی اور ظلم وستم ناروا ہے۔ بلکہ اس لحاظ سے بھی امن کا گھر ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری قائم کر کے ان کے تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

لوگ آج یہ خواب دیکھتے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کے وسعت آباد میں داخل ہوں، مگر ملت ابراہیمی کی ابتدائی دعوت اور ملتِ محمدی ﷺ کی تجدیدی پکار نے سینکڑوں ہزاروں برس پہلے اس خواب کو دیکھا اور دنیا کے سامنے اس کی تعبیر پیش کی، لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان (اسپرنٹو) کی ایجاد وکوشش میں مصروف ہیں، مگر خانہ کعبہ کے مرکزیت کے فیصلہ نے آل ابراہیم کے لیے مدت دراز سے اس مشکل کو حل کر دیا ہے۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک ورلڈ کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ساڑھے تیرہ سو برس سے یہ مجلس دنیا میں قائم ہے اور اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے۔ آج دنیا کی قومیں ''ہیگ'' (ہولینڈ) میں اقوام عالم کی مشترکہ عدالت گاہ کی بنیاد ڈالتے ہیں لیکن اس کے فیصلوں کو کسی طاقت سے منوا نہیں سکتیں لیکن مسلمان اقوام عالم کے لیے یہ مشترکہ عدالت گاہ ہمیشہ سے قائم ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلہ سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں۔

مسلمان ڈیڑھ سو برس تک جب تک ایک نظم حکومت یا خلافت کے ماتحت رہے یہ حج کا موسم ان کے سیاسی اور تنظیمی ادارہ کا سب سے بڑا عنصر رہا۔ یہ وہ زمانہ ہوتا تھا جس میں امور خلافت کے تمام اہم معاملات

طے پاتے تھے۔ اسپین سے لے کر سندھ تک مختلف ملکوں کے حکام اور والی جمع ہوتے تھے اور خلیفہ کے سامنے مسائل پر بحث کرتے تھے اور طریق عمل طے کرتے تھے اور مختلف ملکوں کی رعایا آ کر اگر اپنے والیوں اور حاکموں سے کچھ شکایتیں ہوتی تھیں تو ان کو خلیفہ کی عدالت میں پیش کرتی تھی اور انصاف پاتی تھی۔

غالباً یہی وجہ ہے کہ مسائل حج کے فوراً ہی بعد اللہ تعالیٰ نے ملک میں فساد اور بے امنی کی برائی کی اور فرمایا:

﴿ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۲۰۴۔۲۰۵)

’’بعض آدمی ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیا کی زندگی میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ پرلے درجہ کے جھگڑالو ہیں اور جب پیٹھ پھیریں تو ملک میں دوڑتے پھرتے ہیں کہ اس میں بے امنی برپا ہو اور، تاکہ کھیتیاں اور جانیں تلف ہوں اور اللہ فساد کرنے کو پسند نہیں کرتا۔‘‘

پھر دو آیتوں کے بعد فرمایا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَاۗفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ۭ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۰۸)

’’اے ایمان والو! تم سب کے سب امن میں داخل ہو جاؤ اور شیطان کے نقش قدم پر مت چلو کہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔‘‘

اسلام کے احکام اور مسائل جو دم کے دم میں اور سال بسال دور دراز اقلیموں ملکوں اور شہروں میں اس وقت پھیل سکے، جب سفر اور آمد و رفت کا مسئلہ آسان نہ تھا اس کا اصلی راز یہی سالانہ حج کا اجتماع ہے اور خود رسول اللہ ﷺ نے اپنا سب سے آخری حج جو ’’حجۃ الوداع‘‘ کہلاتا ہے اسی اصول پر کیا، وہ انسان جو تیرہ برس تک مکہ میں یکہ و تنہا رہا، ۲۳ برس کے بعد وہ موقع آیا جب اس نے تقریباً ایک لاکھ کے مجمع کو بیک دفعہ خطاب کیا اور سب نے سمعًا و طاعۃً کہا، آپ کے بعد خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اور دوسرے خلفائے زمانہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ائمہ اعلام نے اسی طرح سال بسال جمع ہو کر احکام اسلام کی تلقین و تبلیغ کی خدمت ادا کی، اسی کا نتیجہ تھا کہ نت نئے واقعات اور مسائل کے متعلق دنیا کے مختلف گوشوں میں اسلام کے جوابی احکام اور فتوے پہنچتے رہے اور پہنچتے رہتے ہیں۔

یہ اسی مرکزیت کا اثر ہے کہ بڑے بڑے صحابہ رضی اللہ عنہم اور عالم، محدث، مفسر اور فقیہ جو اسلامی فتوحات اور نو آبادیوں کے سلسلہ میں تمام دنیا میں پھیل گئے تھے وہ سال بسال پھر آ کر یہاں سمٹ جاتے تھے اور تمام دنیا کے گوشوں سے آ کر حرم ابراہیم علیہ السلام میں جمع ہو جاتے تھے اور باہم ایک دوسرے سے مل کر اس علم کو جو ابھی

دنیا میں متفرق و پراگندہ تھا ابراہیمی درسگاہ کے صحن میں ایک دفتر میں جمع کر دیتے تھے۔یہیں آ کر بخارا کا باشندہ اسپین اور مراکش کے رہنے والوں سے، شامی عراقی اور مصری حجازی سے، بصری کوفی سے، کوفی بصری سے، ترمذی نیشاپوری سے، اندلسی، سندھی (ہندوستان) سے، رومی یمنی سے فیض پاتا تھا اور دم کے دم میں سندھ کا علم اسپین میں اور اسپین کی تحقیق سندھ میں پہنچ جاتی تھی۔ مصر کی تصنیف و روایت ترکستان میں اور ترکستان کا فیصلہ مصر و شام میں پہنچ جاتا تھا۔ ابن مسعود رضی اللہ عنہ کے شاگرد ابن عمر رضی اللہ عنہ اور عائشہ رضی اللہ عنہا کے تلامذہ سے اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے مسترشد ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے مستفیدوں سے اور انس رضی اللہ عنہ کے حلقہ کے فیض یاب علی رضی اللہ عنہ کے شاگردوں سے مستفید و سیراب ہوتے تھے۔ یہی وہ مرکز تھا جہاں ائمہ مجتہدین باہم ایک دوسرے سے ملتے اور ایک دوسرے کے علم سے فیضیاب ہوتے تھے اور یہی تعارف وہ اصلی ذریعہ تھا جس کی بنا پر صحابہ کرام اور ان کے تلامذہ اور مستفیدین کے تمام دنیا میں پھیل جانے کے باوجود بھی محمد رسول اللہ ﷺ کے حالات و واقعات و مغازی اور احکام و فرامین و وصایا کا سارا دفتر پھر سمٹ کر ایک ہو گیا اور آپ کے سیر و مغازی اور احادیث و تعلیمات مرتب و مدّون ہو کر ہر مسلمان کے سامنے آ گئیں اور موطا، صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی اور احادیث کے متعدد دفاتر عالم وجود میں آئے اور ائمہ مجتہدین کے لیے یہ ممکن ہو سکا کہ مسائل کے متعلق دوسرے اماموں کے خیالات و معلومات سے مستفید ہو کر اجتماعی مسائل کو الگ کر سکیں اور اس سے پہلے کہ کتابیں مدّون ہوں اور پھیلیں ہر ملک اور ہر شہر کے علما دوسرے ملک اور شہر کے علما کے خیالات و معلومات سے واقف ہو سکیں اور زمانہ کے حالات کے زیر اثر آج تک کم و بیش یہ سلسلہ قائم ہے۔ یہ اسی کی مرکزیت کا نتیجہ ہے کہ عام مسلمان جو اپنے اپنے ملکوں میں اپنے اپنے حالات میں گرفتار ہیں وہ دور دراز مسافتوں کو طے کر کے اور ہر قسم کی مصیبتوں کو جھیل کر دریا، پہاڑ، جنگل، آبادی اور صحرا کو عبور کر کے یہاں جمع ہوتے۔ ایک دوسرے سے ملتے ایک دوسرے کے درد و غم سے واقف اور حالات سے آشنا ہوتے ہیں جس سے ان میں باہمی اتحاد اور تعاون کی روح پیدا ہوتی ہے۔ یہیں آ کر چینی مراکش سے، تونسی ہندی سے، تاتاری حبشی سے، فرنگی زنگی سے، عجمی عربی سے، یمنی نجدی سے، ترکی افغانی سے، مصری ترکستانی سے، روسی الجزائری سے، افریقی یورپین سے اور جاوی بلغاری سے ملتا ہے اور سب مل کر باہم ایک قوم، ایک نسل، ایک خاندان کے افراد نظر آتے ہیں۔ اسی کا اثر تھا اور ہے کہ معمولی سے معمولی مسلمان بھی اپنے ملک سے باہر کی کچھ دنیا دیکھ آتا ہے زمانہ کے رنگ کو پہچاننے اور سیاسیات کی پیچیدگیوں کو سمجھنے لگتا ہے بین الاقوامی معاملات سے دلچسپی لیتا ہے اور دنیا کے ہر اس گوشہ کے حالات سے جس کے منارہ سے اللہ اکبر کی آواز بلند ہو اس کو خاص ذوق ہوتا ہے اور اسی کا اثر ہے کہ ہر مسلمان دنیائے اسلام اور اسلامی ملکوں کے حالات و واقعات کے لیے بے چین نظر آتا ہے پھر اسی کا نتیجہ ہے کہ ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد ایسی ملے گی جس کو دنیا کے سفر کا کچھ تجربہ

ہوگا اور خشکی وتری سے اس کو کچھ واقفیت ہوگی دنیا کے جغرافیائی معلومات کے بڑھانے اور ترقی دینے میں سفر حج نے بہت کچھ مدد کی ہے مسلمانوں میں بکثرت ایسے جغرافیہ نویس اور سیاح گزرے ہیں جنہوں نے اصل میں حج کی نیت سے سفر کیا اور بالآخر اس سفر نے دنیا کی ایک عام سیاحت کی حیثیت اختیار کرلی۔ یاقوت رومی نے اپنے جغرافیہ تقویم البلدان کے مقدمہ میں مسلمانوں میں جغرافی معلومات کی ترقی کا ایک بڑا ذریعہ اسی سفر حج کو قرار دیا ہے۔

رزقِ ثمرات

اس مرکز کو قائم اور آباد رکھنے کے لیے یہ ضروری تھا کہ اس شور ویرانے میں بسنے والوں کے لیے رزق کا کوئی سامان کیا جائے۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا مانگی تھی کہ خداوندا! میں نے اپنی اولاد کو اس بے حاصل اور بے آب وگیاہ سرزمین میں آباد کیا ہے، تو لوگوں کے دل ان کی طرف جھکانا اور ان کے رزق کا سامان کرنا اور ان کو پھل کی روزی دینا، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ دعا قبول فرمائی، اس کی ایک صورت یہ ہوسکتی تھی کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے زکوۃ وخیرات کی کوئی رقم خاص کی جاتی، لیکن یہ ان لوگوں کی اخلاقی پستی اور دون فطرتی کا سبب ہوجاتی، وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل وخوار ہوجاتے جو ان کے منصب کی عزت اور شرف کے مناسب نہ ہوتا، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی یہ تدبیر کی کہ ان کے دلوں میں تجارت کا شوق پیدا کیا اور اس کو ان کی روزی کا سامان بنادیا۔ حضرت اسماعیل کی اولاد کا جہاں کہیں پرانی تاریخوں میں وجود نظر آتا ہے، وہ تجارت اور سوداگری کے بھیس میں ملتی ہے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام ہی کے زمانہ میں جو حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بھتیجے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے تھے، بنی اسماعیل کا تجارتی قافلہ عرب سے مصر کو جاتا ہوا نظر آتا ہے۔ (تکوین ۳۷۔ ۲۸ سے ۳۶ تک) توراۃ کے متعدد مقامات میں عرب سوداگروں اور تاجروں کا خاص طور سے ذکر ملتا ہے۔ خود قریش بھی اپنے زمانہ کے بڑے تاجر اور سوداگر تھے۔ جس کا ذکر سورۂ لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ میں ہے، وہ ایک طرف یمن اور حبشہ تک اور دوسری طرف شام ومصر وروم تک جاتے تھے۔ [1]

لیکن چونکہ یہ تجارت بھی مکہ معظمہ کے ہر ادنیٰ واعلیٰ کی شکم سیری کے لیے کافی نہ تھی، اس لیے خود مکہ کی سرزمین کو اور حج کے مقام کو تجارت کی منڈی بنانے کی ضرورت تھی، چنانچہ اسلام سے پہلے بھی حج کا موسم عرب کا ایک بڑا میلہ تھا اور عکاظ وغیرہ کا بڑا بازار لگتا تھا۔ اسلام نے بھی اس کو باقی رکھا کہ یہ دعائے ابراہیمی کا مصداق اور اس شور و بے حاصل زمین کے بسنے والوں کے لیے روزی کا سامان تھا۔ اسلام کے بعد تمام دنیا سے مسلمان یہاں آنے لگے، چنانچہ سال کے دو تین مہینے میں یہاں کے رہنے والے تجارت اور سوداگری سے اس قدر مال کما لیتے ہیں کہ وہ سال بھر کھا پی سکیں۔ مکہ سے مدینہ کو جب قافلہ جاتا ہے تو پورے راستہ اور منزلوں

[1] تفصیل اور حوالوں کے لیے دیکھو میری تالیف ارض القرآن، جلد دوم، باب تجارات العرب قبل الاسلام۔

کے بدّو اپنے پھل اور پیداوار لے کر آتے ہیں اور خرید وفروخت سے اپنی زندگی کا سامان حاصل کرتے ہیں کھانا پینا، مکان، سواری اور دوسری ضروریات اسی شہر اور اس کے آس پاس سے تمام حاجی حاصل کرتے ہیں اور اس کا معاوضہ ادا کرتے ہیں اور آخر یہی زرِ معاوضہ اہل مکہ کے قوتِ لا یموت کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قربانی کی اقتصادی حیثیت

اس ملک کی فطری پیداواروں میں اگر کوئی چیز ہے تو وہ جانوروں کی پیداوار ہے، اس بنا پر قربانی کے فریضہ نے بھی ان اہل عرب اور اہل بادیہ کے لیے ان جانوروں سے اپنی روزی کے پیدا کرنے کا سامان کر دیا۔ ہر سال تقریباً ایک لاکھ حاجی قربانی کرتے ہیں، جن میں سے بعض کئی کئی کرتے ہیں، اس حساب سے سالانہ دو لاکھ جانوروں سے کم کی قربانی نہیں ہوتی اور عموماً دنبہ کی قیمت آٹھ روپے اور بکری کی چار روپے وہاں ہوتی ہے [1] تو اس تقریب سے کم وبیش دس بارہ لاکھ روپے ہر سال اہل بادیہ کو اپنے جانوروں کی فروخت سے ملتے ہیں اور یہ اس بے آب وگیاہ اور ویران ملک کے باشندوں کی بہت بڑی مدد ہے۔

ابراہیمی دعا کی مقبولیت

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی دعا میں خاص طور سے پھلوں کا ذکر کیا تھا:

﴿ وَارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۲۶)

''اور یہاں کے رہنے والوں کو پھلوں میں سے روزی دینا۔''

اس دعا کا یہ اثر ہے کہ تعجب ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ کے بازاروں میں ہر وقت تازہ سے تازہ پھل، میوے، سبزی اور ترکاریاں نظر آتی ہیں اور دعائے ابراہیمی کا وہ جلوہ دکھاتی ہیں کہ زبان کے ذائقہ کے ساتھ ایمان کی حلاوت کا مزا بھی ملنے لگتا ہے۔

تجارت

قرآن پاک کے محاورہ میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت اور روزی حاصل کرنا ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصول رزق کو بھی قرار دیا ہے، چنانچہ سورۂ مائدہ میں ہے:

﴿ وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرِضْوَانًا ﴾ (۵/ المآئدۃ: ۲)

''اور نہ ان کو (ستاؤ) جو اس ادب والے گھر کے قصد سے جا رہے ہوں، اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرتے ہوئے۔''

---

[1] یہ تخمینہ میں نے اپنے پہلے سفر حج کے تجربہ کی بنا پر ۱۳۴۴ھ/ ۱۹۲۶ء میں کیا تھا، مگر اس کے ۲۴ برس بعد ۱۳۶۸ھ/ ۱۹۴۹ء میں جب دوبارہ حج کی توفیق ملی تو زمانہ کے اقتصادی تغیرات نے پچھلے تخمینہ کو یک قلم بدل دیا، اب ہر چیز کی قیمت گرانی کی طرف مائل ہے جانوروں کی قیمت بھی چوگنی نظر آئی، بکری کی قیمت کم از کم سولہ سترہ روپے دنبہ کی قیمت تیس، بتیس روپے گائے، بیل کی قیمت اسّی سے سو روپے تک اور اونٹ کی ڈیڑھ دو سو تک نظر آئی۔ اب اس تخمینہ کی بنا پر ہر چیز کی قیمت چوگنی ہوگئی ہے ''س'' ۲۰ محرم ۱۳۷۱ھ اور اب ۱۴۰۴ھ میں تو قیمت کا کچھ ٹھکانا ہی نہیں ہے۔ (ناشر)

یعنی ان کے مال واسباب کو لوٹنا جائز نہیں کہ اس بے اطمینانی سے حج کا ایک بڑا مقصد فوت ہو جائے گا۔

تجارت اور روزی حاصل کرنا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے، اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اپنے اس خالص مذہبی سفر میں تجارت وغیرہ جیسی کسی دنیاوی غرض کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ لوگوں سے بھیک مانگ مانگ کر حج کرنا اچھا نہیں کہ یہ تقویٰ کے خلاف ہے، بلکہ تجارت کرتے ہوئے چلو تو بہتر ہے اور فرمایا:

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۞ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ اَنْ تَبْتَغُوْا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ ﴾ (۲/ البقرۃ: ۱۹۷۔۱۹۸)

''اور راہ کا توشہ (خرچ) لے کر چلو کہ راستہ کا سب سے اچھا توشہ تقویٰ (بھیک نہ مانگنا) ہے تم پر گناہ نہیں ہے کہ تم اپنے پروردگار کا فضل تلاش کرتے ہوئے چلو (یعنی بیوپار کرتے ہوئے)۔''

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو دین کے سفر میں جائز نہیں۔ درست نہ تھا کہ اول تو طلب رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے۔ دوسرے یہ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا کی بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی کی ترقی اور بقا ممکن نہیں، یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے۔ جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔ یہ مقام گویا مسلمانوں کے عالمگیر تجارتی کاروبار کا مرکز اور ممالک اسلامیہ کی صنعتوں کی سالانہ نمائش گاہ ہے۔ جس کا پچھلا بقیہ نمونہ آج بھی موجود ہے، وہ کون سا اسلامی ملک ہے، جہاں کی صنعت کا نمونہ یہاں دیکھنے والے کو نظر نہیں آ سکتا، لیکن افسوس ہے کہ آج کل کے مسلمانوں نے حج کے اس اہم نکتہ کی اہمیت کو کچھ تو بھلا دیا ہے اور کچھ غیر مسلمانوں کی تجارتی چیرہ دستی سے وہ دبے بھی ہیں اور آج وہ مرکز جو اسلامی ملکوں کا مرکزی بازار تھا، یورپ کے مصنوعات کا مرکزی بازار بن رہا ہے۔ اس جنگ عظیم کے بعد سے حالات اور بھی زیادہ انحطاط پذیر ہیں۔

روحانیت

روحانیت سے مقصود وہ تاثرات اور کیفیتیں ہیں جو ان مقامات کی زیارت اور ان ارکانِ حج کے ادا کرنے سے قلب وروح میں پیدا ہوتی ہیں، ان کی ایک حیثیت تو وطنی، دوسری تاریخی اور تیسری خالص روحانی ہے۔ وطنی ہونے کے یہ معنی کہ گو مسلمان دنیا کے ہر ملک میں رہتے، ہر زبان بولتے اور ہر لباس پہنتے ہیں، تاہم ان کے اندر یہ احساس باقی رہتا ہے کہ وہ جسمانی طور سے کہیں ہوں تاہم روحانی طور سے ان کا مسکن عرب ہی کی سرزمین ہے۔ وہی ملّت ابراہیمی کا مقام۔ اسلام کا مولد اور قرآن کی مہبط ہے، اس لیے دور دراز مسافتوں سے ولولہ اور شوق کے بازاروں سے اڑ کر جب لوگ یہاں پہنچتے ہیں تو اس ریگستان اور پہاڑ کو دیکھ کر ان کی

محبت کا سرچشمہ ابلنے لگتا ہے اور ان کے دل میں اسلام کے وطن اور قرآن کی سرزمین کے مشاہدہ سے ایک خاص کیفیت پیدا ہوتی ہے، مسلمان جس ملک میں بھی ہے، اس کو وہاں اسلام اپنے خالص وطن میں نظر نہیں آتا ہر جگہ اس کو اپنے ساتھ دوسری قومیں بھی نظر آتی ہیں۔ اپنے مذہب کے ساتھ اس کو دوسرے مذہب بھی دکھائی دیتے ہیں۔ اپنے تمدن کے ساتھ دوسرے تمدنوں کا بھی منظر سامنے ہوتا ہے، لیکن یہاں اسلام اس کو اپنے خالص رنگ میں جلوہ گر معلوم ہوتا ہے، گردوپیش، آگے پیچھے، داہنے بائیں، ہر طرف اور ہر سمت اس کو اسلام ہی کا مجسم پیکر دکھائی دیتا ہے اور اس وقت سرزمین حجاز اور دنیا کے کل ممالک کا تعلق اس کی نگاہ میں ایسا نظر آتا ہے، جس طرح نوآبادیوں کے رہنے والوں کی نگاہ میں اپنی مادر وطن (مدر لینڈ) کی حیثیت۔ آج انگریز ہندوستان، عراق، مصر، فلسطین، سائپرس، جبل الطارق، نیوزی لینڈ، سنگاپور، آسٹریلیا، یوگنڈا، ٹرنسوال، زنجبار، افریقہ اور کینڈا (امریکہ) کے متفرق ملکوں میں آباد ہیں، تاہم انگلینڈ کا چھوٹا سا جزیرہ ان کی نگاہ میں اس وسیع برطانوی مملکت کا جس میں آفتاب نہیں غروب ہوتا مرکز ہے۔ وہ ان کا اصلی آبائی وطن اور مسکن ہے، وہ تمدن، معاشرت، اخلاق، تعلیم، لٹریچر، ہر چیز میں اپنے اس آبائی وطن و مسکن کی پیروی کرتے ہیں، جب ان کی آنکھیں اس کے دیدار سے مشرف ہوتی ہیں تو اپنی خالص اور بے میل تہذیب اخلاق اور تمدن کے ملک کو دیکھ کر مسرت اور خوشی سے روشن ہو جاتی ہیں، وہ اس کے ایک ایک در و دیوار کو عزت اور عظمت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں، اس وقت ان کے دل میں وہ احساسات پیدا ہوتے ہیں جو دوسرے ملکوں قوموں اور تمدنوں میں رہنے کی وجہ سے ان کی فرسودہ اور پژمردہ ہو جانے والی فکر اور عمل کی قوتوں کو بیدار کر دیتے ہیں اور وہ یہاں آ کر اپنی خالص تہذیب و تمدن کے پاک و صاف چشمہ حیات میں نہا کر نئے سرے سے پھر جوان ہو جاتے ہیں۔ بلاتشبیہ اس قسم کی کیفیت اور لذت ان مسلمانوں کی ہے، جو عرب کو اپنا، اپنے مذہب کا، اپنی قومیت کا، اپنے تمدن کا، اپنے علوم و فنون کا مولد و مسکن سمجھتے ہیں، ان میں سے جب کسی کو اس ملک اور اس شہر کی زیارت کا موقع ملتا ہے تو اس کا ذرہ ذرہ اس زائر کے دامن دل سے لپٹ جاتا ہے اور وہ چلا اٹھتا ہے:

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم　　کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا ایں جاست

یہی فلسفہ ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ نے یہ وصیت فرمائی کہ اس ملک میں اسلام کے سوا کوئی دوسرا مذہب، کعبہ کے سوا کوئی دوسرا قبلہ اور قرآن کے سوا کوئی دوسرا صحیفہ نہ رہنے دیا جائے اور قرآن نے حکم دیا کہ مشرک و کافر اس ادب والی مسجد کے قریب بھی نہ آنے پائیں، تاکہ یہاں اسلام کا سرچشمہ ہر طرح پاک و صاف اور کفر و شرک کی ہر قسم کی نجاستوں سے محفوظ رہے، تاکہ ہر گوشہ اور ہر سمت سے یہاں آ کر مسلمان خالص پاکیزگی حاصل اور روح ایمانی کو تازہ کر سکیں۔ قرآن پاک نے مکہ معظمہ کو اُمّ القریٰ یعنی آبادیوں کی ماں کہا ہے، اگر مکہ معظمہ تمام دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل نہ بھی ہو تو اسلامی دنیا کی آبادیوں کی ماں اور اصل و مرجع اور ماویٰ تو ضرور ہے۔

تاریخیت

اسلام کی ابتدائی تاریخ کا حرف حرف اسی عرب اور حرم پاک کے ذرہ ذرہ سے مرتب ہوا ہے آدم علیہ السلام سے لے کر ابراہیم علیہ السلام تک اور ابراہیم علیہ السلام سے لے کر محمد رسول اللہ ﷺ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدم علیہ السلام نے سکونت کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا۔ یہیں حوا علیہا السلام نے آ کر ان سے ملاقات کی۔ یہیں نوح علیہ السلام کی کشتی نے آ کر دم لیا۔ حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے یہاں پناہ لی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام، نے یہاں ہجرت کی۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام نے یہیں سکونت اختیار کی۔ حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے یہاں ولادت پائی۔ یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے گدھے چھوڑ کر اترے، یہیں وہ دوسری پہاڑی ہے (مروہ) جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی کرنی چاہی۔ یہیں وہ چشمہ ہے (زمزم) جو حضرت حاجرہ علیہا السلام کو پیاس کے عالم میں نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہو کر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام اور عرفات ہیں، جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ پتھر (حجر اسود) ہے جو ابراہیم و اسماعیل علیہما السلام اور محمد رسول اللہ ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ملت ابراہیمی کی بنیاد پڑی، یہی وہ آبادی ہے جہاں اسلام کا آفتاب طلوع ہوا۔ یہی وہ گلیاں اور راستے ہیں، جو جبریل امین کی گزرگاہ تھے، یہیں وہ غار حرا ہے جس سے قرآن کی پہلی کرن پھوٹی تھی، یہی وہ صحنِ حرم ہے جس میں محمد رسول اللہ ﷺ نے ترپن سال بسر کیے اور یہی وہ مقام ہے، جہاں براق کے قدم پڑے تھے اور یہی وہ مکانات ہیں، جن کی ایک ایک اینٹ اسلام کی تاریخ کا ایک ایک صفحہ ہے، کیا قرآن پاک کا اشارہ انہیں مناظر اور مشاہد کی طرف نہیں، جہاں اس نے کہا:

﴿ فِيهِ ءَايَٰتٌۢ بَيِّنَٰتٌ مَّقَامُ إِبْرَٰهِيمَ ۖ ﴾ (۳/ آل عمران: ۹۷)

''اس حرم میں کھلے کھلے (ربانی) نشانات ہیں ابراہیم کے قیام کی جگہ۔''

ان مقامات اور مناظر میں کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں نیچی ہو جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر جھک جاتا ہے، اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے، اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے اور محبت کی روح اس کی رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے:

﴿ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَٰٓئِرَ ٱللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى ٱلْقُلُوبِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۲)

''اور جو خدا کی نشانیوں اور یادگاروں کی عظمت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ کے سبب سے ہے۔''

﴿ وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ ؕ ﴾ (۲۲/ الحج: ۳۰)

''اور جو خدا کی حرمتوں کی تعظیم کرتا ہے تو وہ اس کے لیے اس کے خدا کے نزدیک بہتر ہے۔''

خالص روحانیت

حج کی حقیقت میں گزر چکا ہے کہ وہ دراصل اس رسمی قربانی اور اس دوڑ دھوپ کا نام نہیں یہ تو حج کی روحانیت کی صرف جسمانی اور مادی شکل ہے۔ حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں، اسی لیے سرورِ کائنات علیہ السلام نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج مبرور رکھا ہے، یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے، جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے۔ حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے:

﴿ رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِنْ ذُرِّيَّتِنَاۤ اُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ ۪ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۚ اِنَّكَ اَنْتَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۲۸)

''اے ہمارے پروردگار! ہم کو اپنا فرمانبردار (مسلم) بنا اور ہماری اولاد میں سے اپنا ایک فرمانبردار گروہ بنا اور ہم کو اپنے حج کے احکام اور دستور سکھا اور ہم پر رجوع ہو (یا ہم کو معاف کر) تو (بندوں کی طرف) رجوع ہونے والا (یا انکو معاف کرنے والا) اور رحم کرنے والا ہے۔''

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح ضرور قبول کی گئی ہے، اس سے ظاہر ہوا کہ حج درحقیقت خدا کے سامنے اس سرزمین میں حاضر ہو کر، جہاں اکثر نبیوں، رسولوں اور برگزیدوں نے حاضر ہو کر اپنی اطاعت اور فرمان برداری کا اعتراف کیا، اپنی اطاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار کرنا ہے اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر خدا کی بارگاہ میں اپنی سیہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولیٰ کو منانا ہے، تاکہ وہ ہماری طرف پھر رجوع ہو کہ وہ تو اپنے تائب گناہگاروں کی طرف رجوع ہونے کے لیے ہر وقت تیار ہے، وہ تو رحم و کرم، لطف و عنایت کا بحر بیکراں ہے۔ یہی سبب ہے کہ شفیع المذنبین ﷺ نے فرمایا کہ ''حج اور عمرہ گناہوں کو اس طرح صاف کر دیتے ہیں جس طرح بھٹی لوہے، سونے اور چاندی کے میل اور کھوٹ کو صاف کر دیتی ہے اور جو مومن اس دن (یعنی عرفہ کے دن) احرام کی حالت میں گزارتا ہے، اس کا سورج ڈوبتا ہے تو اس کے گناہوں کو لے کر ڈوبتا ہے۔''[1] صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ آپ ﷺ نے یہ بشارت دی کہ ''عرفہ کے دن سے بڑھ کر کوئی دن نہیں جس میں خدا اپنے

[1] ترمذی، ابواب الحج، باب ما جاء فی ثواب الحج والعمرۃ: ۸۱۰، ۸۱۱؛ نسائی، کتاب المناسك، باب فضل المتابعة بين الحج والعمرة: ۲۶۳۱، ۲۶۳۲ وبزار وطبرانی کبیر بحواله جمع الفوائد، کتاب المناسك، فضل الحج ووجوبه، ج۱، ص: ۱۶۳ میرٹھ۔

بندوں کو دوزخ کے عذاب سے آزاد کرتا ہے، وہ اس دن اپنے بندوں سے قریب ہو کر جلوہ گر ہوتا ہے اور اپنے ان بندوں پر فرشتوں کے سامنے فخر کرتا ہے [1] اور کہتا ہے جو انہوں نے مانگا (وہ ہم نے قبول کیا)۔'' مؤطا امام مالک میں ہے کہ آپ ﷺ نے یہ خوشخبری سنائی کہ ''بدر کے دن کے سوا عرفہ کے دن سے زیادہ شیطان کسی دن ذلیل، رسوا اور غضبناک نہیں ہوتا، کیوں کہ اس دن وہ دیکھتا ہے کہ خدا کی رحمت برس رہی ہے اور گناہ معاف ہو رہے ہیں۔'' [2] اسی طرح اور بہت سی حدیثیں ہیں جن میں مخلصانہ حج ادا کرنے والوں کو رحمت اور مغفرت کی نوید سنائی گئی ہے۔ یہ تمام حدیثیں درحقیقت اسی دعائے ابراہیمی ﴿وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا﴾ ''اور ہمارے حج کے دستور ہم کو سوجھا اور ہماری توبہ قبول فرما۔'' کی تفسیریں ہیں۔ ان تمام بشارتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ حج درحقیقت توبہ اور انابت ہے، اسی لیے احرام باندھنے کے ساتھ ((لَبَّيْكَ اللّٰهُمَّ لَبَّيْكَ)) ''خداوند! میں حاضر ہوں، میں حاضر ہوں'' کا ترانہ دم بدم اس کی زبان سے بلند ہونے لگتا ہے۔ طواف میں، سعی میں، کوہ صفا پر، کوہ مروہ پر، عرفات میں، مزدلفہ میں، منیٰ میں اور ہر جگہ جو دعائیں مانگی جاتی ہیں، ان کا بڑا حصہ توبہ اور استغفار کا ہوتا ہے اور اس بنا پر کہ ((اَلتَّائِبُ مِنَ الذَّنْبِ كَمَنْ لَّا ذَنْبَ لَهٗ)) [3] ''گناہ سے بصدق دل توبہ کرنے والا ایسا ہے، جیسا وہ جس کا کوئی گناہ نہیں ہے'' اس لیے حج مبرور والوں کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔ گو کہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتے ہیں، اس کے لیے کعبہ اور عرفات کی کچھ تخصیص نہیں۔ لیکن حج کے مشاعر، مقامات اور ارکان اپنے گونا گوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ جو یہاں کے سوا اور کہیں نہیں صدق توبہ کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ ان مقامات کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے، وہ مقامات جہاں انبیا علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی، وہ ماحول، وہ فضا، وہ تمام گناہگاروں کا ایک جگہ اکٹھا ہو کر دعا وزاری، فریاد و بکا اور آہ و نالہ وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں خدا اور اس کے برگزیدہ بندوں کے بیسیوں ناز و نیاز کے معاملات گزر چکے ہیں، دعا اور اس کے تاثر اور اس کے قبول کے بہترین مواقع ہیں، جہاں حضرت آدم علیہ السلام و حوا علیہا السلام نے اپنے گناہوں کی معافی کی دعا کی۔ جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی بیوی اور اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی، جہاں حضرت ہود علیہ السلام اور حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کی ہلاکت کے بعد اپنی پناہ ڈھونڈھی، جہاں دوسرے پیغمبروں نے دعائیں کیں، جہاں محمد رسول اللہ ﷺ نے کھڑے ہو کر اپنی اور اپنی امت کے لیے دعائیں مانگیں، وہی مقامات، وہی مشاہد اور دعاؤں کے وہی ارکان، ہم گناہگاروں کی دعائے مغفرت کے لیے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان حالات اور ان مشاہد کے درمیان موم بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں اور انسان اس ابر کرم کی چھینٹوں سے سیراب ہو جاتا ہے، جو وقتاً فوقتاً یہاں

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل یوم عرفة: ۳۲۸۸؛ نسائی، کتاب المناسك، باب ما ذکر فی یوم عرفة: ۳۰۰۶۔ [2] موطا امام مالك، کتاب الحج، باب جامع الحج: ۹۶۲۔

[3] سنن ابن ماجه، ابواب الزهد، باب ذکر التوبة: ۴۲۵۰۔

برگزیدگانِ الٰہی پر عرشِ الٰہی سے برستا رہا ہے اور ہنوز آں ابر رحمت درفشاں است ۔انسان کی نفسیات (سائیکالوجی) یہ ہے اور روزمرہ کا تجربہ اس کا شاہد ہے کہ وہ اپنی زندگی میں کسی بڑے اور اہم تغیر کے لیے ہمیشہ زندگی کے کسی موڑ اور حدفاصل کی تلاش کرتا ہے۔ جہاں پہنچ کر اس کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے دو ممتاز حصے پیدا ہو جائیں، اسی لیے لوگ اپنے تغیر کے لیے جاڑا، گرمی یا برسات کا انتظار کرتے ہیں۔ بہت سے لوگ شادی کے بعد یا صاحب اولاد ہونے کے بعد یا تعلیم سے فراغت کے بعد یا کسی نوکری کے بعد یا کسی بڑی کامیابی یا کسی خاص مہم اور سفر کے بعد یا کسی سے مرید ہو جانے کے بعد بدل جاتے ہیں یا اپنے کو بدل لینے پر قادر ہو جاتے ہیں کیوں کہ ان کی زندگی کے یہ اہم واقعات اور سوانح ان کی اگلی اور پچھلی زندگی میں فصل اور امتیاز کا خط ڈال دیتے ہیں، جہاں سے ادھر یا ادھر مڑ جانا ناممکن ہو جاتا ہے، حج درحقیقت اسی طرح انسان کی گزشتہ اور آئندہ زندگی کے درمیان ایک حدفاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی جانب اپنی زندگی کو پھیر دینے کا موقع بہم پہنچاتا ہے، یہاں سے انسان اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے، ان بابرکت مقاموں پر حاضر اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصان الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے، اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ اور اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گزشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لیے نئے سرے سے پیدا ہوتا ہے، اسی لیے سرور کائنات علیہ السلام نے یہ فرمایا:

((مَنْ حَجَّ لِلّٰهِ فَلَمْ يَرْفُثْ وَلَمْ يَفْسُقْ رَجَعَ كَيَوْمِ وَلَدَتْهُ أُمُّهُ)) [1]

”جس نے خدا کے لیے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے، جیسے اس دن تھا جس دن اسکی ماں نے اس کو جنا۔“

یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دور شروع کرتا ہے، جس میں دین اور دنیا دونوں کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی، یہ فلسفہ خود قرآن پاک کی ان آیتوں کا خلاصہ ہے جو حج کے باب میں ہیں اور جس کی آخری آیتیں طواف کی دعا کا آخری ٹکڑا ہیں:

﴿ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ النَّاسُ وَاسْتَغْفِرُوا اللّٰهَ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ فَإِذَا قَضَيْتُم مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي

[1] سنن ابی داؤد کے علاوہ بقیہ تمام کتب صحاح کی کتاب الحج میں یہ حدیث موجود ہے مثلاً: صحیح بخاری، کتاب الحج، باب فضل الحج المبرور: ١٥٢١؛ صحیح مسلم، کتاب الحج، باب فضل الحج والعمرة: ٣٢٩١؛ ترمذی، ابواب الحج، باب ماجاء فی ثواب الحج والعمرة: ٨١١؛ سنن نسائی، کتاب مناسك الحج، باب فضل الحج: ٢٦٢٨؛ سنن ابن ماجه، ابواب المناسك، باب فضل الحج: ٢٨٨٩۔

الدُّنۡيَا وَمَا لَهٗ فِى الۡاٰخِرَةِ مِنۡ خَلَاقٍ۝ وَمِنۡهُمۡ مَّنۡ يَّقُوۡلُ رَبَّنَآ اٰتِنَا فِى الدُّنۡيَا حَسَنَةً وَّفِى الۡاٰخِرَةِ حَسَنَةً وَّقِنَا عَذَابَ النَّارِ۝ اُولٰٓئِكَ لَهُمۡ نَصِيۡبٌ مِّمَّا كَسَبُوۡا‌ؕ وَاللّٰهُ سَرِيۡعُ الۡحِسَابِ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۱۹۹۔۲۰۲)

''پھر طواف کے لیے وہیں سے چلو، جہاں سے لوگ چلے اور خدا سے اپنے گناہ کی معافی مانگو بے شک خدا معاف کرنے والا اور رحم کرنے والا ہے اور جب حج کے تمام ارکان ادا کر چکو تو اللہ کو اس طرح یاد کرو جس طرح اپنے باپ دادوں کو یاد کرتے ہو، یا ان سے بھی زیادہ تو بعض لوگ (حج کی دعا میں) کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں دے اور ایسوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں اور بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے اور آخرت میں بھی بھلائی دے اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا، یہ وہ ہیں جن کو اپنی کمائی کا حصہ ملے گا اور اللہ تمہارے اعمال کا تم سے جلد حساب لینے والا ہے۔''

حج کے بعض اور چھوٹے چھوٹے اخلاقی مصالح بھی ہیں، مثلاً:

① حج کے ذریعہ سے انسان اپنی تمام ذمہ داریوں کا احساس کر سکتا ہے۔ حج اس وقت فرض ہوتا ہے جب اہل و عیال کے نفقہ سے کچھ رقم بچتی ہے، اس لیے آدمی حج کے لیے اس وقت نکلتا ہے جب اہل و عیال کی ضرورتوں کا سامان کر لیتا ہے، اس لیے اس کو اہل و عیال کے مصارف کی ذمہ داریاں خود بخود محسوس ہو جاتی ہیں، معاملات میں قرض انسان کے سر کا بوجھ ہے اور حج وہی شخص ادا کر سکتا ہے جو اس سے سبکدوش ہو جائے، اس لیے معاملات پر اس کا نہایت عمدہ اثر پڑتا ہے۔ عام طرز معاشرت اور دنیوی کاموں میں آدمی اپنے سینکڑوں دشمن پیدا کر لیتا ہے، لیکن جب خدا کی بارگاہ میں جانے کا ارادہ کرتا ہے تو سب سے بری الذمہ ہو کے جانا چاہتا ہے، اس لیے رخصت کے وقت ہر قسم کے بغض و حسد سے اپنے دل کو صاف کر لیتا ہے، لوگوں سے اپنے قصور معاف کراتا ہے، روٹھوں کو مناتا ہے، قرض خواہوں کے قرض ادا کرتا ہے، اس لحاظ سے حج معاشرتی، اخلاقی اور روحانی اصلاح کا بھی ایک ذریعہ ہے۔

② اسلام آج ہر ملک میں ہے، اس لیے ہر ملک کی زبان اس کی زبان ہے تاہم اس کی ایک عمومی زبان بھی ہے، جو اس ملک کی زبان ہے، جہاں دنیا کے ہر ملک سے مسلمان آتے جاتے رہتے ہیں اور اس زبان کے بولنے اور سیکھنے پر اس سفر میں کچھ نہ کچھ مجبور ہوتے ہیں، اس کا اثر یہ ہے کہ ہر مسلمان قوم جو کوئی بھی بولی بولتی ہو وہ اس ملک کی زبان سے اور زبان سے نہ سہی تو الفاظ سے آشنا ہوتی ہے اور یہ اسلام کی عالمگیر اخوت کی ایک مضبوط کڑی ہے۔

③ مساوات اسلام کا سنگ بنیاد ہے، اگرچہ نماز بھی محدود طریقہ پر اس مساوات کو قائم کرتی ہے، لیکن پوری وسعت کے ساتھ اس کی اصلی نمائش حج کے زمانہ میں ہوتی ہے جب امیر و غریب، جاہل و عالم، بادشاہ و رعایا

ایک لباس میں، ایک صورت میں، ایک میدان میں، ایک ہی طرح خدا کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں، نہ کسی کے لیے جگہ کی خصوصیت ہوتی ہے، نہ آگے پیچھے کی قید۔

④ بہت سی اخلاقی خوبیوں کا سرچشمہ کسب حلال ہے، چونکہ ہر شخص حج کے مصارف میں مال حلال صرف کرنے کی کوشش کرتا ہے، اس لیے اس کو خود حلال وحرام کی تفریق کرنی پڑتی ہے اور اس کا جو اثر انسان کی روحانی حالت پر پڑ سکتا ہے، وہ ظاہر ہے۔

الغرض حج اسلام کا صرف مذہبی رکن نہیں، بلکہ وہ اخلاقی، معاشرتی، اقتصادی، سیاسی یعنی قومی وملی زندگی کے ہر رخ اور ہر پہلو پر حاوی اور ہر مسلمان کی عالمگیر بین الاقوامی حیثیت کا سب سے بلند منارہ ہے۔

جہاد

﴿ وَجَاهِدُوْا فِي اللّٰهِ حَقَّ جِهَادِهٖ ﴾ (۲۲/ الحج :۷۸)

عام طور سے اسلام کے سلسلہ عبادات میں جہاد کا نام فقہا کی تحریروں میں نہیں آتا مگر قرآن پاک اور احادیث نبوی میں اس کی فرضیت اور اہمیت بہت سے دوسرے فقہی احکام اور عبادات سے بدرجہا زیادہ ہے اس لیے ضرورت ہے کہ اس فریضۂ عبادت کو اپنے موقع پر جگہ دی جائے اور اس کی حقیقت پر ناواقفیت کے جو تو بر تو پردے پڑ گئے ہیں، ان کو اٹھایا جائے۔

جہاد کے معنی عموماً قتال اور لڑائی کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنی محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی، اپنے عزیز و اقارب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا، یہی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے، صرف دین کے دشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ بات بار بار کہی اور دکھائی گئی ہے کہ محمد رسول اللہ ﷺ جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دنیا میں آئے وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتا پا عمل ہے۔ آپ کے مذہب میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ، دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں، بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد انہیں کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے، اسی لیے قرآن پاک میں جہاد کا مقابل لفظ قعود (بیٹھنا یا بیٹھ رہنا) استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترکِ فرض ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:

﴿ لَا يَسْتَوِي الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ غَيْرُ اُولِي الضَّرَرِ وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۭ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰى ۭ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ اَجْرًا عَظِيْمًا ؀ ﴾

(٤/ النسآء :٩٥)

''مسلمانوں میں سے وہ جن کو کوئی جسمانی معذوری نہ ہو اور پھر بیٹھے رہیں اور وہ جو خدا کی راہ میں اپنی جان و مال سے جہاد کر رہے ہوں، برابر نہیں اللہ نے اپنی جان و مال سے جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر درجہ کی فضیلت عطا کی ہے اور ہر ایک سے خدا نے بھلائی کا وعدہ کیا ہے اور جہاد کرنے والوں کو بیٹھنے والوں پر بڑے اجر کی فضیلت بخشی ہے۔''

اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے۔

یہاں ایک شبہ کا ازالہ کرنا ضروری ہے اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں جہاد کرنا) اور قتال فی سبیل اللہ (خدا کی راہ میں لڑنا) ان دونوں لفظوں کے ایک معنی نہیں ہیں، بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے۔ بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قتال اور دشمنوں سے لڑنا بھی ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نساء کے اوپر کی آیت میں اور دوسری آیتوں میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی گئی ہیں: جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعہ جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعہ جہاد کرنا، جان کے ذریعہ جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت کے لیے ہر قسم کی جسمانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے۔ یہاں تک کہ اپنی جان تک کو جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائے جانے، سولی پر لٹکائے جانے، تیر اور نیزے میں چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور مستعد رہے، مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی باطل محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی، جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

ترقی و سعادت کا یہ گر صرف محمد رسول اللہ ﷺ کو بتایا گیا اور آپ ہی نے یہ نکتہ اپنی امت کو سکھایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصول ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق و زنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، نیزہ کی انی، تلوار کی دھار، بال بچوں سے علیحدگی، مال و دولت سے دست برداری اور گھر بار سے دوری کوئی چیز بھی ان کے استقلال کے قدم کو ڈگمگا نہ سکی اور پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دنیا کو معلوم ہے۔

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات: ۱۵)

''مومن وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لائے اور پھر اس میں وہ ڈگمگائے نہیں اور خدا کے راستہ میں اپنی جان سے اور اپنے مال سے جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے لوگ ہیں۔''

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ ۔ الآیہ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱۹۵)

''پھر جنھوں نے اپنا گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور میری راہ میں ستائے گئے اور لڑے اور مارے گئے، میں ان کے گناہوں کو اتار دوں گا اور ان کو بہشت میں داخل کروں گا۔''

جہاد کی قسمیں

① جب جہاد کے معنی محنت، سعی بلیغ اور جد و جہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت میں داخل ہو سکتا ہے۔ علمائے دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کے ہاں جہاد اکبر ہے۔ خطیب نے تاریخ میں حضرت جابر صحابی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے ان صحابہ سے جو ابھی ابھی لڑائی کے میدان سے واپس آئے تھے فرمایا: ''تمہارا آنا مبارک تم چھوٹے جہاد (غزوہ) سے بڑے جہاد کی طرف آئے ہو کہ بڑا جہاد بندہ کا اپنے ہوائے نفس سے لڑنا ہے۔'' حدیث کی دوسری کتابوں میں اس قسم کی اور بعض روایتیں بھی ہیں۔ [1] چنانچہ ابن نجار نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ انسان اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرے''۔ یہی روایت دیلمی میں ان الفاظ میں ہے کہ ''بہترین جہاد یہ ہے کہ تم خدا کے لیے اپنے نفس اور اپنی خواہش سے جہاد کرو۔'' یہ تینوں روایتیں گو فن کے لحاظ سے چنداں مستند نہیں ہیں مگر وہ درحقیقت بعض حدیثوں کی تائید اور قرآن پاک کی اس آیت کی تفسیر ہیں:

﴿ وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ؕ وَاِنَّ اللّٰهَ لَمَعَ الْمُحْسِنِيْنَ۝ ﴾

(۲۹/ العنکبوت: ۶۹)

''اور جنھوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا (یعنی محنت اور تکلیف اٹھائی) ہم ان کو اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بے شبہ خدا نیکو کاروں کے ساتھ ہے۔''

اس پوری سورہ میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لیے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور اگلے پیغمبروں کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم

[1] بحوالہ کنز العمال، کتاب الجہاد، ج ۲، ص: ۲۸۵ حیدر آباد دکن۔

رہے اور بالآخر خدا نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ہلاک کیا۔ سورہ کے آغاز میں ہے:

﴿ وَمَنْ جَاهَدَ فَإِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَغَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴾

(۲۹/ العنکبوت :٦)

''اور جو کوئی جہاد کرتا ہے (یعنی محنت اٹھاتا ہے) وہ اپنے ہی نفس کے لیے جہاد کرتا ہے، اللہ تو جہان والوں سے بے نیاز ہے۔''

اور سورہ کے آخر میں فرمایا کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری خوشنودی کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا ہم اس کے لیے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ آپ دکھائیں گے۔ یہی مجاہدہ، کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے، سورۂ حج میں ارشاد ہوا:

﴿ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ ۚ هُوَ اجْتَبَاكُمْ وَمَا جَعَلَ عَلَيْكُمْ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ ۚ مِلَّةَ أَبِيكُمْ إِبْرَاهِيمَ ۚ ﴾ (۲۲/ الحج :۷۸)

''اور محنت کرو اللہ میں پوری محنت، اس نے تم کو چنا ہے اور تمہارے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں کی تمہارے باپ ابراہیم کا دین۔''

''یہ اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد کرنا'' وہی جہاد اکبر ہے جس پر ملت ابراہیمی کی بنا ہے یعنی حق کی راہ میں عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا۔ ترمذی، طبرانی، حاکم اور صحیح ابن حبان میں ہے، کہ آنحضرت ﷺ نے صحابہ سے فرمایا کہ: ((المجاهد من جاهد نفسه)) یعنی ''مجاہد وہ ہے جو اپنے نفس سے جہاد کرے۔'' [1] صحیح مسلم میں ہے ایک دفعہ آپ ﷺ نے صحابہ سے پوچھا کہ ''تم پہلوان کس کو کہتے ہو؟'' عرض کیا، جس کو لوگ پچھاڑ نہ سکیں۔ فرمایا: ''نہیں پہلوان وہ ہے جو غصہ میں اپنے نفس کو قابو میں رکھے۔'' [2] یعنی جو اس پہلوان کو پچھاڑ سکے اور اس حریف کو زیر کر سکے جس کا اکھاڑہ خود اس کے سینہ میں ہے۔

② جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے، دنیا کا تمام شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے، اس کا دور کرنا ہر حق طلب کے لیے ضروری ہے، ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو فائدہ پہنچائے۔ تلوار کی دلیل سے قلب میں وہ طمانیت نہیں پیدا ہو سکتی جو دلیل و برہان کی قوت سے لوگوں کے سینوں میں پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے ارشاد ہوا کہ:

﴿ ادْعُ إِلَىٰ سَبِيلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ ۖ وَجَادِلْهُم بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ ۚ ﴾

[1] ترمذی، ابواب فضائل الجهاد، باب ما جاء فی فضل من مات مرابطا: ١٦٢١؛ صحیح ابن حبان، کتاب السیر، باب فضل الجهاد: ٤٦٠٥؛ طبرانی کبیر: ١٥١٩٢؛ کنز العمال کتاب الایمان، ج ١، ص: ٣٩۔

[2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل من یملك نفسه عند الغضب: ٦٦٤١۔

(۱۶/ النحل:۱۲۵)

''تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف آنے کا بلاوا حکمت و دانائی کی باتوں کے ذریعہ سے اور اچھی طرح سمجھا کر دے اور مناظرہ کرنا ہو تو وہ بھی اچھے اسلوب سے کر۔''

دین کی یہ تبلیغ و دعوت بھی جو سراسر علمی طریق سے ہے۔ جہاد کی ایک قسم ہے اور اسی طریقہ دعوت کا نام ''جہاد بالقرآن'' ہے کہ قرآن خود اپنی آپ دلیل اپنی آپ موعظت اور اپنے لیے آپ مناظرہ ہے۔ قرآن کے ایک سچے عالم کو قرآن کی صداقت اور سچائی کے لیے قرآن سے باہر کی کسی چیز کی ضرورت نہیں۔ محمد رسول اللہ ﷺ کو روحانی جہاد یعنی روحانی بیماریوں کی فوجوں کو شکست دینے کے لیے اسی قرآن کی تلوار ہاتھ میں دی گئی اور اسی سے کفار و منافقین کے شکوک و شبہات کے پروں کو ہزیمت دینے کا حکم دیا گیا۔ ارشاد ہوا:

﴿ فَلَا تُطِعِ الْكٰفِرِيْنَ وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۵۲)

''تو کافروں کا کہنا مان اور بذریعہ قرآن کے توان سے جہاد کر بڑا جہاد۔''

بذریعہ قرآن کے جہاد کر یعنی قرآن کے ذریعہ سے توان کا مقابلہ کر، اس قرآنی جہاد و مقابلہ کو اللہ تعالیٰ نے جہاد کبیر ''بڑا جہاد'' اور بڑا زور کا مقابلہ فرمایا ہے، اس سے اندازہ ہوگا کہ اس جہاد بالعلم کی اہمیت قرآن پاک کی نظر میں کتنی ہے، علما نے بھی اس اہمیت کو محسوس کیا ہے اور اس کو جہاد کا مہتم بالشان درجہ قرار دیا ہے، امام ابوبکر رازی حنفی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور لکھا ہے کہ جہاد بالعلم کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے بڑھ کر ہے [1] ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لیے عقل، فہم، علم اور بصیرت حاصل کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں، ان کو اس لیے حاصل کرے کہ ان سے حق کی اشاعت اور دین کی مدافعت کا فریضہ انجام پائے گا، یہ علم کا جہاد ہے، جو اہل علم پر فرض ہے۔

جہاد بالمال

انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت عطا کی ہے اس کا منشا بھی یہ ہے کہ اس کو خدا کی مرضی کے راستوں میں خرچ کیا جائے، یہاں تک کہ اس کو اپنے اور اپنے اہل و عیال کے آرام و آسائش کے لیے بھی خرچ کیا جائے تو اسی کی مرضی کے لیے، دنیا کا ہر کام روپیہ کا محتاج ہے، چنانچہ حق کی حمایت اور نصرت کے کام بھی اکثر روپے پر موقوف ہیں، اس لیے اس جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے، دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنی ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد میں سرمایہ کی ضرورت ہے، اس سرمایہ کا فراہم کرنا اور اس کے لیے مسلمانوں کا اپنے اوپر ہر طرح کا ایثار گوارا کرنا جہاد بالمال ہے، آنحضرت ﷺ کی تعلیم و صحبت کی برکت سے صحابہ کرام نے اپنی عام غربت اور ناداری کے باوجود اسلام کی سخت سے سخت گھڑیوں میں جس

[1] احکام القرآن رازی قسطنطنیہ، ج ۳، ص: ۱۱۹۔

طرح مالی جہاد کیا ہے، وہ اسلام کی تاریخ کے روشن کارنامے ہیں اور انہیں سیرابیوں سے دین حق کا باغ چمن آرائے نبوت کے ہاتھوں سرسبز وشاداب ہوا اور اسی لیے اسلام میں ان بزرگوں کا بہت بڑا رتبہ ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ﴾

(۸/ الانفال: ۷۲)

''بے شک وہ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اپنے مال اور جان سے جہاد کیا۔''

قرآن پاک میں مالی جہاد کی تنبیہ وتاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں، بلکہ بہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہو گا، جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قابل لحاظ یہ امر ہے کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو تقدم بخشا گیا ہے، جیسے:

﴿ اِنْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝ ﴾ (۹/ التوبۃ: ۴۱)

''ہلکے یا بھاری ہو کر جس طرح ہو نکلو اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستے میں جہاد کرو، یہ تمہارے لیے بہتر ہے، اگر تم کو معلوم ہو۔''

﴿ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات: ۱۵)

''مومن وہی ہیں، جو اللہ اور رسول پر ایمان لائے، پھر اس میں شک نہیں کیا اور اپنے مال اور اپنی جان سے خدا کے راستہ میں جہاد کیا، یہی سچے اترنے والے ہیں۔''

﴿ فَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِيْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِيْنَ دَرَجَةً ۭ ﴾

(۴/ النسآء: ۹۵)

''اپنے مال اور نفس سے جہاد کرنے والوں کو اللہ نے بیٹھ رہنے والوں پر ایک درجہ کی فضیلت دی ہے۔''

اس تقدم کے کئی اسباب اور مصلحتیں ہیں۔

میدانِ جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں، لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لیے آسان ہے، جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ضرورت ہر وقت پیش نہیں آتی ہے، لیکن مالی جہاد کی ضرورت ہر وقت اور ہر آن ہوتی ہے، انسانی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت، اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے۔

گر جان طلبی مضایقہ نیست گر زر طلبی سخن دریں است

اس لیے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی اس کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے،

④ جہاد کی ان اقسام کے علاوہ ہر نیک کام اور ہر فرض کی ادا میں اپنی جان و مال و دماغ کی قوت صرف کرنے کا نام بھی اسلام میں جہاد ہے، عورتیں حضور انور ﷺ کی خدمت میں آ کر عرض کرتی ہیں کہ یا رسول اللہ ﷺ! ہم کو غزوات کے جہاد میں شرکت کی اجازت دی جائے، ارشاد ہوا کہ "تمہارا جہاد نیک حج ہے۔" [1] کہ اس مقدس سفر کے لیے سفر کی تمام صعوبتوں کو برداشت کرنا، صنف نازک کا ایک جہاد ہی ہے، اسی طرح ایک صحابی یمن سے چل کر خدمت اقدس میں اس غرض سے حاضر ہوتے ہیں کہ کسی لڑائی کے جہاد میں شرکت کریں، آپ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا کہ "کیا تمہارے ماں باپ ہیں؟" عرض کی، جی ہاں، فرمایا: ((ففیھما فجاھد)) "تو تم انہیں کی خدمت میں جہاد کرو۔" [2] یعنی ماں باپ کی خدمت کرنا بھی جہاد ہے، اسی طرح خطرناک سے خطرناک موقع پر حق کے اظہار میں بے باک ہونا بھی جہاد ہے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((ان من اعظم الجهاد كلمة عدلٍ عند سلطانٍ جائرٍ)) [3]

"ایک بڑا جہاد کسی ظالم قوت کے سامنے، انصاف کی بات کہہ دینا ہے۔"

⑤ اس سے ظاہر ہوا کہ جہاد بالنفس، یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے، جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو اور اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو بھی خدا کی راہ میں نثار کر دینا ہے، نیز دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آ پڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی جذبہ کمال ہے، ایسے جان نثار اور جانباز بندے کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو خدا کی راہ میں قربان کیا، وہ ہمیشہ کے لیے اس کو بخش دی جائے، یعنی فانی حیات کے بدلہ اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے، اسی لیے ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ﴾

(۲/ البقرة: ۱۵٤)

"جو خدا کی راہ میں مارے گئے، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ وہ زندہ ہیں، لیکن تم کو اس کا احساس نہیں۔"

آل عمران میں ان جانبازوں کی قدر افزائی ان الفاظ میں کی گئی ہے:

﴿ وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ قُتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتًا ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُونَ ۝ فَرِحِينَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ وَيَسْتَبْشِرُونَ بِالَّذِينَ لَمْ يَلْحَقُوا بِهِمْ مِنْ خَلْفِهِمْ أَلَّا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱٦۹-۱۷۰)

---

[1] صحیح بخاری، کتاب الجهاد، باب جهاد النسآء: ۲۸۷٦۔ [2] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب بر الوالدین: ٦٥۰٤؛ ابوداود، کتاب الجهاد، باب فی الرجل یغزو: ۲٥۲۹۔

[3] جامع ترمذی، ابواب الفتن، باب ما جاء افضل الجهاد کلمة عدل: ۲۱۷٤۔

''جو خدا کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ گمان نہ کرو، بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے پاس ان کو روزی دی جارہی ہے، خدا نے ان کو اپنی جو مہربانی عطا کی ہے، اس پر وہ خوش ہیں اور جو اب تک ان سے اس زندگی میں ہونے کی وجہ سے نہیں ملے ہیں، ان کو خوش خبری دیتے ہیں کہ ان کو نہ کوئی خوف ہے، نہ وہ غم میں ہیں۔''

ان جان نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں ''شہید'' ہے، یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ وجاوید ہیں۔

ہرگز نہ میرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

یہ اپنے اسی خونی گلگون پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے، [1] اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی، اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے، ﴿ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَآءَ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۴۰) اسی کے ساتھ وہ جانباز بھی جو گو اپنا سر ہتھیلی پر رکھ کر میدان میں اترے تھے، لیکن ان کے سر کا ہدیہ دربار الٰہی میں اس وقت اس لیے قبول نہ ہوا کہ ابھی ان کی دنیاوی زندگی کا کارنامہ ختم نہیں ہوا تھا، وہ بھی اپنے حسنِ نیت کی بدولت رضائے الٰہی کی سند پائیں گے، اسی لیے ان کو عام مسلمان ادب و تعظیم کے لیے ''غازی'' کے لقب سے یاد کرتے ہیں:

﴿ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴾

(٤/ النسآء:٧٤)

''اور جو خدا کی راہ میں لڑتا ہے، پھر وہ مارا جاتا ہے یا وہ غالب آتا ہے، تو ہم اس کو بڑا بدلہ عنایت کریں گے۔''

﴿ فَالَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَاُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ وَاُوْذُوْا فِيْ سَبِيْلِيْ وَقٰتَلُوْا وَقُتِلُوْا لَاُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاُدْخِلَنَّهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ثَوَابًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۹۵)

''تو جنہوں نے میری خاطر گھر بار چھوڑا اور اپنے گھروں سے نکالے گئے اور ان کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں، وہ لڑے اور مارے گئے، ہم ان کے گناہوں کو چھپا دیں گے اور ان کو جنت میں داخل کریں گے، جس کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، خدا کی طرف سے ان کو یہ بدلہ ملے گا اور خدا کے پاس اچھا بدلہ ہے۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل اللّٰہ:٤٨٦٢ میں یہ الفاظ ہیں: ((لا یکلم احد فی سبیل اللّٰہ، واللّٰہ اعلم بمن یکلم فی سبیلہ الاجاء یوم القیامۃ وجرحہ یثعب اللون لون دم والریح ریح مسك)) اور سنن ابوداود، کتاب الجنائز، باب ما یستحب من تطهیر ثیاب المیت:٣١١٤ میں یہ الفاظ ہیں ((المیت یبعث فی ثیابہ التی یموت فیها))۔

ان آیات کی تفسیر وتشریح میں آنحضرت ﷺ نے جو کچھ فرمایا ہے، وہ احادیث میں مذکور ہے، جس میں شہیدوں کی فضیلتیں اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت مؤثر الفاظ میں ہے، اسی شہادت اور غزا کے عقیدے نے مسلمانوں میں مشکلات کے مقابلہ اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی جس کی زندگی اور تازگی کا ساڑھے تیرہ سو برس کے بعد بھی وہی عالم ہے، یہی وہ جذبہ ہے جو مسلمانوں کو دین کی خاطر جان دینے پر اس قدر جلد آمادہ کر دیتا ہے اور اس حیات جاوید کی تلاش میں ہر مسلمان بے تاب نظر آتا ہے، یہ وہ رتبہ ہے جس کی تمنا خود آنحضرت ﷺ نے ظاہر کی اور فرمایا کہ ''مجھے آرزو ہے کہ میں خدا کی راہ میں مارا جاؤں اور دوبارہ مجھے زندگی ملے اور میں اس کو بھی قربان کر دوں اور پھر تیسری زندگی ملے اور اس کو بھی میں خدا کی راہ میں نثار کر دوں'' [1]، ذرا ان فقروں پر ایک بار اور نگاہ ڈال لیجیے، ان میں یہ نہیں ہے کہ میں دوسرے کو مار ڈالوں، بلکہ یہ ہے حق کی راہ میں، میں مارا جاؤں اور پھر زندگی ملے، پھر مارا جاؤں، پھر زندگی ملے اور پھر مارا جاؤں۔

کشتگان خنجر تسلیم را ہر زمان از غیب جان دیگر است

دائمی جہاد

یہ تو وہ جہاد ہے جس کا موقع ہر مسلمان کو پیش نہیں آتا اور جس کو آتا بھی ہے تو عمر میں ایک آدھ ہی دفعہ آتا ہے، مگر حق کی راہ میں دائمی جہاد وہ جہاد ہے جو ہر مسلمان کو ہر وقت پیش آسکتا ہے، اس لیے محمد رسول اللہ ﷺ کے ہر امتی پر یہ فرض ہے کہ دین کی حمایت، علم دین کی اشاعت، حق کی نصرت، غریبوں کی مدد، زیر دستوں کی امداد، سیہ کاروں کی ہدایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامتِ عدل، رد ظلم اور احکام الٰہی کی تعمیل میں ہمہ تن اور ہر وقت لگا رہے، یہاں تک کہ اس کی زندگی کی ہر جنبش و سکون، ایک جہاد بن جائے اور اس کی پوری زندگی جہاد کا ایک غیر منقطع سلسلہ نظر آئے، سورۂ آل عمران کی جس میں جہاد کے مسلسل احکام ہیں آخری آیت ہے:

﴿ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱصْبِرُوا۟ وَصَابِرُوا۟ وَرَابِطُوا۟ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴾

(۳/ آل عمران: ۲۰۰)

''اے ایمان والو! مشکلات میں ثابت قدم رہو اور مقابلہ میں مضبوطی دکھاؤ اور کام میں لگے رہو اور خدا سے ڈرو، شاید کہ تم مراد کو پہنچو۔''

یہی وہ جہادِ محمدی ﷺ ہے جو مسلمانوں کی کامیابی کی کنجی اور فتح و فیروزی کا نشان ہے۔

---

[1] صحیح مسلم، کتاب الجهاد، باب فضل الجهاد والخروج فی سبیل الله: ٤٨٥٩۔

عبادات قلبی

یہ اسلام کی ان عبادات کا بیان تھا، جو جسمانی و مالی کہلاتی ہیں، گو کہ دل کے اخلاص کا شمول ان میں بھی ہے، لیکن اسلام میں بعض ایسی عبادات بھی ہیں، جن کا تعلق تمام تر قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے، پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ اسلام میں ہر نیکی کا کام عبادت ہے، اس لیے تمام امور خیر، خواہ وہ جسمانی، یا مالی، یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں، فقہا نے صرف جسمانی و مالی عبادات سے بحث کی ہے، لیکن حضرات صوفیا نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے، اصل یہ ہے کہ فقہا نے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیا نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے، جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے، پیش نظر تصنیف نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی، اس کا مقصود ان فرائض کو بتانا ہے، جن کی تاکید و توصیف قرآن پاک نے بار بار کی ہے اور اسی تاکید و توصیف سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے، تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں، یہ وہ فرائض ہیں، جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور اسی لیے ان کا نام ''قلبی عبادات'' رکھا جا سکتا ہے، یہ وہ فرائض یا قلبی عبادات ہیں جو اسلام کی روح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں، جن کے الگ کر دینے سے وہ عبادات پنجگانہ بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے، جسد بے روح بن جاتے ہیں، یہ بات گو یہاں بے محل ہے، مگر کہنے کے قابل ہے، کہ فقہ اور تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے روح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔ ہر اچھے کام کے کرنے اور برائی سے بچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ضمیر کا احساس بیدار اور دل میں خیر و شر کی تمیز کے لیے خلش ہو، یہ تقویٰ ہے اور پھر کام کو خدائے واحد کی رضا مندی کے سوا ہر غرض و غایت سے پاک رکھا جائے، یہ اخلاص ہے، پھر اس کام کے کرنے میں صرف خدا کی نصرت پر بھروسہ رہے، یہ توکل ہے، اس کام میں رکاوٹیں اور دقتیں پیش آئیں، یا نتیجہ مناسب حال برآمد نہ ہو تو دل کو مضبوط رکھا جائے اور خدا سے آس نہ توڑی جائے اور اس راہ میں اپنے برا چاہنے والوں کا بھی برا نہ چاہا جائے، یہ صبر ہے اور اگر کامیابی کی نعمت ملے، تو اس پر مغرور ہونے کے بجائے اس کو خدا کا فضل و کرم سمجھا جائے اور جسم و جان و زبان سے اس کا اقرار کیا جائے اور اس قسم کے کاموں کے کرنے میں اور زیادہ انہماک صرف کیا جائے یہ شکر ہے۔

ذیل کی سطروں میں اسی اجمال کی تفصیل آتی ہے۔

تقویٰ

تقویٰ سارے اسلامی احکام کی غایت ہے

اگر محمد رسول اللہ ﷺ کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں، اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے، قرآن پاک نے اپنی دوسری ہی سورہ میں یہ اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں، جو تقویٰ والے ہیں:

﴿ هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲)

''یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔''

اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوا رَبَّكُمُ الَّذِي خَلَقَكُمْ وَالَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ:۲۱)

''اے لوگو! اپنے اس پروردگار کی جس نے تم کو اور تمہارے پہلوں کو پیدا کیا، عبادت کرو، تاکہ تم تقویٰ پاؤ۔''

روزہ سے بھی یہی مقصد ہے:

﴿ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ : ۱۸۳)

''تم پر روزہ اسی طرح فرض کیا گیا، جس طرح تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا، تاکہ تم تقویٰ حاصل کرو۔''

حج کا منشا بھی یہی ہے:

﴿ وَمَن يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِن تَقْوَى الْقُلُوبِ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۲)

''اور جو اللہ کے شعائر (حج کے ارکان و مقامات) کی عزت کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

قربانی بھی اسی غرض سے ہے:

﴿ لَن يَنَالَ اللَّهَ لُحُومُهَا وَلَا دِمَاؤُهَا وَلَٰكِن يَنَالُهُ التَّقْوَىٰ مِنكُمْ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۷)

''خدا کے پاس قربانی کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا، لیکن تمہارا تقویٰ اس کو پہنچتا ہے۔''

ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ خدا کے لیے جھکتی ہے، اس کی بنیاد بھی تقویٰ پر ہونی چاہیے۔

﴿ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى مِنَ اللّٰهِ ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۹)

’’جس نے اس کی عمارت خدا سے تقویٰ پر کھڑی کی۔‘‘

﴿ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى ﴾ (۹/ التوبۃ:۱۰۸)

’’البتہ وہ مسجد جس کی بنیاد تقویٰ پر قائم کی گئی۔‘‘

حج کے سفر اور زندگی کے مرحلہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے:

﴿ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۹۷)

’’اور سفر میں زدِراہ لے کر چلو اور سب سے اچھا زادِراہ تقویٰ ہے۔‘‘

ہمارے زیب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے بڑھ کر تقویٰ کا لباس ہے:

﴿ وَلِبَاسُ التَّقْوٰى ذٰلِكَ خَيْرٌ ﴾ (۷/ الاعراف:۲۶)

’’اور تقویٰ کا لباس، وہ سب سے اچھا ہے۔‘‘

اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے:

﴿ وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۳۷)

’’اور معاف کر دینا تقویٰ سے قریب تر ہے۔‘‘

﴿ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (۵/ المائدۃ:۸)

’’انصاف کرنا تقویٰ سے قریب تر ہے۔‘‘

﴿ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۸۶)

’’اور اگر صبر کرو اور تقویٰ کرو تو یہ بڑی ہمت کی بات ہے۔‘‘

﴿ وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۲۲۴)

’’اور تقویٰ کرو اور لوگوں کے درمیان صلح کراؤ۔‘‘

﴿ وَاِنْ تُحْسِنُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ﴾ (۴/ النسآء:۱۲۸)

’’اور اگر اچھے کام کرو اور تقویٰ کرو، تو اللہ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔‘‘

اہل تقویٰ تمام اخروی نعمتوں کے مستحق ہیں

آخرت کی ہر قسم کی نعمتیں انہیں تقویٰ والوں کا حصہ ہے:

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ مَقَامٍ اَمِيْنٍ ﴾ (۴۴/ الدخان:۵۱)

’’بے شبہ تقویٰ والے امن و امان کی جگہ میں ہوں گے۔‘‘

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَعِيْمٍ ﴾ (۵۲/ الطور:۱۷)

''بے شک تقویٰ والے باغوں میں اور نعمت میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ (۵۱/ الذاریات:۱۵)

''شک نہیں کہ تقویٰ والے باغوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ جَنّٰتٍ وَّنَهَرٍ ﴾ (۵۴/ القمر:۵۴)

''بلاشبہ تقویٰ والے باغوں میں اور نہروں میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ الْمُتَّقِيْنَ فِيْ ظِلٰلٍ وَّعُيُوْنٍ ﴾ (۷۷/ المرسلات:۴۱)

''بلاشک تقویٰ والے سایوں میں اور چشموں میں ہوں گے۔''

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴾ (۶۸/ القلم:۳۴)

''یقیناً تقویٰ والوں کے لیے ان کے پروردگار کے پاس نعمت کے باغ ہیں۔''

﴿ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا ﴾ (۷۸/ النبا:۳۱)

''بے شبہ تقویٰ والوں کے لیے کامیابی ہے۔''

﴿ وَاِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ لَحُسْنَ مَاٰبٍ ﴾ (۳۸/ ص:۴۹)

''لاریب تقویٰ والوں کے لیے بازگشت کی اچھائی ہے۔''

کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے

گو بظاہر ابتدا میں اہل تقویٰ کو کسی قدر مصیبتیں اور بلائیں پیش آئیں، یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے، ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی، لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے، حالانکہ جو جتنا دور بین ہے، اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نگاہ رکھتا ہے، حقیقی دور بین اور عاقبت اندیشہ وہ ہیں، جو کام کی اچھائی برائی کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں، بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدہ کی بنا پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے، تو دنیا بھی ان کی بن جاتی ہے اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح انہیں کی قسمت میں ہوتی ہے، فرمایا:

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۷/ الاعراف:۱۲۸)

''اور آخری انجام تقویٰ والوں کے لیے ہے۔''

﴿ اِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۱۱/ هود:۴۹)

”بے شبہ انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔“

﴿ وَالْاٰخِرَةُ عِنْدَ رَبِّكَ لِلْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۴۳/ الزخرف:۳۵)

”اور آخرت تیرے پروردگار کے نزدیک تقویٰ والوں کے لیے ہے۔“

﴿ وَالْعَاقِبَةُ لِلتَّقْوٰى ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۱۳۲)

”اور انجام کار تقویٰ والوں کے لیے ہے۔“

اہل تقویٰ اللہ کے محبوب ہیں

یہی متقی اللہ تعالیٰ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں، جب وہ ہر کام میں خدا کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف، یا انعام یا ہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے، تو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں بھی ان کے ساتھ عقیدت، محبت اور ہر دلعزیزی پیدا ہوتی ہے:

﴿ اِنْ اَوْلِيَآؤُهٗٓ اِلَّا الْمُتَّقُوْنَ ﴾ (۸/ الانفال:۳۴)

”تقویٰ والے ہی خدا کے دوست ہیں۔“

﴿ فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۳/ اٰل عمران:۷۶)

”تو اللہ بے شک تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۹/ التوبة:۷)

”اللہ بلاشبہ تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔“

﴿ وَاللّٰهُ وَلِيُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۴۵/ الجاثية:۱۹)

”اور اللہ تقویٰ والوں کا دوست ہے۔“

معیتِ الٰہی سے سرفراز ہیں

یہ لوگ اللہ تعالیٰ کی معیت کے شرف سے ممتاز اور اس کی نصرت و مدد سے سرفراز ہوتے ہیں اور جس کے ساتھ اللہ ہو اس کو کون شکست دے سکتا ہے:

﴿ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ﴾ (۲/ البقرة:۱۹۴)

”اور جان لو کہ بے شبہ اللہ تقویٰ والوں کے ساتھ ہے۔“

قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے

ایک کام ہزاروں اغراض اور سینکڑوں مقاصد کو سامنے رکھ کر کیا جا سکتا ہے، مگر ان میں اللہ تعالیٰ صرف انہیں کے کاموں کی پیشکش کو قبول فرماتا ہے، جو تقویٰ کے ساتھ اپنا کام انجام دیتے ہیں، فرمایا:

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۲۷)

''اللہ تو تقویٰ والوں ہی سے قبول فرماتا ہے۔''

اسی لیے انہیں کے کاموں کو دنیا میں بھی بقا، قیام اور ہر دلعزیزی نصیب ہوتی ہے اور آخرت میں بھی۔

تقویٰ والے کون ہیں

یہ جان لینے کے بعد کہ تقویٰ ہی اسلام کی تعلیم کی اصلی غایت اور وہی ساری اسلامی تعلیمات کی روح ہے اور دین و دنیا کی تمام نعمتیں اہل تقویٰ ہی کے لیے ہیں، یہ جاننا ہے کہ تقویٰ والے کون ہیں، قرآن پاک نے اس سوال کا بھی جواب دے دیا ہے، چنانچہ اس کا مختصر جواب تو وہ ہے جو سورۂ زمر میں ہے:

﴿ وَالَّذِيْ جَآءَ بِالصِّدْقِ وَصَدَّقَ بِهٖٓ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ لَهُمْ مَّا يَشَآءُوْنَ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۭ ذٰلِكَ جَزٰٓؤُا الْمُحْسِنِيْنَ۝ۚ ﴾ (۳۹/ الزمر:۳۴)

''اور جو سچائی لے کر آیا اور اس کو سچ مانا، وہی لوگ ہیں تقویٰ والے، ان کے لیے ان کے رب کے پاس وہ ہے، جو وہ چاہیں، یہ ہے بدلہ نیکی والوں کا۔''

یعنی تقویٰ والا وہ ہے جو اپنی زندگی کے ہر شعبہ اور کام کے ہر پہلو میں سچائی لے کر آئے اور اس ابدی سچائی کو سچ مانے، وہ کسی کام میں ظاہری فائدہ، فوری ثمرہ، مال و دولت اور جاہ و عزت کے نقطہ پر نہیں، بلکہ سچائی کے پہلو پر نظر رکھتا ہے اور خواہ کسی قدر بظاہر اس کا نقصان ہو مگر وہ سچائی اور راست بازی کے جادہ سے بال بھر ہٹنا نہیں چاہتا، لیکن اہل تقویٰ کا پورا حلیہ سورۃ البقرہ میں ہے:

﴿ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰي حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ ۚ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ۝ ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۷)

''لیکن نیکی یہ ہے کہ جو خدا پر اور پچھلے دن پر اور فرشتوں پر اور کتاب پر اور پیغمبروں پر، ایمان لایا اور اپنا مال اس کی محبت پر رشتہ داروں، یتیموں، مسکینوں، مسافر اور مانگنے والوں اور گردنوں کے آزاد کرانے میں دیا اور نماز کو برپا کیا اور زکوۃ ادا کی اور جو وعدہ کر کے اپنے وعدہ کو ایفا کرنے والے ہیں اور سختی، تکلیف اور لڑائی میں صبر کرنے والے ہیں، یہی وہ ہیں، جو سچے ٹھہرے اور یہی تقویٰ والے ہیں۔''

ان آیتوں میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ، بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا گیا اور بتا دیا گیا ہے کہ یہی خدا کی نگاہ میں سچے ٹھہرنے والے اور تقویٰ والے ہیں۔

تقویٰ کی حقیقت کیا ہے

تقویٰ اصل میں وقوی ہے، عربی زبان میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں، لیکن وحی محمدی ﷺ کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے، جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے، دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ وہ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے، جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے، یہ بات کہ تقویٰ اصل میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے، قرآن پاک کی اس آیت سے ظاہر ہے جو ارکانِ حج کے بیان کے موقع پر ہے:

﴿ وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۲)

''اور جو شعائرِ الٰہی کی تعظیم کرتا ہے، تو وہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔''

اس آیت سے واضح ہوتا ہے کہ تقویٰ کا اصلی تعلق دل سے ہے اور وہ سلبی کیفیت (بچنا) کے بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے، وہ امورِ خیر کی طرف دلوں میں تحریک پیدا اور شعائرِ الٰہی کی تعظیم سے ان کو معمور کرتا ہے، ایک اور آیت کریمہ میں ارشاد ہے:

﴿ اِنَّ الَّذِيْنَ يَغُضُّوْنَ اَصْوَاتَهُمْ عِنْدَ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ امْتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ لِلتَّقْوٰى ۭ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ عَظِيْمٌ۝ ﴾ (۴۹/ الحجرات:۳)

''بے شک جو لوگ رسول اللہ کے سامنے دبی آواز سے بولتے ہیں، وہی ہیں، جن کے دلوں کو اللہ نے تقویٰ کے واسطے جانچا ہے، ان کو معافی ہے اور بڑا بدلہ۔''

اس آیت میں بھی تقویٰ کا مرکز دل ہی کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ رسول کی تعظیم کا احساس تقویٰ سے پیدا ہوتا ہے، ایک اور تیسری آیت میں تقویٰ کے فطری الہام ہونے کی طرف اشارہ ہے:

﴿ فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا۝ ﴾ (۹۱/ الشمس:۹)

''تو ہر نفس میں اس کا فجور اور اس کا تقویٰ الہام کر دیا۔''

فجور تو ظاہر ہے کہ گناہگاری اور نافرمانی کی جڑ ہے، ٹھیک اسی طرح تقویٰ تمام نیکیوں کی بنیاد اور اصل الاصول ہے اور دونوں بندہ کو فطرتاً ودیعت ہیں، اب بندہ اپنے عمل اور کوشش سے ایک کو چھوڑتا اور دوسرے کو اختیار کرتا ہے، مگر بہرحال یہ دونوں الہام ربانی ہیں اور سب کو معلوم ہے کہ الہام کا ربانی مرکز دل ہے، اس لیے یہی تقویٰ کا مقام ہے۔

تقویٰ کا لفظ جس طرح اس دلی کیفیت پر بولا جاتا ہے، اس کیفیت کے اثر اور نتیجہ پر بھی اطلاع پاتا

ہے، صحابہ رضی اللہ عنہم نے کفار کے اشتعال دلانے اور ان سے بدلہ لینے پر پوری قوت رکھنے کے باوجود حدیبیہ کی صلح کو تسلیم کر لیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس مستحسن روش کو تقویٰ فرمایا:

﴿ إِذْ جَعَلَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَى رَسُولِهِ وَعَلَى الْمُؤْمِنِينَ وَأَلْزَمَهُمْ كَلِمَةَ التَّقْوَى وَكَانُوا أَحَقَّ بِهَا وَأَهْلَهَا ﴾

(٤٨/ الفتح :٢٦)

''اور جب کفار نے اپنے دلوں میں پچ رکھی، نادانی کی پچ، تو اللہ نے اپنا چین اپنے رسول پر اور مسلمانوں پر اتارا اور ان کو تقویٰ کی بات پر لگا رکھا اور وہی تھے اس کے لائق اور اس کے اہل۔''

یہاں جنگ وخونریزی سے احتراز، خانہ کعبہ کے ادب اور کفار قریش کی جاہلانہ عصبیت سے چشم پوشی کو تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے، ایک اور دوسری آیت میں دشمنوں کے ساتھ ایفائے عہد اور حتی الامکان جنگ سے پرہیز کرنے والوں کو متقی یعنی تقویٰ والے فرمایا ہے اور ان کے ساتھ اپنی محبت ظاہر فرمائی ہے:

﴿ فَأَتِمُّوا إِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ إِلَى مُدَّتِهِمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴾ (٩/ التوبة:٤)

''تو تم ان کے عہد کو ان کی مقررہ مدت تک پورا کرو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔''

﴿ فَمَا اسْتَقَامُوا لَكُمْ فَاسْتَقِيمُوا لَهُمْ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴾ (٩/ التوبة:٧)

''تو وہ جب تک تم سے سیدھے رہیں، تم بھی ان کے ساتھ سیدھے رہو، خدا تقویٰ والوں کو پیار کرتا ہے۔''

جس طرح انسان کا فجور، بری تعلیم، بری صحبت اور برے کاموں کی مشق اور کثرت سے بڑھتا جاتا ہے، اس طرح اچھے کاموں کے شوق اور عمل سے نیکی کا ذوق بھی پرورش پاتا ہے اور اس کی قلبی کیفیت میں ترقی ہوتی ہے:

﴿ وَالَّذِينَ اهْتَدَوْا زَادَهُمْ هُدًى وَآتَاهُمْ تَقْوَاهُمْ ﴾ (٤٧/ محمد :١٧)

''جو لوگ راہ پر آئے، خدا نے ان کی سوجھ اور بڑھائی اور ان کو ان کا تقویٰ عنایت کیا۔''

اس سے عیاں ہے کہ ''تقویٰ'' ایک ایجابی اور ثبوتی کیفیت ہے، جو انسان کو خدا عنایت فرماتا ہے اور جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ اس کو ہدایت پر ہدایت اور فطری تقویٰ پر، مزید دولتِ تقویٰ مرحمت ہوتی ہے۔

تقویٰ کی یہ حقیقت کہ وہ دل کی خاص کیفیت کا نام ہے، ایک صحیح حدیث سے تصریحاً معلوم ہوتی ہے، صحابہ کے مجمع میں ارشاد فرمایا:

((التقوىٰ ههنا)) [1]

---

[1] صحيح مسلم، كتاب البر والصلة، باب تحريم ظلم المسلم و خذله......: ٦٥٤١۔

"تقویٰ یہاں ہے۔"

اور یہ کہہ کر دل کی طرف اشارہ فرمایا، جس سے بے شک وشبہ یہ واضح ہو جاتا ہے کہ تقویٰ دل کی پاکیزہ ترین اور اعلیٰ ترین کیفیت کا نام ہے، جو تمام نیکیوں کی محرک ہے اور وہی مذہب کی جان اور دینداری کی روح ہے، یہی سبب ہے کہ وہ قرآن پاک کی راہنمائی کی غایت، ساری ربانی عبادتوں کا مقصد اور تمام اخلاقی تعلیموں کا ماحصل قرار پایا۔

اسلام میں برتری کا معیار

اسلام میں تقویٰ کو جو اہمیت حاصل ہے، اس کا اثر یہ ہے کہ تعلیم محمدی ﷺ نے نسل، رنگ، وطن، خاندان، دولت، حسب نسب، غرض نوع انسانی کے ان صدہا خودساختہ اعزازی مرتبوں کو مٹا کر صرف ایک ہی امتیازی معیار قائم کر دیا، جس کا نام تقویٰ ہے اور جو ساری نیکیوں کی جان ہے اور اس لیے وہی معیاری امتیاز بننے کے لائق ہے، چنانچہ قرآن پاک نے بہ آواز بلند یہ اعلان کیا:

﴿ وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ۚ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ۭ ﴾

(٤٩/ الحجرات: ١٣)

"ہم نے تم کو مختلف خاندان اور قبیلے صرف اس لیے بنایا کہ باہم شناخت ہو سکے، تم میں سے خدا کے نزدیک سب سے معزز وہ ہے، جو تم میں سب سے زیادہ تقویٰ والا ہے۔"

اس اعلان کو آنحضرت ﷺ نے ان دو مختصر لفظوں میں ادا فرمایا، الکرم ، التقویٰ [1] یعنی بزرگی و شرافت تقویٰ کا نام ہے اور اسی کے لیے حجۃ الوداع کے اعلان عام میں پکار کر فرمایا کہ "عرب کو عجم پر اور کالے کو گورے پر کوئی برتری نہیں، برتر وہ ہے، جس میں سب سے زیادہ تقویٰ ہے۔" [2]

---

[1] ترمذی، کتاب التفسیر، باب ومن سورۃ الحجرات: ٣٢٧١؛ مسند احمد، ج ٥، ص: ١٠؛ مستدرك حاکم، کتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣٢٥۔ [2] مسند أحمد، ج ٥، ص: ٤١١۔

اخلاص

﴿ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَۙ‏ ﴾ (۳۹/ الزمر:۲)

مذہب کا سب سے بڑا امتیاز یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے، اس کا سارا کاروبار صرف اسی ایک مضغہ گوشت سے وابستہ ہے، عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں یا معاملات، انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے، اسی حقیقت کو آنحضرت ﷺ نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے:

((الا و انّ فی الجسد مضغة اذا صلحت صلح الجسد کله و اذا فسدت فسد الجسد کله الا و هی القلب)) [1]

''ہشیار رہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے، جب وہ درست ہو تو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے، ہشیار رہو کہ وہ دل ہے۔''

دل ہی کی تحریک انسان کے ہر اچھے اور برے فعل کی بنیاد اور اساس ہے، اس لیے مذہب کی ہر عمارت اسی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے، اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ جو نیک کام بھی کیا جائے، اس کی محرک کوئی دنیاوی غرض نہ ہو اور نہ اس سے مقصود ریا و نمائش، جلبِ منفعت، طلبِ شہرت یا طلب معاوضہ وغیرہ ہو، بلکہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کی بجا آوری اور خوشنودی ہو، اسی کا نام اخلاص ہے، رسول کو حکم ہوتا ہے:

﴿ فَاعۡبُدِ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَؕ‏ اَلَا لِلّٰهِ الدِّيۡنُ الۡخَالِصُ ؕ ﴾ (۳۹/ الزمر:۲-۳)

''تو اللہ کی عبادت کر خالص کرتے ہوئے اطاعت گزاری کو اسی کے لیے، ہشیار ہو کہ اللہ ہی کے لیے ہے، خالص اطاعت گزاری۔''

مقصود یہ ہے کہ خدا کی اطاعت گزاری میں خدا کے سوا کسی اور چیز کو اس کا شریک نہ بنایا جائے، وہ چیز خواہ پتھر، یا مٹی کی مورت، یا آسمان و زمین کی کوئی مخلوق، یا دل کا تراشا ہوا کوئی باطل مقصود ہو، اسی لیے قرآن پاک نے انسانی اعمال کی نفسانی غرض و غایت کو بھی بت پرستی قرار دیا ہے، فرمایا:

﴿ اَرَءَيۡتَ مَنِ اتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰٮهُ ؕ ﴾ (۲۵/ الفرقان:۴۳)

''کیا تو نے اس کو دیکھا جس نے اپنی نفسانی خواہش کو اپنا خدا بنالیا ہے۔''

چنانچہ اسلام کی یہ اہم ترین تعلیم ہے کہ انسان کا کام ہر قسم کی ظاہری و باطنی بت پرستی سے پاک ہو، رسول کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے:

﴿ قُلۡ اِنِّىۡۤ اُمِرۡتُ اَنۡ اَعۡبُدَ اللّٰهَ مُخۡلِصًا لَّهُ الدِّيۡنَۙ‏ وَاُمِرۡتُ لِاَنۡ اَكُوۡنَ اَوَّلَ الۡمُسۡلِمِيۡنَ‏ ﴾

[1] صحیح بخاری، کتاب الایمان، باب من فضل استبرأ لدینه: ۵۲؛ صحیح مسلم، کتاب المساقاة، باب اخذ الحلال و ترك الشبهات: ۴۰۹۴۔

﴿ قُلْ إِنِّيٓ أَخَافُ إِنْ عَصَيْتُ رَبِّي عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيمٍ ۝ قُلِ اللَّهَ أَعْبُدُ مُخْلِصًا لَّهُ دِينِي ۝ فَاعْبُدُوا مَا شِئْتُم مِّن دُونِهِ ﴾ (۳۹/ الزمر:۱۱۔۱۵)

''کہہ دے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اطاعت گزاری کو اللہ کے لیے خالص کر کے اس کی عبادت کروں اور مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں پہلا فرمانبردار بنوں، کہہ دے کہ میں ڈرتا ہوں اگر اپنے پروردگار کی نافرمانی کروں، بڑے دن کے عذاب سے، کہہ دے کہ اللہ ہی کی عبادت کرتا ہوں، اپنی اطاعت گزاری کو اس کے لیے خالص کر کے تو تم (اے کفار) خدا کو چھوڑ کر جس کی عبادت چاہے کرو۔''

قرآن پاک کے سات موقعوں پر یہ آیت ہے:

﴿ مُخْلِصًا لَّهُ الدِّينَ ۝ ﴾

''اطاعت گزاری کو خدا کے لیے خالص کر کے۔''

اس سے معلوم ہوا کہ ہر عبادت اور عمل کا پہلا رکن یہ ہے کہ وہ خالص خدا کے لیے ہو، یعنی اس میں کسی ظاہری و باطنی بت پرستی اور خواہش نفسانی کو دخل نہ ہو اور ﴿ إِلَّا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ ۝ ﴾ (۹۲/ اللیل:۲۰) یعنی خدائے برتر کی ذات کی خوشنودی کے سوا کوئی اور غرض نہ ہو۔

انبیا علیہم السلام نے اپنی دعوت اور تبلیغ کے سلسلہ میں ہمیشہ یہ اعلان کیا ہے ہم جو کچھ کر رہے ہیں، اس سے ہم کو کوئی دنیاوی غرض اور ذاتی معاوضہ مطلوب نہیں:

﴿ وَمَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَىٰ رَبِّ الْعَٰلَمِينَ ۝ ﴾

(۲٦/ الشعرآء:۱۰۹، ۱٤۵، ۱٦٤، ۱۸۰)

''اور میں اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں چاہتا، میری مزدوری تو اسی پر ہے، جو ساری دنیا کا پروردگار ہے۔''

حضرت نوح علیہ السلام کی زبان سے بھی یہی فرمایا گیا:

﴿ وَيَٰقَوْمِ لَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ﴾ (۱۱/ ھود:۲۹)

''اے میری قوم! میں تم سے اس پر دولت کا خواہاں نہیں، میری مزدوری تو خدا ہی پر ہے۔''

خود ہمارے رسول ﷺ کو یہ کہہ دینے کا فرمان ہوا، میں تم سے اپنے لیے کوئی مزدوری و اجرت نہیں چاہتا، اگر چاہتا بھی ہوں تو تمہارے ہی لیے:

﴿ قُلْ مَا سَأَلْتُكُم مِّنْ أَجْرٍ فَهُوَ لَكُمْ ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى اللَّهِ ۖ وَهُوَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ۝ ﴾

(۳٤/ سبا:٤۷)

"کہہ دے کہ میں نے تم سے جو اجرت چاہی تو وہ تمہارے ہی لیے، میری اجرت تو اللہ پر ہے، وہ ہر بات پر گواہ ہے۔"

یعنی وہ ہر بات کا عالم اور نیتوں سے واقف ہے، وہ جانتا ہے کہ میری ہر کوشش بے غرض اور صرف خدا کے لیے ہے، دوسری جگہ فرمایا:

﴿ لَّآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا إِلَّا ٱلْمَوَدَّةَ فِى ٱلْقُرْبَىٰ ﴾ (۴۲/ الشوریٰ:۲۳)

"میں اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں چاہتا، مگر قرابت داروں میں محبت رکھنا۔"

یعنی رسول نے اپنی بے غرض کوششوں سے امت کو جو دینی و دنیاوی فائدے پہنچائے، اس کے لیے وہ تم سے کسی ذاتی منفعت کا خواہاں نہیں، اگر وہ اس کے معاوضہ میں کچھ چاہتا ہے تو یہ ہے کہ قرابت داروں کا حق ادا کرو اور آپس میں محبت رکھو، اسی قسم کی بات ایک اور آیت میں ظاہر کی گئی ہے:

﴿ قُلْ مَآ أَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ أَجْرٍ إِلَّا مَن شَآءَ أَن يَتَّخِذَ إِلَىٰ رَبِّهِۦ سَبِيلًا ۝ ﴾

(۲۵/ الفرقان:۵۷)

"کہہ دے کہ میں تمہاری اس راہنمائی پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، مگر یہی کہ جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف راستہ پکڑے۔"

یعنی میری اس محنت کی مزدوری یہی ہے کہ تم میں سے کچھ لوگ حق کو قبول کر لیں۔

دنیا میں بھی اخلاص ہی کامیابی کی اصل بنیاد ہے، کوئی بظاہر نیکی کا کتنا ہی بڑا کام کرے، لیکن اگر اس کی نسبت یہ معلوم ہو جائے کہ اس کا مقصد اس کام سے کوئی ذاتی غرض، یا محض دکھاوا اور نمائش تھا، تو اس کام کی قدر و قیمت فوراً نگاہوں سے گر جائے گی، اسی طرح روحانی عالم میں بھی خدا کی نگاہ میں اس چیز کی کوئی قدر نہیں جو اس کی بارگاہ بے نیاز کے علاوہ کسی اور کے لیے پیش کی گئی ہو، مقصود اس سے یہ ہے کہ نیکی کا ہر کام دنیاوی لحاظ سے بے غرض و بے منت اور بلا خیال مزد و اجرت اور تحسین و شہرت کی طلب سے بالاتر ہو، یہ تحسین و شہرت کا معاوضہ بھی دین تو الگ رہا دنیا بھی انہیں کو عطا کرتی ہے، جن کی نسبت اس کو یقین ہوتا ہے کہ انہوں نے اپنا کام انہیں شرائط کے ساتھ انجام دیا ہے۔

ہم جو کام بھی کرتے ہیں، اس کی دو شکلیں پیدا ہوتی ہیں، ایک مادی جو ہمارے ظاہری جسمانی اعضا کی حرکت و جنبش سے پیدا ہوتی ہے، دوسری روحانی، جس کا ہیولیٰ ہمارے دل کے ارادہ و نیت اور کام کی اندرونی غرض و غایت سے تیار ہوتا ہے، کام کی بقا اور برکت دین اور دنیا دونوں میں اسی روحانی پیکر کے حسن و قبح اور ضعف و قوت کی بنا پر ہوتی ہے، انسانی اعمال کی پوری تاریخ اس دعویٰ کے ثبوت میں ہے، اسی لیے اس اخلاص کے بغیر اسلام میں نہ تو عبادت قبول ہوتی ہے اور نہ اخلاق و معاملات عبادت کا درجہ پاتے ہیں، اس لیے

ضرورت ہے کہ ہر کام کے شروع کرتے وقت ہم اپنی نیت کو ہر غیر مخلصانہ غرض و غایت سے بالا اور ہر دنیاوی مزد و اجرت سے پاک رکھیں، تورات اور قرآن دونوں میں ہابیل اور قابیل آدم کے دو بیٹوں کا قصہ ہے، دونوں نے خدا کے حضور میں اپنی اپنی پیداوار کی قربانیاں پیش کیں، خدا نے ان میں سے صرف ایک کی قربانی قبول کی اور اسی کی زبان سے اپنا یہ ابدی اصول بھی ظاہر فرما دیا:

﴿ اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ۝ ﴾ (۵/ المآئدۃ:۲۷)

''خدا تو متقیوں ہی سے قبول کرتا ہے۔''

متقی بھی وہی ہوتے ہیں، جو دل کے اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں، انہیں کا کام قبول ہوتا ہے اور ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح بخشا جاتا ہے، ان کو خدا کے ہاں محبوبیت کا درجہ حاصل ہوتا ہے اور دنیا میں ان کو ہر دلعزیزی ملتی ہے، ان کے کاموں کو شہرت نصیب ہوتی ہے اور ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے، وہ جماعتوں اور قوموں کے محسن ہوتے ہیں، لوگ ان کے ان کاموں سے نسلاً بعد نسل فیضیاب ہوتے ہیں اور ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد میں فرعونیوں کو ایک پیغمبر اور جادوگر کے درمیان کوئی فرق نظر نہیں آتا تھا، کہ ان دونوں سے انہوں نے عجائب و غرائب امور کا یکساں مشاہدہ کیا، خدا نے فرمایا ان دونوں کے عجائب و غرائب میں ظاہری نہیں، باطنی صورت کا فرق ہے، ایک کے کام کی غرض صرف تماشا اور بازی گری ہے اور دوسرے کا نتیجہ ایک پوری قوم کی اخلاقی و روحانی زندگی کا انقلاب ہے، اسی لیے یہ فیصلہ ہے کہ

﴿ وَلَا يُفْلِحُ السّٰحِرُ حَيْثُ اَتٰى۝ ﴾ (۲۰/ طٰهٰ:۶۹)

''اور جادوگر جدھر سے بھی آئے فلاح نہیں پائے گا۔''

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ مصر کے جادوگروں کے حیرت انگیز کرتب صرف کہانی بن کر رہ گئے اور موسیٰ علیہ السلام کے معجزات نے ایک نئی قوم، ایک نئی شریعت، ایک نئی زندگی، ایک نئی سلطنت پیدا کی، جو مدتوں تک دنیا میں قائم رہی۔ غرض عمل کا اصلی پیکر وہی ہے، جو دل کے کارخانہ میں تیار ہوتا ہے، اسی لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ ہر کام سے پہلے دل کی نیت کا جائزہ لے لیا جائے، اس مسئلہ کو اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ نکتہ خود بخود حل ہو جائے گا کہ اسلام نے ہر عبادت کے صحیح ہونے کے لیے ارادہ اور نیت کو کیوں ضروری قرار دیا ہے۔

توکل

﴿ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹)

توکل قرآن پاک کی اصطلاح کا اہم لفظ ہے، عام لوگ اس کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کے لیے جدوجہد وکوشش نہ کی جائے، بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرہ یا خانقاہ میں بیٹھ رہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے، وہ خود کردے گا، یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو رہے گا، اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں، لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے، جس کو اسلام سے ذرہ بھر بھی تعلق نہیں۔ توکل کے لفظی معنی بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں، لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں؟ جھوٹے صوفیوں نے ترک عمل، اسباب و تدابیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے، حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے کا کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے، تو اللہ تعالیٰ اس میں ضرور ہی ہم کو کامیاب فرمائے گا۔

اگر تدبیر اور جدوجہد وکوشش کا ترک ہی توکل ہوتا، تو دنیا میں لوگوں کے سمجھانے کے لیے اللہ تعالیٰ پیغمبروں کو مبعوث نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی وسرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا، نہ بدر واُحد اور خندق وحنین میں سواروں، تیراندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ کے پاس جا جا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔ توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے، حکم ہوتا ہے کہ جب لڑائی یا کوئی اور مشکل کام پیش آئے، تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ لے لو، مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کے انجام دینے کا عزم کرلو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کردو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب خواہ نتیجہ پیدا کرے گا، اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی حکمت ومصلحت اور مشیت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ بنو اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ اور اثر ہے، بلکہ یہ سمجھو کہ خدا تعالیٰ کا تم پر فضل وکرم ہوا اور اسی نے تم کو کامیاب اور بامراد کیا، آل عمران میں ہے:

﴿ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ۝ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ ﴾ (۳/ آل عمران:۱۵۹۔۱۶۰)

’’اور کام (یا لڑائی) میں ان سے مشورہ لے لو، پھر جب پکا ارادہ کرلو تو اللہ پر بھروسہ رکھو، بے

شک اللہ (اللہ پر) بھروسہ رکھنے والوں کو پیار کرتا ہے، اگر اللہ تمہارا مددگار ہو تو کوئی تم پر غالب نہ آ سکے گا اور اگر وہ تم کو چھوڑ دے تو پھر کون ہے جو اس کے بعد تمہاری مدد کر سکے اور اللہ ہی پر چاہیے کہ ایمان والے بھروسہ رکھیں۔''

ان آیات نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت ظاہر کر دی، کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نہیں، بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھنا چاہیے کہ خدا مددگار ہے، تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کر سکتا اور اگر وہی نہ چاہے تو کسی کی کوشش و مددگار آمد نہیں ہو سکتی، اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اپنے کام میں خدا پر بھروسہ رکھے۔ منافق اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور راتوں کو جوڑ توڑ کرتے ہیں، حکم ہوتا ہے کہ ان کی ان مخالفانہ چالوں کی پروا نہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، وہی تمہارے کاموں کو بنائے گا:

﴿ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ۝ ﴾ (٤/ النسآء:٨١)

''تو ان منافقوں سے درگزر کر اور خدا پر بھروسہ رکھ اور اللہ ہے کام بنانے والا۔''

آغاز اسلام کے شروع میں تین برس کی مخفی دعوت کے بعد جب اسلام کی علانیہ دعوت کا حکم ہوتا ہے، تو مخالفوں کی کثرت اور دشمنوں کی قوت سے بے خوف ہونے کی تعلیم دی جاتی ہے اور فرمایا جاتا ہے کہ ان مشکلات کی پروا کیے بغیر خدا پر توکل اور بھروسہ کر کے کام شروع کر دو:

﴿ وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الْأَقْرَبِينَ ۝ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ۝ فَإِنْ عَصَوْكَ فَقُلْ إِنِّي بَرِيءٌ مِّمَّا تَعْمَلُونَ ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْعَزِيزِ الرَّحِيمِ ۝ الَّذِي يَرَاكَ حِينَ تَقُومُ ۝ وَتَقَلُّبَكَ فِي السَّاجِدِينَ ۝ ﴾ (٢٦/ الشعرآء:٢١٤-٢١٩)

''اور اپنے قریبی رشتہ داروں کو ہشیار کر اور مومنوں میں سے جو تیری پیروی کرے اس کے لیے اپنی (شفقت) کا بازو جھکا، پھر اگر وہ تیرا کہنا نہ مانیں تو کہہ دے کہ میں تمہارے کاموں سے الگ ہوں اور اس غالب رحمت والے پر بھروسہ رکھ جو تجھ کو دیکھتا ہے، جب تو (رات کو) اٹھتا ہے اور نمازیوں میں تیری آمد و رفت کو ملاحظہ کرتا ہے۔''

دشمنوں کے نرغہ میں ہونے کے باوجود آنحضرت ﷺ تنہائی میں راتوں کو اٹھ اٹھ کر عبادت گزار مسلمانوں کو دیکھتے پھرتے تھے، یہ جرأت اور بے خوفی اسی توکل کا نتیجہ تھی، مشکلات میں اسی توکل اور اللہ پر اعتماد کی تعلیم مسلمانوں کو دی گئی ہے، احزاب میں منافقوں اور کافروں کی مخالفانہ کوششوں سے بے پروا ہو کر اپنے کام میں لگے رہنے کا جہاں حکم دیا گیا ہے، وہاں اسی توکل کا سبق پڑھایا گیا ہے:

﴿ يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ اتَّقِ اللَّهَ وَلَا تُطِعِ الْكَافِرِينَ وَالْمُنَافِقِينَ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ۝ وَاتَّبِعْ مَا

يُوْحٰى اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرًا ۙ وَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ ﴾ (۳۳/ الاحزاب: ۱۔۳)

''اے پیغمبر! خدا سے ڈر اور کافروں اور منافقوں کا کہنا نہ مان، بے شک اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے اور جو تیرے پاس تیرے پروردگار کی طرف سے وحی کی جاتی ہے، اس کے پیچھے چل، بے شک خدا تمہارے کاموں سے خبردار ہے اور اللہ پر بھروسہ رکھ اور اللہ کام بنانے کو کافی ہے۔''

کفار سے مسلسل لڑائیوں کے پیش آنے کے بعد یہ ارشاد ہوتا ہے کہ اگر اب بھی یہ لوگ صلح کی طرف جھکیں تو تم بھی جھک جاؤ اور مصالحت کر لو اور یہ خیال نہ کرو کہ یہ بدعہد کہیں دھوکا نہ دیں، خدا پر بھروسہ رکھو تو ان کے فریب کا داؤ کامیاب نہ ہوگا:

﴿ وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ اللّٰهُ ؕ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال: ۶۱۔۶۲)

''اور اگر وہ صلح کے لیے جھکیں، تو تو بھی جھک جا اور خدا پر بھروسہ رکھ، بے شک وہ سننے والا اور جاننے والا ہے اور اگر وہ تجھے دھوکا دینا چاہیں تو کچھ پروا نہیں کہ تجھے اللہ کافی ہے، اُسی نے تجھ کو اپنی اور مسلمانوں کی نصرت سے تیری تائید کی۔''

یہود جن کو اپنی دولت، ثروت اور علم پر ناز تھا، ان سے بھی بے خوف و خطر ہو کر اللہ کے بھروسہ پر مسلمانوں کو حق کی تائید کے لیے کھڑے ہو جانے کا حکم ہوتا ہے:

﴿ اِنَّ هٰذَا الْقُرْاٰنَ يَقُصُّ عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اَكْثَرَ الَّذِيْ هُمْ فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ وَاِنَّهٗ لَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ اِنَّ رَبَّكَ يَقْضِيْ بَيْنَهُمْ بِحُكْمِهٖ ۚ وَهُوَ الْعَزِيْزُ الْعَلِيْمُ ۚ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ؕ اِنَّكَ عَلَى الْحَقِّ الْمُبِيْنِ ۝ ﴾ (۲۷/ النمل: ۷۶۔۷۹)

''بے شک یہ قرآن بنی اسرائیل سے اکثر وہ باتیں ظاہر کر دیتا ہے، جن میں وہ مختلف ہیں اور بے شک یہ قرآن مسلمانوں کے لیے ہدایت اور رحمت ہے، بے شک تیرا پروردگار ان کے درمیان اپنے حکم سے فیصلہ کر دے گا اور وہی غالب اور جاننے والا ہے، تو تو خدا پر بھروسہ رکھ بے شک تو کھلے حق پر ہے۔''

اسلام کی تبلیغ اور دعوت کی مشکلوں میں بھی خدا ہی کے اعتماد اور بھروسہ پر کام کرنے کی ہدایت ہے کہ وہ ایسی طاقت ہے جس کو زوال نہیں اور ایسی ہستی ہے جس کو فنا نہیں، فرمایا:

﴿ وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا مُبَشِّرًا وَّنَذِيْرًا ۝ قُلْ مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ اِلَّا مَنْ شَآءَ اَنْ يَّتَّخِذَ اِلٰى رَبِّهٖ سَبِيْلًا ۝ وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِيْ لَا يَمُوْتُ ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۵۶۔۵۸)

''اور میں نے تو (اے رسول) تجھے خوش خبری سنانے والا اور ہشیار کرنے والا بنا کر بھیجا ہے، کہہ دے کہ میں تم سے اسکے سوا (اپنے کام کی) کوئی مزدوری نہیں مانگتا کہ جو چاہے اپنے پروردگار کا راستہ قبول کرے اور اس زندہ رہنے والے پر بھروسہ کر جس کو موت نہیں۔''

رسول کو ہدایت ہوتی ہے کہ تم اپنا کام کیے جاؤ، مخالفین کی پروانہ کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو، جس کے سوا کوئی دوسرا با اختیار نہیں:

﴿ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴾

(۹/ التوبة:۱۲۹)

''تو اگر یہ (مخالفین) کہا نہ مانیں، تو (ان سے) کہہ دو کہ مجھے اللہ بس ہے، نہیں کوئی معبود، لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا، وہ بڑے تخت کا مالک ہے۔''

آپس کے اختلافات میں اللہ کا فیصلہ چاہیے، اس حالت میں بھی اسی پر بھروسہ ہے:

﴿ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ ذَٰلِكُمُ اللَّهُ رَبِّي عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ﴾ (٤٢/ الشورى:١٠)

''اور جس چیز میں تم میں رائے کا اختلاف ہے، تو اس کا فیصلہ خدا کی طرف ہے، وہی اللہ ہے میرا پروردگار، اسی پر میں بھروسہ کرتا ہوں اور اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔''

رسول کو خدا کی آیتیں پڑھ کر اپنی نادان قوم کو سنانے کا حکم ہوتا ہے اور تسلی دی جاتی ہے کہ ان کے کفر و نافرمانی کی پروانہ کرو اور اپنی کامیابی کے لیے خدا پر بھروسہ رکھو:

﴿ كَذَٰلِكَ أَرْسَلْنَاكَ فِي أُمَّةٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهَا أُمَمٌ لِتَتْلُوَ عَلَيْهِمُ الَّذِي أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ وَهُمْ يَكْفُرُونَ بِالرَّحْمَٰنِ قُلْ هُوَ رَبِّي لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ مَتَابِ ﴾

(١٣/ الرعد:٣٠)

''ایسا ہی ہم نے تجھے اس قوم میں بھیجا ہے جس سے پہلے بہت سی قومیں گزر چکیں، تا کہ تو ان کو وہ پیام سنائے جو میں نے تجھ پر وحی کیا ہے اور وہ رحمٰن کے ماننے سے انکار کرتے ہیں، کہہ دے کہ وہ میرا پروردگار ہے کوئی معبود نہیں لیکن وہی، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی کی طرف میرا لوٹنا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کی رحمت اور کرم پر ہمیشہ ایک مسلمان کو بھروسہ رکھنا چاہیے اور گمراہوں کی ہدایت کا فرض ادا کرنے کے بعد ان کی شرارتوں سے پراگندہ خاطر نہ ہونا چاہیے، کفار کو یہ آیت سنا دینی چاہیے:

﴿ قُلْ هُوَ الرَّحْمَٰنُ آمَنَّا بِهِ وَعَلَيْهِ تَوَكَّلْنَا فَسَتَعْلَمُونَ مَنْ هُوَ فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ﴾

(٦٧/ الملك:٢٩)

"کہہ دے وہی رحم والا ہے، ہم اس پر ایمان لائے اور اسی پر بھروسہ کیا، تو تم جان لو گے کہ کون کھلی گمراہی میں ہے۔"

جس طرح ہمارے رسول ﷺ کو اور عام مسلمانوں کو ہر قسم کی مصیبتوں، مخالفتوں اور مشکلوں میں خدا پر توکل اور اعتماد رکھنے کی ہدایت بار بار ہوئی ہے، آپ سے پہلے پیغمبروں کو بھی اس قسم کے موقعوں پر اسی کی تعلیم دی گئی ہے اور خود اولوالعزم رسولوں کی زبان سے عملاً اس تعلیم کا اعلان ہوتا رہا ہے، حضرت نوح علیہ السلام جب تن تنہا سالہا سال تک کافروں کے نرغہ میں پھنسے رہے، تو انہوں نے پوری بلند آہنگی کے ساتھ اپنے دشمنوں کو یہ اعلان فرما دیا:

﴿ وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَأَ نُوحٍ ۘ إِذْ قَالَ لِقَوْمِهِ يَا قَوْمِ إِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَقَامِي وَتَذْكِيرِي بِآيَاتِ اللَّهِ فَعَلَى اللَّهِ تَوَكَّلْتُ فَأَجْمِعُوا أَمْرَكُمْ وَشُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ أَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوا إِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُونِ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۷۱)

"(اے پیغمبر)! ان کو نوح کا حال سنا جب اس نے اپنی قوم سے کہا، اے میرے لوگو! اگر میرا رہنا اور اللہ کی نشانیوں کے ساتھ میرا نصیحت کرنا، تم پر شاق گزرتا ہے تو اللہ پر میں نے بھروسہ کر لیا ہے، تو تم اپنی تدبیر کو اور اپنے شریکوں کو خوب مضبوط کر لو پھر تم پر تمہاری تدبیر چھپی نہ رہے، پھر اس کو مجھ پر پورا کر لو اور مجھے مہلت نہ دو۔"

غور کیجئے کہ حضرت نوح علیہ السلام دشمنوں کے ہر قسم کے مکر وفریب، سازش اور لڑائی بھڑائی کے مقابلہ میں استقلال اور عزیمت کے ساتھ خدا پر توکل اور اعتماد کا اظہار کس پیغمبرانہ شان سے فرما رہے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام کو ان کی قوم جب اپنے دیوتاؤں کے قہر اور غضب سے ڈراتی ہے، تو وہ جواب میں فرماتے ہیں:

﴿ إِنِّي أُشْهِدُ اللَّهَ وَاشْهَدُوا أَنِّي بَرِيءٌ مِمَّا تُشْرِكُونَ ۝ مِنْ دُونِهِ فَكِيدُونِي جَمِيعًا ثُمَّ لَا تُنْظِرُونِ ۝ إِنِّي تَوَكَّلْتُ عَلَى اللَّهِ رَبِّي وَرَبِّكُمْ ﴾ (۱۱/ ھود:۵۴۔۵۶)

"میں اللہ کو گواہ کرتا ہوں اور تم بھی گواہ رہو کہ میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کے سوا شریک ٹھہراتے ہو، پھر تم سب مل کر میرے ساتھ داؤ کر لو، پھر مجھے مہلت نہ دو، میں نے اللہ پر جو میرا پروردگار اور تمہارا پروردگار ہے بھروسہ کر لیا ہے۔"

حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے کہتے ہیں کہ مجھے تمہاری مخالفتوں کی پروا نہیں، مجھے جو اصلاح کا کام کرنا ہے، وہ کروں گا، میرا تکیہ خدا پر ہے:

﴿ إِنْ أُرِيدُ إِلَّا الْإِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ۚ وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ ۚ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَإِلَيْهِ أُنِيبُ ۝ ﴾

(۱۱/ ھود:۸۸)

’’میں تو جب تک مجھ میں طاقت ہے، کام سدھارنا چاہتا ہوں، میری توفیق اللہ ہی سے ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا ہے، اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔‘‘

ان پیغمبروں کی اس استقامت، صبر اور توکل کے واقعات سنانے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو تسلی دی جاتی ہے، کہ آپ کو بھی اپنے کاموں کے مشکلات میں اسی طرح خدا پر توکل کرنا چاہیے:

﴿ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ۙ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ۝ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ ﴾

(١١/ هود: ١٢١-١٢٣)

’’کہہ دو ان سے جو ایمان نہیں لاتے کہ تم اپنی جگہ کام کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور تم بھی (نتیجہ کا) انتظار کرو، ہم بھی کرتے ہیں اور اللہ ہی کے قبضہ میں ہے، آسمانوں کا اور زمین کا چھپا بھید اور اسی کی طرف سارے کاموں کا فیصلہ لوٹایا جاتا ہے، پھر اس کی عبادت کر اور اس پر بھروسہ کر۔‘‘

مسلمانوں کے سامنے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے پیرووں کا نمونہ پیش کیا جا رہا ہے، کہ وہ صرف خدا کے بھروسہ پر عزیز و اقارب سب کو چھوڑ کر الگ ہو گئے اور خدا کی راہ میں کسی کی دوستی اور محبت کی پروانہ کی:

﴿ قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ ۚ اِذْ قَالُوْا لِقَوْمِهِمْ اِنَّا بُرَءٰٓؤُا مِنْكُمْ وَمِمَّا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ۫ كَفَرْنَا بِكُمْ وَبَدَا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةُ وَالْبَغْضَآءُ اَبَدًا حَتّٰى تُؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ وَحْدَهٗٓ اِلَّا قَوْلَ اِبْرٰهِيْمَ لِاَبِيْهِ لَاَسْتَغْفِرَنَّ لَكَ وَمَآ اَمْلِكُ لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ شَيْءٍ ؕ رَبَّنَا عَلَيْكَ تَوَكَّلْنَا وَاِلَيْكَ اَنَبْنَا وَاِلَيْكَ الْمَصِيْرُ ۝ ﴾ (٦٠/ الممتحنه: ٤)

’’تمہارے لیے ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں میں پیروی کا اچھا نمونہ ہے، جب انہوں نے اپنی قوم سے کہا کہ ہم تم سے اور خدا کے سوا جن کو تم پوجتے ہو ان سے بیزار ہیں، ہم نے تمہارے مسلک کا انکار کر دیا اور ہم میں اور تم میں دشمنی اور نفرت ہمیشہ کے لیے کھل گئی، جب تک تم ایک خدا پر ایمان نہ لے آؤ، مگر ابراہیم علیہ السلام کا اپنے باپ سے یہ کہنا کہ میں تمہارے لیے خدا سے دعا کروں گا اور مجھے خدا کے کام میں کوئی اختیار نہیں، اے ہمارے پروردگار! تجھی پر ہم نے بھروسہ کیا اور تیری ہی طرف ہم نے رجوع کیا اور تیرے ہی پاس لوٹ کر جانا ہے۔‘‘

حضرت یعقوب علیہ السلام اپنے عزیز بیٹوں کو مصر بھیجتے ہیں، لیکن فرط محبت سے ڈرتے ہیں کہ یوسف کی طرح ان کو بھی کوئی مصیبت نہ پیش آئے، بیٹوں کو کہتے ہیں کہ تم سب شہر کے ایک دروازہ سے نہیں، بلکہ متفرق دروازوں سے اندر جانا، اس ظاہری تدبیر کے بعد خیال آتا ہے کہ کارساز حقیقی تو خدا ہے، ان تدبیروں سے اس کا حکم ٹل تھوڑا ہی سکتا ہے، اس لیے بھروسہ تدبیر پر نہیں، بلکہ خدا کی کارسازی پر ہے:

﴿ وَقَالَ يٰبَنِيَّ لَا تَدْخُلُوْا مِنْۢ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوْا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ ؕ وَمَآ اُغْنِيْ عَنْكُمْ

مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ ۚ وَ عَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ۝﴾

(۱۲/ یوسف:٦٧)

”اور (یعقوب علیہ السلام نے) کہا، اے میرے بیٹو! ایک دروازہ سے نہ جانا، بلکہ الگ الگ دروازوں سے جانا اور میں تم کو خدا سے ذرا بھی بچا نہیں سکتا، فیصلہ اسی کا ہے، اسی پر میں نے بھروسہ کیا اور اسی پر چاہیے کہ بھروسہ کرنے والے بھروسہ کریں۔“

حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس عمل سے یہ بھی ظاہر ہو گیا کہ ظاہری تدبیر شانِ توکل کے منافی نہیں۔

حضرت شعیب علیہ السلام کی دعوت کے جواب میں جب ان کی قوم ان کو زبردستی بت پرست بن جانے پر مجبور کرتی ہے، ورنہ ان کو گھر سے باہر نکال دینے کی دھمکی دیتی ہے، تو اس کے جواب میں وہ پوری استقامت کے ساتھ فرماتے ہیں:

﴿قَدِ افْتَرَیْنَا عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِیْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ؕ وَ مَا یَكُوْنُ لَنَاۤ اَنْ نَّعُوْدَ فِیْهَاۤ اِلَّاۤ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ؕ وَسِعَ رَبُّنَا كُلَّ شَیْءٍ عِلْمًا ؕ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ؕ رَبَّنَا افْتَحْ بَیْنَنَا وَ بَیْنَ قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَ اَنْتَ خَیْرُ الْفٰتِحِیْنَ۝﴾ (۷/ الاعراف:۸۹)

”اگر ہم پھر تمہارے مذہب میں آ جائیں جب ہم کو خدا اس سے بچا چکا، تو ہم نے خدا پر جھوٹ باندھا اور یہ ہم سے نہیں ہو سکتا کہ ہم پھر اس میں لوٹ کر جائیں، مگر یہ کہ ہمارا پروردگار خدا ہی چاہے، ہمارا پروردگار اپنے علم سے ہر چیز کو سمائے ہے، ہم نے خدا پر بھروسہ کیا، اے ہمارے پروردگار! ہمارے اور ہماری قوم کے بیچ میں تو حق کا فیصلہ کر دے اور تو ہی سب فیصلہ کرنے والوں میں سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔“

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے دل بادل لشکر اور شاہانہ زور و قوت کے مقابلہ میں بنی اسرائیل کو خدا ہی پر توکل کی تعلیم دی، فرمایا:

﴿یٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَیْهِ تَوَكَّلُوْۤا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِیْنَ۝﴾ (۱۰/ یونس:۸۵)

”اے میرے لوگو! اگر تم خدا پر ایمان لا چکے ہو، تو اسی پر بھروسہ کرو، اگر تم فرمانبردار ہو۔“

ان کی قوم نے بھی پوری ایمانی جرأت کے ساتھ جواب دیا:

﴿عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِیْنَ۝ۙ﴾ (۱۰/ یونس:۸٦)

”ہم نے خدا ہی پر بھروسہ کیا، ہمارے پروردگار ہم کو ظالم قوم کے لیے آزمائش نہ بنا۔“

اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ہر تدبیر کو جس طرح کامیاب بنایا اور ان کو اپنی خاص خاص نوازشوں سے جس طرح سرفراز کیا، اس سے ہر شخص واقف ہے، یہ سب کچھ ان کے اسی توکل کے صدقہ میں

ہوا، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنا یہ اصول ہی ظاہر فرما دیا ہے:

﴿ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ﴾ (٦٥/ الطلاق: ٣)

''جو خدا پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو کافی ہے۔''

یہ آیت پاک خانگی و معاشرتی مشکلات کے موقع کی ہے، کہ اگر میاں بیوی میں نباہ کسی طرح نہ ہو سکے اور دونوں میں قطعی علیحدگی (طلاق) ہو جائے تو پھر عورت کو اس سے ڈرنا نہ چاہیے کہ ہمارا سامان کیا ہو گا اور ہم کہاں سے کھائیں گے؟

ع خدا خود میر سامان است ارباب توکل را

توکل کے متعلق قرآن پاک کی جس قدر آیتیں ہیں اور وہ ایک ایک کر کے آپ کے سامنے ہیں، ہر ایک پر غور کی نظر ڈالیے کہ ان میں سے کوئی بھی ان معنوں میں ہے جن میں ہم اپنی جہالت سے اس کو سمجھتے ہیں، ان میں سے ہر ایک کا مفہوم یہ ہے کہ ہم مشکلات کے ہجوم، موانع کی کثرت اور پرزور مخالفتوں کی تدبیروں سے نڈر ہو کر استحکام، عزم اور استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد سے کام کے حسب خواہ نتیجہ پیدا ہونے کا دل میں یقین رکھیں۔ احادیث میں ہے کہ ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آنحضرت ﷺ کی خدمت میں آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ ﷺ! میں اونٹ کو یونہی چھوڑ کر خدا پر توکل کروں کہ میرا اونٹ مجھ کو مل جائے گا یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا: ''اس کو باندھ کر خدا پر توکل کرو۔'' [1] اسی واقعہ کو مولانا رومی نے اس مصرع میں ادا کیا ہے:

ع برتوکل زانوے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں، تاہم حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے عین منشا کے مطابق ہے۔

بعض لوگ تعویذ گنڈا، غیر شرعی [2] جھاڑ پھونک، ٹوٹکے اور منتر پر یقین رکھتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ مادی اسباب و تدابیر کو چھوڑ کر ان چیزوں سے مطلب برآری کرنا ہی توکل ہے، جاہلیت کے وہم پرست بھی یہی عقیدہ رکھتے تھے، لیکن آنحضرت ﷺ نے ان کے اس خیال کی تردید کر دی اور فرمایا کہ ''خدا نے وعدہ کیا ہے کہ میری امت سے ستر ہزار اشخاص حساب کتاب کے بغیر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے، یہ وہ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے، جو بدشگونی کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے، بلکہ اپنے پروردگار پر توکل اور

---

[1] یہ حدیث بلفظ "اعقلها وتوكل" ترمذی (آخر ابواب صفة القيامة: ٢٥١٧) میں اور "قيده وتوكل" شعب الايمان بیہقی میں اور "قيدها وتوكل" خطیب کی روایت مالک اور ابن عساکر میں ہے (كنز العمال، ج ٢، ص: ٢٣ حیدر آباد)۔

[2] شرعی کلمات حقیقت میں اللہ تعالیٰ سے دعائیں ہیں اور اس کے کلام پاک سے تبرک حاصل کرنا ہے، لیکن آیات اور دعاؤں کو لکھ کر بدن میں لٹکانا یا گھول کر پینا، یا خاص قیود کے ساتھ اعداد میں ان کو لکھنا ثابت نہیں۔

اعتماد رکھتے ہیں۔'' ❶ ایک دوسری حدیث میں ارشاد فرمایا کہ ''جو داغواتے اور تعویذ گنڈا کراتے ہیں، وہ توکل سے محروم ہیں۔'' ❷ اس سے مقصود نفس تدبیر کی ممانعت نہیں، بلکہ جاہلانہ اوہام کی بیخ کنی ہے، ایک اور موقع پر ارشاد ہوا کہ ''اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے روزی پہنچاتا، جیسے پرندوں کو پہنچاتا ہے کہ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں۔'' ❸ اس حدیث سے بھی مقصود ترک عمل اور ترک تدبیر نہیں، کیونکہ پرندوں کو ان کے گھونسلوں میں بیٹھا کر یہ روزی نہیں پہنچائی جاتی ہے، بلکہ ان کو بھی اڑ کر کھیتوں اور باغوں میں جانے اور رزق کے تلاش کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے، بلکہ مقصود یہ ہے کہ جو لوگ خدا پر توکل اور اعتماد سے محروم ہیں، وہ روزی کے لیے دل تنگ اور کبیدہ خاطر ہوتے ہیں اور اس کے حصول کے لیے ہر قسم کی بدی اور برائی کا ارتکاب کرتے ہیں، حالانکہ انہیں اگر یہ یقین ہو کہ

﴿ وَمَا مِنْ دَآبَّةٍ فِي الْاَرْضِ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ رِزْقُهَا ﴾ (۱۱/ هود:٦)

''زمین میں کوئی رینگنے والا نہیں، لیکن اس کی روزی خدا کے ذمہ ہے۔''

تو وہ اس کے لیے چوری، ڈاکہ، قتل، بے ایمانی اور خیانت وغیرہ کے مرتکب نہ ہوتے اور نہ ان کو دلی تنگی اور مایوسی ہوا کرتی، بلکہ صحیح طور سے وہ کوشش کرتے اور روزی پاتے، ان حدیثوں کا یہی مفہوم ہے، جو قرآن پاک کی اس آیت میں ادا ہوا ہے:

﴿ وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهٗ مَخْرَجًا ۙ وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ ۭ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ ۭ اِنَّ اللّٰهَ بَالِغُ اَمْرِهٖ ۭ قَدْ جَعَلَ اللّٰهُ لِكُلِّ شَيْءٍ قَدْرًا ۝ ﴾

(٦٥/ الطلاق:٢-٣)

''اور جو کوئی اللہ سے ڈرے، وہ اس کے لیے مشکل سے نکلنے کا راستہ کر دے گا اور اس کو وہاں سے روزی دے گا، جہاں سے اس کو گمان نہ ہو گا اور جو اللہ پر بھروسہ کرے گا تو وہ اس کو بس ہے، بے شک اللہ اپنے ارادہ کو پہنچ کر رہتا ہے، اس نے ہر چیز کے لیے ایک اندازہ مقرر کر دیا ہے۔''

اوپر کی تفصیلوں سے ہویدا ہے کہ توکل جس قلبی یقین کا نام ہے، اسی کے قریب قریب آج کل کے اخلاقیات میں ''خود اعتمادی'' کا لفظ بولا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ کامیاب افراد وہی ہوتے ہیں، جن میں یہ جوہر پایا جاتا ہے، لیکن اس خود اعتمادی کی سرحد سے بالکل قریب غرور اور فریب نفس کے گڑھے بھی ہیں، اس لیے اسلام نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے ''خدا اعتمادی'' کا نظریہ پیش کیا ہے، جو ان خطروں سے محفوظ ہے۔

---

❶ صحیح بخاری، کتاب الطب، باب من لم یرق: ٥٧٥٢ وکتاب الرقاق، باب ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ: ٦٤٧٢؛ صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب الدلیل علی دخول طوائف من المسلمین...... ٥٢٤ جاہلیت میں اکثر بیماریوں کا علاج آگ سے داغ کر کرتے تھے۔ ❷ جامع ترمذی، ابواب الطب باب ماجاء مافی کراھیة الرقیة: ٢٠٥٥۔ اصل الفاظ یہ ہیں، من اکتوی اواسترقی فقد بریٔ من التوکل۔ ❸ جامع ترمذی، ابواب الزھد، باب فی التوکل علی اللہ: ٢٣٤٤؛ مستدرک حاکم، کتاب الرقاق، ج ٤، ص: ٣١٨۔

صبر

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ أُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ ﴾ (٤٦/ الاحقاف :٣٥)

صبر کی حقیقت پر عوام کی غلط فہمی نے تو بر تو پردے ڈال رکھے ہیں، وہ ان کے نزدیک بے بسی و بے کسی کی تصویر ہے اور اس کے معنی اپنے دشمن سے کسی مجبوری کے سبب سے انتقام نہ لے سکنا ہیں، لیکن کیا واقعی یہی ہے؟

صبر کے لغوی معنی

''صبر'' کے لغوی معنی ''روکنے'' اور ''سہارنے'' کے ہیں، یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ پر ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے، یعنی اس کے معنی بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں، بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی اور اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں، حضرت موسیٰ علیہ السلام اور خضر علیہ السلام کے قصہ میں ایک ہی آیت میں تین جگہ یہ لفظ آیا ہے اور ہر جگہ یہی معنی مراد ہیں، حضرت خضر علیہ السلام کہتے ہیں:

﴿ إِنَّكَ لَنْ تَسْتَطِيعَ مَعِيَ صَبْرًا ۝ وَكَيْفَ تَصْبِرُ عَلَىٰ مَا لَمْ تُحِطْ بِهِ خُبْرًا ۝ ﴾

(١٨/ الكهف: ٦٧_٦٨)

''تم میرے ساتھ صبر نہ کر سکو گے اور کیسے اس بات پر صبر کر سکتے ہو، جس کا علم تمہیں نہیں۔''

حضرت موسیٰ علیہ السلام جواب میں فرماتے ہیں:

﴿ سَتَجِدُنِي إِنْ شَاءَ اللَّهُ صَابِرًا ﴾ (١٨/ الكهف :٦٩)

''اگر خدا نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔''

اس صبر سے مقصود لاعلمی کی حالت میں غیر معمولی واقعات کے پیش آنے سے دل میں اضطراب اور بے چینی کا پیدا نہ ہونا ہے۔

کفار، اپنے پیغمبروں کے سمجھانے کے باوجود، پوری تندہی اور مضبوطی کے ساتھ اپنی بت پرستی پر قائم رہتے ہیں، تو اس کی حکایت ان کی زبان سے قرآن یوں بیان کرتا ہے:

﴿ إِنْ كَادَ لَيُضِلُّنَا عَنْ آلِهَتِنَا لَوْلَا أَنْ صَبَرْنَا عَلَيْهَا ﴾ (٢٥/ الفرقان :٤٢)

''یہ شخص (پیغمبری کا مدعی) تو ہم کو اپنے خداؤں (بتوں) سے ہٹا ہی چکا تھا، اگر ہم ان پر صابر (ثابت) نہ رہتے۔''

یہی مفہوم ایک اور آیت میں ہے، کفار آپس میں کہتے ہیں:

﴿ أَنِ امْشُوا وَاصْبِرُوا عَلَىٰ آلِهَتِكُمْ ﴾ (٣٨/ ص :٦) ''چلو اور اپنے خداؤں پر صبر کرو، (یعنی مضبوطی کے ساتھ قائم رہو۔''

عرب کے بعض گنوار آنحضرت ﷺ کے حجرہ کے سامنے آکر بدتمیزی سے آپ کو پکارتے تھے، ان

سے کہا گیا کہ اتنی گھبراہٹ کیا تھی! ذرا ٹھہر جاتے۔

﴿ وَلَوْ أَنَّهُمْ صَبَرُوا حَتَّىٰ تَخْرُجَ إِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ﴾ (٤٩/ الحجرات: ٥)

''اور اگر وہ ذرا صبر کرتے (یعنی ٹھہر جاتے) یہاں تک کہ تم (اے رسول) نکل کر ان کے پاس آتے تو ان کے لیے بہتر ہوتا۔''

قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی ایک معنی میں مستعمل ہوا ہے، گو حالات کے تغیر سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے، بااین ہمہ ان سب کا مرجع ایک ہی ہے، یعنی ثابت قدمی اور استقامت، صبر کے یہ مختلف مفہوم جن میں قرآن پاک نے اس کو استعمال کیا ہے، حسب ذیل ہیں:

وقتِ مناسب کا انتظار کرنا

پہلا یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا، آنحضرت ﷺ نے جب شروع میں لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی تبلیغ پیش کی، تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا، ہر طرف سے عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں، تو اس وقت بشریت کے اقتضا سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دور نظر آنے لگی اور اس وقت تسلی کا یہ پیام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں، آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں، خدا آپ کا نگہبان ہے، خدا کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا، فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ فَإِنَّكَ بِأَعْيُنِنَا ﴾ (٥٢/ الطور: ٤٨)

''(اے رسول ﷺ) تو اپنے پروردگار کے فیصلہ پر ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، کیونکہ تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔''

﴿ فَاصْبِرُوا حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ بَيْنَنَا ﴾ (٧/ الاعراف: ٨٧)

''تو ثابت قدم رہ کر منتظر رہو، یہاں تک کہ خدا ہمارے درمیان فیصلہ کر دے۔''

﴿ وَاصْبِرْ حَتَّىٰ يَحْكُمَ اللَّهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحَاكِمِينَ ﴾ (١٠/ یونس: ١٠٩)

''اور ثابت قدم رہ کر منتظر رہ، یہاں تک کہ خدا فیصلہ کر دے، وہ سب فیصلہ کرنے والوں میں بہتر ہے۔''

﴿ فَاصْبِرْ ۖ إِنَّ الْعَاقِبَةَ لِلْمُتَّقِينَ ﴾ (١١/ ہود: ٤٩)

''ثابت قدم رہ کر وقت کا منتظر رہ، بے شبہ آخر کار کامیابی پرہیزگاروں ہی کی ہے۔''

اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو، حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی

پوری توقع رکھنی چاہیے:

﴿ فَاصْبِرْ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ ﴾ (۳۰/ الروم:۶۰؛ ۴۰/ المؤمن :۷۷)

''ثابت قدمی کے ساتھ منتظر رہ، بے شک خدا کا وعدہ سچا ہے۔''

ایسا نہ ہو کہ وعدہ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تُطِعْ مِنْهُمْ اٰثِمًا اَوْ كَفُوْرًا ﴾ (۷۶/ الدھر:۲۴)

''اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی سے منتظر رہ اور ان (مخالفین میں) سے کسی گناہگار یا کافر کا کہنا مان لے۔''

آنحضرت ﷺ کو حضرت یونس علیہ السلام کا قصہ سنایا گیا کہ ان کو خیال ہوا کہ ان کی نافرمان قوم پر عذاب آنے میں تاخیر ہو رہی ہے، اس لیے وہ بھاگ کھڑے ہوئے، حالانکہ ان کی قوم دل میں مسلمان ہو چکی تھی، اس لیے وہ عذاب اس سے ٹل گیا تھا، ارشاد ہوا، کہ اے پیغمبر اس طرح تیرے ہاتھ سے صبر کا رشتہ چھوٹنے نہ پائے:

﴿ فَاصْبِرْ لِحُكْمِ رَبِّكَ وَلَا تَكُنْ كَصَاحِبِ الْحُوْتِ ﴾ (۶۸/ القلم:۴۸)

''اپنے پروردگار کے فیصلہ کا ثابت قدمی کے ساتھ انتظار کر اور مچھلی والے (یونس) کی طرح نہ ہو۔''

بے قرار نہ ہونا

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو، بلکہ ان کو خدا کا حکم اور مصلحت سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرما دے گا، اللہ تعالیٰ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی:

﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ عَلٰى مَاۤ اَصَابَهُمْ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۵)

''اور جو مصیبت میں صبر کریں۔''

حضرت یعقوب علیہ السلام بیٹوں سے یہ جھوٹی خبر سن کر کہ بھیڑیے نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کھالیا، فرماتے ہیں:

﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ؕ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ؕ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴾

(۱۲/ یوسف:۱۸)

''بلکہ تمہارے دلوں نے ایک بات گھڑ لی ہے، تو بہتر صبر ہے اور خدا سے اس پر مدد چاہی جاتی ہے، جو تم بیان کرتے ہو۔''

پھر اپنے دوسرے بیٹے کے مصر میں روک لیے جانے کا حال سن کر کہتے ہیں:

﴿ بَلْ سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ عَسَى اللّٰهُ اَنْ يَّاْتِيَنِيْ بِهِمْ جَمِيْعًا ۭ ﴾

(۱۲/ یوسف:۸۳)

''بلکہ تمہارے دلوں نے گھڑ لیا ہے، تو بہتر صبر ہے، عنقریب خدا ان سب کو ساتھ لائے گا۔''

حضرت ایوب علیہ السلام نے جسمانی اور مالی مصیبتوں کو جس رضا و تسلیم کے ساتھ پامردی سے برداشت کیا، اس کی مدح خود اللہ تعالیٰ نے فرمائی:

﴿ اِنَّا وَجَدْنٰهُ صَابِرًا ۭ نِعْمَ الْعَبْدُ ۭ اِنَّهٗٓ اَوَّابٌ ۝ ﴾ (۳۸/ ص:۴۴)

''ہم نے بے شک ایوب کو صابر پایا، کیسا اچھا بندہ، وہ خدا کی طرف رجوع ہونے والا ہے۔''

حضرت اسماعیل علیہ السلام اپنے شفیق اور مہربان باپ کی چھری کے نیچے اپنی گردن رکھ کر فرماتے ہیں:

﴿ يٰٓاَبَتِ افْعَلْ مَا تُؤْمَرُ ۡ سَتَجِدُنِيْٓ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ مِنَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾ (۳۷/ الصافات:۱۰۲)

''اے باپ جو تجھے کہا جاتا ہے، وہ کر گزر، خدا نے چاہا، تو تو مجھے صابروں میں سے پائے گا۔''

مشکلات کو خاطر میں نہ لانا

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن وطنز کریں، ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لایا جائے اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو، بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے، مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے، آنحضرت ﷺ کو اسی لیے دوسری وحی میں جب تبلیغ اور دعوت کا حکم ہوا، تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی آپ ﷺ کو باخبر کر دیا گیا:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ .... وَلِرَبِّكَ فَاصْبِرْ ۝ ﴾ (۷۴/ المدثر:۱۔۷)

''اے چادر پوش! اٹھ اور لوگوں کو ہشیار کر...... اور اپنے پروردگار کے لیے پامردی (صبر) کر۔''

اس قسم کے مواقع اکثر انبیاء علیہم السلام کو پیش آئے، چنانچہ خود آنحضرت ﷺ کو نبوت کی اس اعلیٰ مثال کی پیروی کا حکم ہوا:

﴿ فَاصْبِرْ كَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ وَلَا تَسْتَعْجِلْ لَّهُمْ ۭ ﴾ (۴۶/ الاحقاف:۳۵)

''(اے محمد ﷺ!) تو بھی اسی طرح پامردی کر جس طرح پختہ ارادہ والے پیغمبروں نے کی اور ان (مخالفوں) کے لیے جلدی نہ کر۔''

حضرت لقمان علیہ السلام کی زبان سے بیٹے کو یہ نصیحت سنائی گئی کہ حق کی دعوت و تبلیغ، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض پوری استواری سے ادا کر اور اس راہ میں جو مصیبتیں پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کر:

﴿ وَأْمُرْ بِالْمَعْرُوفِ وَانْهَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا أَصَابَكَ ۖ إِنَّ ذَٰلِكَ مِنْ عَزْمِ الْأُمُورِ ﴾

(۳۱/ لقمان:۱۷)

''نیکی کا حکم کر اور برائی سے روک اور جو مصیبت پیش آئے، اس کو برداشت کر، یہ بڑی پختہ باتوں میں سے ہے۔''

کفار عذاب الٰہی کے جلد نہ آنے، یا حق کی ظاہری بے کسی و بے بسی کے سبب سے آنحضرت ﷺ کو اپنے دلدوز طعنوں سے تکلیفیں پہنچاتے تھے، حکم ہوا کہ ان طعنوں کی پروانہ کر اور نہ ان سے دل کو اداس کر، بلکہ اپنی دھن میں لگا رہ اور دیکھ کہ تجھ سے پہلے پیغمبروں نے کیا کیا:

﴿ اصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاذْكُرْ عَبْدَنَا دَاوُودَ ﴾ (۳۸/ ص:۱۷)

''ان کے کہے پر صبر کر اور ہمارے بندہ داؤد کو یاد کر۔''

اس قوت صبر کے حصول کا طریقہ یہ ہے کہ خدا سے لو لگائی جائے اور اس کی طاقت پر بھروسہ کیا جائے:

﴿ فَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ قَبْلَ طُلُوعِ الشَّمْسِ ﴾

(۲۰/ طٰہٰ:۱۳۰ و ۵۰/ ق:۳۹)

''تو ان کے کہنے پر صبر کر اور صبح شام اپنے پروردگار کی حمد کر۔''

نہ صرف یہ کہ مخالفوں کے اس طعن وطنز کا دھیان نہ کیا جائے، بلکہ اس کے جواب میں اُن سے لطف و مروت برتا جائے، فرمایا:

﴿ وَاصْبِرْ عَلَىٰ مَا يَقُولُونَ وَاهْجُرْهُمْ هَجْرًا جَمِيلًا ۝ ﴾ (۷۳/ المزمل:۱۰)

''تو ان کے کہے پر صبر کر اور ان سے خوبصورتی سے الگ ہو جا۔''

درگزر کرنا

صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ برائی کرنے والوں کی برائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے، اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔ قرآن پاک کی کئی آیتوں میں صبر اس مفہوم میں استعمال ہوا ہے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ وَإِنْ عَاقَبْتُمْ فَعَاقِبُوا بِمِثْلِ مَا عُوقِبْتُمْ بِهِ ۖ وَلَئِنْ صَبَرْتُمْ لَهُوَ خَيْرٌ لِلصَّابِرِينَ ۝ وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُكَ إِلَّا بِاللَّهِ ۚ وَلَا تَحْزَنْ عَلَيْهِمْ وَلَا تَكُ فِي ضَيْقٍ مِمَّا يَمْكُرُونَ ۝ ﴾

(۱۶/ نحل: ۱۲۶۔۱۲۷)

''اور اگر تم سزا دو تو اسی قدر جس قدر تم کو تکلیف دی گئی اور البتہ اگر صبر (برداشت) کرو تو صبر کرنے والوں کے لیے یہ بہتر ہے اور تو صبر کر اور تیرا صبر کرنا نہیں، لیکن خدا کی مدد سے اور ان کا غم نہ کر اور نہ ان کی سازشوں سے دل تنگ ہو۔''

یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے، مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے، یا کسی اور سبب سے نہ ہو، بلکہ صرف خدا کے لیے ہو:

﴿ وَالَّذِيْنَ صَبَرُوا ابْتِغَآءَ وَجْهِ رَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰهُمْ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً وَّيَدْرَءُوْنَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲۲)

''اور جنہوں نے اپنے پروردگار کی ذات کے لیے صبر کیا اور نماز کھڑی کی اور جو ہم نے ان کو روزی دی اس میں سے چھپے اور علانیہ (راہ خدا میں) خرچ کیا اور برائی کو نیکی سے دفع کرتے ہیں، ان کے لیے آخرت کا انجام ہے۔''

فرشتے ان کو مبارکباد دیں گے اور کہیں گے:

﴿ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ بِمَا صَبَرْتُمْ فَنِعْمَ عُقْبَى الدَّارِ ﴾ (۱۳/ الرعد:۲٤)

''تم پر سلامتی ہو کیونکہ تم نے صبر کیا تھا، تو آخرت کا انجام کیا اچھا ہوا۔''

ایک خاص بات اس آیت میں خیال کرنے کے لائق ہے، کہ اس کے شروع میں چند نیکیوں کا ذکر ہے، صبر، نماز، خیرات، برائی کی جگہ بھلائی، مگر فرشتوں نے اس مومن کے جس خاص وصف پر اس کو سلامتی کی دعا دی، وہ صرف صبر یعنی برداشت کی صفت ہے، کیونکہ یہی اصل ہے، جس میں یہ جوہر ہوگا، وہ عبادات کی تکلیف بھی اٹھائے گا، مصیبتوں کو بھی جھیلے گا اور دشمنوں کی بدی کا جواب بھی نیکی سے دے گا، چنانچہ ایک اور آیت میں اس کی تشریح بھی کر دی گئی ہے، کہ درگزر اور بدی کے بدلہ نیکی کی صفت اس میں ہوگی، جس میں صبر ہوگا:

﴿ وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ ؕ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ فَاِذَا الَّذِيْ بَيْنَكَ وَبَيْنَهٗ عَدَاوَةٌ كَاَنَّهٗ وَلِيٌّ حَمِيْمٌ ۝ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا ۚ وَمَا يُلَقّٰهَآ اِلَّا ذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ ﴾

(٤١/ فصلت:٣٤۔٣٥)

''بھلائی اور برائی برابر نہیں، برائی کا جواب اچھائی سے دو، تو یکبارگی جس کے اور تمہارے درمیان دشمنی ہے، وہ قریبی دوست سا ہو جائے گا اور یہ بات اسی کو ملتی ہے جو صبر کرتے ہیں اور یہ اسی کو ملتی ہے جو بڑی قسمت والا ہے۔''

جو لوگوں پر ظلم کرتے پھرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد برپا کرتے رہتے ہیں، ان پر خدا کا عذاب ہو

گا، اس لیے ایک صاحب عزم مسلمان کا فرض یہ ہے کہ دوسرے اس پر ظلم کریں تو بہادری سے اس کو برداشت کرے اور معاف کردے، فرمایا:

﴿ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى الَّذِيْنَ يَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَيَبْغُوْنَ فِي الْاَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَمَنْ صَبَرَ وَغَفَرَ اِنَّ ذٰلِكَ لَمِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝ ﴾ (٤٢/ الشوریٰ: ٤٢۔٤٣)

''راستہ انہیں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ملک میں ناحق فساد کرتے ہیں، یہی ہیں جن کے لیے پردرد عذاب ہے اور البتہ جس نے برداشت کیا اور بخش دیا، بے شک یہ بڑی ہمت کا کام ہے۔''

ثابت قدمی

صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آ جانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے، قرآن پاک نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے متصف ہوئے، صادق القول اور راستباز ٹھہرایا ہے، کہ انہوں نے خدا سے جو وعدہ کیا تھا پورا کیا، فرمایا:

﴿ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَاۗءِ وَالضَّرَّاۗءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ۝ ﴾ (٢/ البقرۃ: ١٧٧)

''اور صبر کرنے والے، ثابت قدمی دکھانے والے مصیبت میں اور نقصان میں اور لڑائی کے وقت، وہی ہیں جو سچ بولے اور وہی پرہیزگار ہیں۔''

اگر لڑائی آ پڑے تو اس میں کامیابی کی چار شرطیں ہیں، خدا کی یاد، امام وقت کی اطاعت، آپس میں اتحاد و موافقت اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾

(٨/ الانفال: ٤٥۔٤٦)

''اے ایمان والو! جب تم کسی دستہ سے مقابل ہو، تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو، تاکہ فلاح پاؤ اور خدا اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرو اور آپس میں جھگڑو نہیں، ورنہ تم سست ہو جاؤ گے اور تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی اور صبر دکھاؤ، بے شک اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔''

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے، تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو

شکست دے دی ہے، اسلام نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جان نثاروں کو سکھا دیا تھا، جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی:

﴿ يَاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۗ اِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ ۝ اَلْـٰٔنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ فِيْكُمْ ضَعْفًا ۗ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ ﴾

(۸/ الانفال: ٦٥-٦٦)

''اے پیغمبر! ایمان والوں کو (دشمنوں کی) لڑائی پر ابھار اگر یہ بیس صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر سو ہوں تو کافروں میں سے ہزار پر غالب ہوں گے، کیونکہ وہ لوگ سمجھتے نہیں، اب اللہ نے تم سے تخفیف کر دی اور اس کو معلوم ہے کہ تم میں کمزوری ہے، تو اگر سو صبر کرنے والے (ثابت قدم) ہوں تو دو سو پر غالب ہوں گے اور اگر ہزار (صبر والے) ہوں تو دو ہزار پر خدا کے حکم سے غالب ہوں گے اور اللہ صبر کرنے والوں (ثابت قدموں) کے ساتھ ہے۔''

میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں اور صبر وثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ کی مدد انہیں لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے، جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں، حضرت طالوت اور جالوت کے قصہ میں بھی اسی نکتہ کو ان لفظوں میں ادا کیا گیا ہے:

﴿ قَالُوْا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ ۗ قَالَ الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوا اللّٰهِ ۙ كَمْ مِّنْ فِئَةٍ قَلِيْلَةٍ غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيْرَةً بِاِذْنِ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ﴾

(۲/ البقرۃ: ۲٤۹-۲۵۰)

''طالوت کے ساتھیوں نے کہا کہ آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ کی طاقت نہیں، انہوں نے جن کو خیال تھا کہ خدا سے ملنا ہے، یہ کہا کہ بسا اوقات تھوڑی تعداد کے لوگ خدا کے حکم سے بڑی تعداد کے لوگوں پر غالب آتے ہیں اور خدا صبر وثبات دکھانے والوں کے ساتھ ہے اور جب یہ جالوت اور اس کی فوج کے مقابلہ میں آئے، تو بولے اے ہمارے پروردگار! ہم پر صبر بہا اور ہم کو ثابت قدمی بخش اور ان کافروں کے مقابلہ میں ہم کو نصرت عطا کر۔''

اللہ نے کمزور اور قلیل التعداد مسلمانوں کی کامیابی کی بھی یہی شرط رکھی ہے اور بتا دیا کہ خدا انہیں کا ہے،

جو صبر اور ثبات سے کام لیتے ہیں اور خدا کے بھروسہ پر مشکلات کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں:

﴿ ثُمَّ إِنَّ رَبَّكَ لِلَّذِينَ هَاجَرُوا مِنْ بَعْدِ مَا فُتِنُوا ثُمَّ جَاهَدُوا وَصَبَرُوا ﴾ (١٦/ النحل: ١١٠)

''پھر تیرا پروردگار ان کے لیے ہے، جنہوں نے ایذا پانے کے بعد گھر بار چھوڑا، پھر لڑتے رہے اور صبر و ثبات کے ساتھ ٹھہرے رہے۔''

دنیا کی سلطنت و حکومت ملنے کے لیے بھی اسی صبر و استقامت کے جوہر پیدا کرنے کی ضرورت ہے، بنی اسرائیل کو فرعون کی غلامی سے نکلنے کے بعد اطراف ملک کے کفار سے جب مقابلہ آ پڑا، تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو پہلا سبق یہ سکھایا:

﴿ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴾ (٧/ الاعراف: ١٢٨)

''موسیٰ نے اپنے لوگوں سے کہا کہ خدا سے مدد چاہو اور صبر و استقامت سے کام لو، بے شک زمین خدا کی ہے، وہ جس کو چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اس کا مالک بناتا ہے اور انجام پرہیز گاروں کے لیے ہے۔''

چنانچہ بنی اسرائیل مصر و شام و کنعان کی آس پاس بسنے والی بت پرست قوموں سے تعداد میں بہت کم تھے، لیکن جب انہوں نے ہمت دکھائی اور بہادرانہ استقامت اور صبر اور ثابت قدمی سے مقابلے کیے تو ان کی ساری مشکلیں حل ہوگئیں اور کثیر التعداد دشمنوں کے نرغہ میں پھنسے رہنے کے باوجود ایک مدت تک خود مختار سلطنت پر قابض اور دوسری قوموں پر حکومت کرتے رہے، اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی اس کامیابی کا راز اسی ایک لفظ صبر میں ظاہر کیا ہے، فرمایا:

﴿ وَأَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِينَ كَانُوا يُسْتَضْعَفُونَ مَشَارِقَ الْأَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِي بَارَكْنَا فِيهَا ۖ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنَىٰ عَلَىٰ بَنِي إِسْرَائِيلَ بِمَا صَبَرُوا ۖ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهُ وَمَا كَانُوا يَعْرِشُونَ ﴾ (٧/ الاعراف: ١٣٧)

''اور ان لوگوں کو جو کمزور سمجھے جاتے تھے، اس زمین کی وراثت بخشی جس میں ہم نے برکت نازل کی ہے اور تیرے پروردگار کی اچھی بات بنی اسرائیل کے حق میں ان کے صبر و ثبات کے سبب سے پوری ہوئی اور ہم نے فرعون اور اس کی قوم کے کاموں کو اور تعمیروں کو برباد کر دیا۔''

اس سے ظاہر ہوا کہ بنی اسرائیل جیسی کمزور قوم فرعون جیسی طاقت کے سامنے اس لیے سر بلند ہوئی کہ اس نے صبر و ثابت قدمی سے کام لیا اور اسی کے نتیجہ کے طور پر اللہ تعالیٰ نے ان کو شام کی بابرکت زمین کی حکومت عطا فرمائی، چنانچہ اسی کی تصریح اللہ تعالیٰ نے ایک دوسرے موقع پر فرمائی:

﴿ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَىِٕمَّةً يَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا ؕ۟ وَكَانُوْا بِاٰيٰتِنَا يُوْقِنُوْنَ۝ ﴾

(۳۲/ السجدۃ: ۲٤)

''اور بنی اسرائیل میں سے ہم نے ایسے پیشوا بنائے جو ہمارے حکم سے راہ دکھاتے تھے، جب انہوں نے صبر کیا اور ہمارے حکموں پر یقین رکھتے تھے۔''

آیت بالا نے بنی اسرائیل کی گزشتہ پیشوائی کے دو سبب بیان کیے ہیں، ایک احکام الٰہی پر یقین اور دوسرے ان احکام کی بجا آوری میں صبر اور ثباتِ قدم، یہی دو باتیں دنیا کی ہر قوم کی ترقی کا سنگ بنیاد ہیں، پہلے اپنے اصول کے صحیح ہونے کا بشدت یقین اور پھر ان اصولوں کی تعمیل میں ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو خوشی خوشی جھیل لینا۔

غزوۂ احد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوتی، بلکہ ستر مسلمان خاک وخون میں لتھڑ کر راہِ خدا میں جانیں دیتے ہیں، بعض مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن وملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی زندگی کی روداد ان کو سناتا ہے:

﴿ وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ ۙ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَاۤ اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ؕ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّاۤ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْۤ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران: ۱٤٦۔۱٤٧)

''اور کتنے پیغمبر ہیں، جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں، پھر خدا کی راہ میں تکلیف اٹھا کر انہوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے اور اللہ ثابت رہنے والوں (صابرین) کو دوست رکھتا ہے اور وہ یہی کہتے رہے کہ اے ہمارے پروردگار! ہمارے گناہوں کو اور کام میں ہماری زیادتی کو معاف کر اور ہمارے قدم ثابت رکھ اور کافروں کے مقابلہ میں ہماری مدد فرما۔''

اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے اُن تو بر تو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرہ پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کے مجبوراً درگزر کا نہیں، بلکہ دل کی انتہائی قوت وہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام ہے، ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آ جانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور خدا سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو اسی کی کمی (ذنب) یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے، معاف فرمائے اور اس کو مزید ثباتِ قدم عطا کر کے حق کے

دشمنوں پر کامیابی بخشے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے کامیابی کے حصول کے لیے مسلمانوں کو دو باتوں کی تاکید فرمائی، ایک تو خدا کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا۔

دنیا کی فتح یابی کے ساتھ آخرت کا عیش بھی جس کا نام جنت ہے، انہیں کے حصہ میں ہے، جن کو یہ پامردی، دل کی مضبوطی اور حق پر ثبات قدم کی دولت ملی، حق کی راہ میں مشکلات کے پیش آنے کی ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ ان سے کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اور دونوں الگ الگ معلوم ہونے لگتے ہیں، چنانچہ فرمایا:

﴿ اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ۝ ﴾

(۳/ آل عمران:۱۴۲)

''کیا تم سمجھتے ہو کہ جنت میں چلے جاؤ گے اور ابھی اللہ نے (آزما کر) ان کو الگ نہیں کر دیا جو لڑنے والے ہیں اور جو ثابت قدم (صابر) ہیں۔''

ضبط نفس

اشخاص اور قوموں کی زندگی میں سب سے نازک موقع وہ آتا ہے، جب وہ کسی بڑی کامیابی یا ناکامی سے دوچار ہوتی ہیں، اس وقت نفس پر قابو رکھنا اور ضبط سے کام لینا مشکل ہوتا ہے، مگر یہی نفس کا اصلی موقع ہوتا ہے اور اسی سے اشخاص اور قوموں میں سنجیدگی، متانت، وقار اور کیرکٹر کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔ دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت توام ہیں، ان دونوں موقعوں پر انسان کو ضبطِ نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے، یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت اور خوشی کے نشہ میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو اور غم و تکلیف میں وہ اداس اور بددل نہ ہو، دل کے ان دونوں عیبوں کا علاج صبر و ثبات اور ضبطِ نفس ہے، انسانی فطرت کے راز دار کا کہنا ہے:

﴿ وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ ۚ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ۝ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ ۭ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّاَجْرٌ كَبِيْرٌ۝ ﴾ (۱۱/ ھود: ۹۔۱۱)

''اور اگر ہم انسان کو اپنے پاس سے کسی مہربانی کا مزہ چکھائیں، پھر اس سے اس کو اتار لیں تو وہ ناامید اور ناشکرا ہو جاتا ہے اور اگر کوئی مصیبت کے بعد اس کو نعمت کا مزہ چکھائیں، تو کہتا ہے کہ برائیاں مجھ سے دور ہو گئیں، بے شک وہ شاداں اور نازاں ہے، لیکن وہ جنھوں نے صبر (یعنی نفس پر قابو) رکھا اور اچھے کام کیے، یہ لوگ ہیں جن کے لیے معافی اور بڑا انعام ہے۔''

ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کو ہمیشہ ادا کرنا

ہنگامی واقعات اور وقتی مشکلات پر صبر و پامردی سے ایک معنی بڑھ کر وہ صبر ہے جو کسی فرض کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنے میں ظاہر ہوتا ہے، اسی لیے مذہبی فرائض و احکام کو جو بہر حال نفس پر

سخت گزرتے ہیں، عمر بھر پوری مضبوطی سے ادا کرتے رہنا بھی صبر ہے، ہر حال اور ہر کام میں خدا کے حکم کی فرمانبرداری اور عبودیت پر ثبات، نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے، اسی لیے حکم ہوا:

﴿ رَبُّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا فَاعْبُدْهُ وَاصْطَبِرْ لِعِبَادَتِهٖ ﴾ (۱۹/ مریم: ۶۵)

''آسمانوں کا پروردگار اور زمین کا اور جو ان دونوں کے بیچ میں ہے سب کا، تو اس کی بندگی کر اور اس کی بندگی پر ٹھہرا رہ (صبر کر)۔''

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل وعیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلہ میں ہے:

﴿ وَأْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا ﴾ (۲۰/ طٰہٰ: ۱۳۲)

''اور اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کر اور آپ اس پر قائم رہ۔''

یعنی تمام عمر یہ فریضہ پابندی کے ساتھ ادا ہوتا رہے۔

حسبِ ذیل آیتوں میں غالباً صبر اسی مفہوم میں ہے، وہ لوگ جو خدا کے سامنے حاضری کے دن سے ڈرا کرتے تھے، اللہ تعالیٰ ان کو خوشخبری سناتا ہے:

﴿ فَوَقٰىهُمُ اللّٰهُ شَرَّ ذٰلِكَ الْيَوْمِ وَلَقّٰىهُمْ نَضْرَةً وَّسُرُوْرًا ۝ وَجَزٰىهُمْ بِمَا صَبَرُوْا جَنَّةً وَّحَرِيْرًا ۝ ﴾

(۷۶/ الدھر: ۱۱۔۱۲)

''تو اللہ نے ان کو اس دن کی برائی سے بچالیا اور ان کو تر وتازگی وشادمانی سے ملایا اور ان کے صبر کرنے (یعنی احکامِ الٰہی پر ٹھہرے رہنے) کے سبب سے باغ اور ریشمی لباس بدلہ میں دیا۔''

وہ لوگ جو خدا کی بارگاہ میں توبہ کریں، ایمان لائیں، نیک کام کریں، فریب کے کاموں میں شریک نہ ہوں، بے ہودہ اور لغو کاموں کے سامنے سے ان کو گزرنا پڑے تو بزرگی کے رکھ رکھاؤ سے گزر جائیں اور خدا کی باتوں کو سن کر اطاعت مندی سے اس کو قبول کریں اور اپنی اور اپنی اولاد کی بہتری اور پیشوائی کی دعائیں مانگیں، ان کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم کی یہ بشارت سناتا ہے:

﴿ اُولٰٓئِكَ يُجْزَوْنَ الْغُرْفَةَ بِمَا صَبَرُوْا ﴾ (۲۵/ الفرقان: ۷۵)

''ان کو بہشت کا جھروکہ بدلہ میں ملے گا کہ وہ صبر کرتے رہے۔''

ان دونوں آیتوں میں صبر کا مفہوم یہی ہے کہ نیک کاموں کو بار خاطر، خلافِ طبع اور تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہے اور بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے، بچتے رہے، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر دوگانہ ادا کرنا، الوانِ نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر روزے رکھنا، تکلیف ومشقت ہونے کے باوجود خطرناک موقعوں پر بھی سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ میں شدائد کو آرام وراحت جان کر جھیل لینا،

سود کی دولت سے ہاتھ اٹھالینا، حسن و جمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری اور پھر اس پر عمر بھر، استواری اور پائیداری، صبر کی بہت ہی کڑی منزل ہے اور اسی لیے ایسے صابروں کی جزا بھی خدا کے ہاں بھاری ہے۔

ان آیاتِ پاک کی اس تشریح میں وہ حدیث یاد آتی ہے، جس میں آنحضرت ﷺ نے فرمایا:

((حُجِبَتْ (حُفّت) الجنّة بالمکارہِ وَحُجِبَتْ (حُفَّتِ) النَّارُ بالشّھواتِ)). [1]

''جنت ناخوشی کے کاموں اور دوزخ نفسانی لذتوں کے کاموں سے ڈھانپی گئی ہے۔''

یعنی نیکی کے ان کاموں کا کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے، اس وقت دنیا میں نفس پر شاق گزرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے، اس وقت دنیا میں بڑے پُر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں اور اس عارضی و ہنگامی ناخوشی یا خوشی کی پروا کیے بغیر احکام الٰہی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے، کسی قارون کے خزانہ، مال و دولت کی فراوانی اور اسبابِ عیش کی بہتات کو دیکھ کر، اگر کسی کے منہ میں پانی نہ بھر آئے اور اس وقت بھی مالِ حرام کی کثرت کے لالچ کے بجائے، مالِ حلال کی قلت کو صبر کر کے خوشی کے ساتھ برداشت کرلے، تو یہ بڑی قوت کا کام ہے، جو صرف صابروں کو ملی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ میں جو قارون تھا، اس کے مال و دولت کو دیکھ کر بہت سے ظاہر پرست لالچ میں پڑ گئے لیکن جن میں صبر و برداشت کا جوہر تھا، ان کی چشم بینا اس وقت بھی کھلی ہوئی تھی اور ان کو نظر آتا تھا کہ یہ فانی اور آنی جانی چیز کے دن کی ہے، خدا کی وہ دولت جو نیکوکاروں کو بہشت میں ملے گی، وہ لازوال، غیر فانی اور جاودانی ہے:

﴿ قَالَ الَّذِيْنَ يُرِيْدُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا يٰلَيْتَ لَنَا مِثْلَ مَاۤ اُوْتِيَ قَارُوْنُ ۙ اِنَّهٗ لَذُوْ حَظٍّ عَظِيْمٍ ۝ وَقَالَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ وَيْلَكُمْ ثَوَابُ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّمَنْ اٰمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ۚ وَلَا يُلَقّٰىهَاۤ اِلَّا الصّٰبِرُوْنَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۹۔۸۰)

''جو لوگ حیات دنیاوی کی آرائش کے خواہاں تھے، وہ بولے اے کاش! ہمارے پاس بھی وہ ہوتا جو قارون کو دیا گیا، وہ بڑا خوش قسمت ہے اور جنہیں علم ملا تھا، انہوں نے کہا، تمہارا بُرا ہے، اللہ کی جزا ان کے لیے جو ایمان لائے اور نیک کام کیے سب سے اچھی چیز ہے اور اس حقیقت کو وہی پاسکتے ہیں جو صابر ہیں۔''

یہ اجر اور جزا بہتر سے بہتر ہوگی، کیونکہ یہ اس خزانے سے ملے گی جو لازوال اور باقی ہے:

﴿ مَا عِنْدَكُمْ يَنْفَدُ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ بَاقٍ ۭ وَلَنَجْزِيَنَّ الَّذِيْنَ صَبَرُوْۤا اَجْرَهُمْ بِاَحْسَنِ مَا كَانُوْا

[1] صحیح بخاری، کتاب الرقاق، باب حجبت النار بالشھوات: ٦٤٨٧؛ مسند أحمد، ج ٢، ص: ٣٣٣۔

يَعْمَلُوْنَ۝﴾ (١٦/ النحل:٩٦)

''جو تمہارے پاس ہے، وہ ختم ہو جائے گا اور جو خدا کے پاس ہے وہ رہ جانے والا ہے اور یقیناً ہم ان کو جنہوں نے صبر کیا ان کی مزدوری ان کے بہتر کاموں پر دیں گے۔''

ایک اور جگہ فرمایا کہ نمازیں ادا کیا کرو، کہ نیکیاں بدیوں کو دھو دیتی ہیں، اس پیغام میں نصیحت قبول کرنے والوں کے لیے نصیحت اور یاددہانی ہے، اس کے بعد ہے:

﴿ وَاصْبِرْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ۝﴾ (١١/ هود:١١٥)

''اور صبر کر، کہ بے شبہ اللہ نیک کام کرنے والوں کی مزدوری ضائع نہیں کرتا۔''

صبر کے فضائل اور انعامات

یہ مزدوری کیا ہوگی؟ یہ حد اور شمار سے باہر ہوگی:

﴿ اِنَّمَا يُوَفَّى الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَيْرِ حِسَابٍ۝﴾ (٣٩/ الزمر:١٠)

''صبر کرنے والوں کو تو ان کی مزدوری بے حساب ملے گی۔''

جن محاسن اور محامدِ صفات اور اعلیٰ اخلاق کا درجہ اس دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ ہے، ان میں صبر و برداشت کا بھی شمار ہے:

﴿ اِنَّ الْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ وَالْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ ۙ اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا۝﴾ (٣٣/ الاحزاب:٣٥)

''بے شک مسلمان مرد اور مسلمان عورتیں اور ایماندار مرد اور ایماندار عورتیں اور بندگی کرنے والے مرد اور بندگی کرنے والی عورتیں اور سچے مرد اور سچی عورتیں اور محنت سہنے والے مرد (صابرین) اور محنت سہنے والی عورتیں (صابرات) اور (خدا کے سامنے) جھکنے والے مرد اور جھکنے والی عورتیں اور خیرات کرنے والے مرد اور خیرات کرنے والی عورتیں اور روزہ دار مرد اور روزہ دار عورتیں اور اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرنے والے مرد اور حفاظت کرنے والی عورتیں اور خدا کو بہت یاد کرنے والے مرد اور بہت یاد کرنے والی عورتیں، اللہ نے ان کے لیے تیار رکھی ہے معافی اور بڑی مزدوری۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ صبر کا مرتبہ بڑی بڑی نیکیوں کے برابر ہے، اس سے انسان کی پچھلی غلطیاں حرفِ غلط کی طرح مٹ جاتی ہیں اور دین و دنیا کی بڑی سے بڑی مزدوری اس کے معاوضہ میں ملتی ہے، یہی

بشارت ایک اور آیت میں بھی ہے:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۚ اَلصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰدِقِيْنَ وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْمُنْفِقِيْنَ وَالْمُسْتَغْفِرِيْنَ بِالْاَسْحَارِ ﴾ (۳/ ال عمران: ۱۶۔۱۷)

"(جنت اور خدا کی خوشنودی اُن کو حاصل ہوگی) جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار! ہم ایمان لا چکے، ہمارے گناہوں کو معاف کر اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا اور صبر کرنے والے (یعنی مشکلات کی محنت کو اٹھا لینے والے) اور سچ بولنے والے اور بندگی میں لگے رہنے والے اور (خدا کی راہ میں) خرچ کرنے والے اور پچھلی راتوں کو خدا سے اپنے گناہوں کی معافی مانگنے والے۔"

اس آیت میں ایک عجیب نکتہ ہے، اس خوش قسمت جماعت کے اوصاف کا آغاز بھی دعا سے اور خاتمہ بھی دعا پر ہے اور ان دونوں کے بیچ میں ان کے چار اوصاف گنائے ہیں، جس میں پہلا درجہ صبر، یعنی محنت سہارنے، تکلیف جھیلنے اور پامردی دکھانے کا ہے، دوسرا راستی اور راست بازی کا، تیسرا خدا کی بندگی وعبودیت کا اور چوتھا راہ خدا میں خرچ کرنے کا۔

فتحِ مشکلات کی کنجی صبر اور دعا

بعض آیتوں میں ان تمام اوصاف کو صرف دو لفظوں میں سمیٹ لیا گیا ہے، دعا اور صبر اور فرمایا گیا ہے کہ یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں، یہود جو آنحضرت ﷺ کے پیغام کو قبول نہیں کرتے تھے، اس کے دو سبب تھے، ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں، یہ عیش وعشرت اور ناز ونعمت کے خوگر ہو کر، ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے، اسی لیے محمد رسول اللہ ﷺ کی طب روحانی نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا:

﴿ وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ﴾ (۲/ البقرۃ:۴۵)

"اور صبر (محنت اٹھانے) اور دعا مانگنے سے قوت پکڑو۔"

دعا سے ان کے دل میں اثر اور طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی، ہجرت کے بعد جب قریش نے مسلمانوں کے برخلاف تلواریں اٹھائیں اور مسلمانوں کے ایمان کے لیے اخلاص کی ترازو میں تلنے کا وقت آیا تو یہ آیتیں نازل ہوئیں:

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرٰتِ ۭ وَبَشِّرِ الصّٰبِرِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ اِذَآ

اَصَابَتْهُمْ مُّصِيبَةٌ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝ اُولٰٓئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوٰتٌ مِّنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۟ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُوْنَ ۝﴾ (۲/ البقرۃ:۱۵۳۔۱۵۷)

''اے ایمان والو! صبر (ثابت قدمی) اور دعا سے قوت پکڑو، بے شک اللہ صبر والوں (ثابت قدم رہنے والوں) کے ساتھ ہے اور جو خدا کی راہ میں مارے جاتے ہیں، ان کو مردہ نہ کہو، بلکہ زندہ ہیں، لیکن تم کو خبر نہیں اور ہم تم کو کسی قدر خطرہ اور بھوک اور مال و جان اور پیداوار کے کچھ نقصان سے آزمائیں گے اور صبر والوں (یعنی ثابت قدم رہنے والوں) کو خوش خبری سنا دو، جن کو جب کوئی مصیبت پیش آئے تو کہیں کہ ہم اللہ کے ہیں اور ہم کو اللہ ہی کے پاس لوٹ کر جانا ہے، یہ لوگ ہیں، ان پر ان کے پروردگار کی شاباشیں اور مہربانیاں ہیں اور یہی ہیں ٹھیک راہ پر۔''

ان آیات نے بتایا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے، جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر، ضبط نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم خدا کے محکوم ہیں، آخر بازگشت اسی کی طرف ہو گی، اس لیے حق کی راہ میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے سے ہم کو دریغ نہ ہونا چاہیے، اگر اس راہ میں موت بھی آ جائے تو وہ حیاتِ جاوید کی بشارت ہی ہے۔

شکر

﴿ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ۝ ﴾ (۷/ الاعراف: ۱٤٤)

لغت میں شکر کے اصلی معنی یہ ہیں کہ "جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی تروتازگی پوری ہو اور وہ زیادہ دے"۔ اس سے انسانوں کے محاورہ میں یہ معنی پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کر دے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے، یہ قدر شناسی تین طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ دل سے، زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو۔ زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں جو کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

شکر کی نسبت جس طرح بندوں کی طرف کی جاتی ہے۔ خدا نے قرآن پاک میں اپنی طرف بھی کی ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ذرا ذرا سے نیک کاموں کی پوری قدر کرتا ہے اور ان کو ان کا پورا بدلہ عطا فرماتا ہے۔

شکر کا الٹ کفر ہے۔ اس کے لغوی معنی چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں، اسی سے ہماری زبان میں "کفرانِ نعمت" کا لفظ استعمال میں ہے۔

یہی کفر وہ لفظ ہے جس سے زیادہ کوئی برا لفظ اسلام کی لغت میں نہیں، اللہ پاک کے احسانوں اور نعمتوں کو بھلا کر دل سے اس کا احسان مند نہ بننا، زبان سے ان کا اقرار اور عمل سے اپنی اطاعت شعاری اور فرمانبرداری ظاہر نہ کرنا کفر ہے، جس کے مرتکب کا نام کافر ہے۔

اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ جس طرح کفر اسلام کی نگاہ میں بدترین خصلت ہے، اس کے بالمقابل شکر سب سے بہتر اور اعلیٰ صفت ہے، قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ اسی طرح ایک دوسرے کے بالمقابل بولے گئے ہیں:

﴿ اِنَّا هَدَيْنٰهُ السَّبِيْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ۝ ﴾ (۷٦/ الدھر: ۳)

"ہم نے انسان کو راستہ بتا دیا (اب وہ) یا شکر گزار (شاکر) ہوا یا ناشکرا (کافر) ہو گیا۔"

﴿ لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَئِنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝ ﴾ (۱٤/ ابراھیم: ۷)

"اگر تم نے شکر کیا تو ہم تمہیں بڑھائیں گے اور اگر ناشکری (کفر) کی تو بے شک میرا عذاب بہت سخت ہے۔"

اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے

احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے، حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسبت اللہ پاک کی شہادت ہے:

﴿إِنَّ إِبْرَاهِيمَ كَانَ أُمَّةً قَانِتًا لِّلَّهِ حَنِيفًا وَلَمْ يَكُ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ شَاكِرًا لِّأَنْعُمِهِ ۚ اجْتَبَاهُ وَهَدَاهُ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ۝﴾ (١٦/ النحل: ١٢٠-١٢١)

''دراصل ابراہیم دین کی راہ ڈالنے والا اور اللہ کا فرمانبردار اس کو ایک ماننے والا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اللہ کے احسانوں اور نعمتوں کا شکر گزار اللہ نے اس کو چن لیا اور اس کو سیدھی راہ دکھائی۔''

اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں اور احسانوں کی شکر گزاری یہ ہے کہ دین کی راہ اختیار کی جائے، احکام الٰہی کی پیروی کی جائے اور شرک سے پرہیز کیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا ہم کو قبول فرمائے گا اور ہر علم و عمل میں ہم کو سیدھی راہ دکھائے گا۔

اس تفصیل سے پتہ چلا کہ شکر ایمان کی جڑ، دین کی اصل اور اطاعتِ الٰہی کی بنیاد ہے۔ یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندہ کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت پیدا ہونی چاہیے اور اسی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿مَّا يَفْعَلُ اللَّهُ بِعَذَابِكُمْ إِن شَكَرْتُمْ وَآمَنتُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ شَاكِرًا عَلِيمًا ۝﴾

(٤/ النسآء: ١٤٧)

''اگر تم شکر کرو اور ایمان لاؤ تو خدا تم کو عذاب دے کر کیا کرے گا اور اللہ تو قدر پہچاننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔''

یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندوں سے صرف دو باتیں چاہتا ہے۔ شکر اور ایمان، ایمان کی حقیقت تو معلوم ہے۔ اب رہا شکر تو شریعت میں جو کچھ ہے، وہ شکر کے دائرہ میں داخل ہے۔ ساری عبادتیں شکر ہیں۔ بندوں کے ساتھ حسن سلوک اور نیک برتاؤ کی حقیقت بھی شکر ہی ہے۔ دولت مند اگر اپنی دولت کا کچھ حصہ خدا کی راہ میں دیتا ہے تو یہ دولت کا شکر ہے۔ صاحب علم اپنے علم سے بندگان الٰہی کو فائدہ پہنچاتا ہے تو یہ علم کی نعمت کا شکر ہے۔ طاقتور کمزوروں کی امداد اور اعانت کرتا ہے تو یہ بھی قوت و طاقت کی نعمت کا شکرانہ ہے۔ الغرض شریعت کی اکثر باتیں اسی ایک شکر کی تفصیلیں ہیں، اسی لیے شیطان نے جب خدا سے یہ کہنا چاہا کہ تیرے اکثر بندے تیرے حکموں کے نافرمان ہوں گے تو یہ کہا:

﴿وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَاكِرِينَ ۝﴾ (٧/ الاعراف: ١٧)

''تو ان میں سے اکثر کو شکر کرنے والا نہ پائے گا۔''

خود اللہ تعالیٰ نے اپنے نیک بندوں کو جزا دیتے ہوئے اسی لفظ سے یاد فرمایا:

﴿ وَسَنَجۡزِي ٱلشَّٰكِرِينَ ﴾ (۳/ آل عمران: ۱٤۵)

''اور ہم شکر کرنے والے کو جزا دیں گے۔''

پوری شریعت کا حکم اللہ تعالیٰ ان لفظوں میں دیتا ہے:

﴿ بَلِ ٱللَّهَ فَٱعۡبُدۡ وَكُن مِّنَ ٱلشَّٰكِرِينَ ﴾ (۳۹/ الزمر: ٦٦)

''بلکہ اللہ کی بندگی کر اور شکر گزاروں میں سے ہو۔''

شکر۔ اس جذبہ کو ہم کبھی زبان سے ادا کرتے ہیں، کبھی اپنے ہاتھ پاؤں سے پورا کرتے ہیں، کبھی اس کا بدلہ دے کر اس قرض کو اتارتے ہیں، زبان سے اس فرض کے ادا کرنے کا نام اللہ تعالیٰ کے تعلق سے قرآنی اصطلاح میں حمد ہے۔ جس کے مطالبہ سے پورا قرآن بھرا ہوا ہے اور یہی سبب ہے کہ حمد الٰہی میں اللہ تعالیٰ کے ان صفات کاملہ کا ذکر ہوتا ہے جو ان احسانوں اور نعمتوں کی پہلی اور اصلی محرک ہیں اور اسی لیے یہ کہنا چاہیے کہ جس طرح سارے قرآن کا نچوڑ سورۂ فاتحہ ہے، سورۂ فاتحہ کا نچوڑ خدا کی حمد ہے، اسی بنا پر قرآن پاک کا آغاز سورۂ فاتحہ سے اور سورۂ فاتحہ کا آغاز الحمدُ سے ہے:

﴿ ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾ (۱/ الفاتحة: ۱)

''سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔''

جہان اور جہان میں جو کچھ رنگ برنگ کی مخلوقات اور عجائبات ہیں، سب کی پرورش اور زندگی اور بقا اسی ایک کا کام ہے، اسی کے سہارے وہ جی رہے ہیں اور نکھر رہے ہیں، اس لیے حمد اسی ایک کی ہے، یہ تو دنیا کے نیرنگ قدرت کا آغاز ہے، لیکن دنیا جب اپنی تمام منازل حیات کو طے کر کے فنا ہو چکے گی اور یہ موجودہ زمین اور آسمان اپنا فرض ادا کر کے نئی زمین اور نئے آسمان کی صورت میں ظاہر ہو چکیں گے، پہلی دنیا کے عمل کے مطابق ہر شخص اس دوسری دنیا میں اپنی زندگی پا چکے گا۔ یعنی نیک اپنی نیکی کی جزا اور بد اپنی بدی کی سزا پا چکیں گے اور اہل جنت، جنت میں اور اہل دوزخ دوزخ میں جا چکیں گے، وہ، وہ وقت ہوگا جب دنیا اپنے اس نظام یا دورہ کو پورا کر چکی ہوگی، جس کے لیے خدا نے اس کو بنایا تھا۔ اس وقت عالمِ امکان کے ہر گوشہ سے یہ سریلی آواز بلند ہوگی:

﴿ وَقِيلَ ٱلۡحَمۡدُ لِلَّهِ رَبِّ ٱلۡعَٰلَمِينَ ﴾ (۳۹/ الزمر: ۷۵)

''سارے جہان کے پروردگار کی حمد ہے۔''

حمد کا ترانہ موجودہ دنیا کے ایک ایک ذرہ سے آج بھی بلند ہے:

﴿ وَلَهُ ٱلۡحَمۡدُ فِي ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَٱلۡأَرۡضِ ﴾ (۳۰/ الروم: ۱۸)

''اسی کی حمد آسمانوں میں ہے اور زمین میں ہے۔''

فرشتے بھی اسی حمد میں مشغول ہیں:

﴿ اَلَّذِيْنَ يَحْمِلُوْنَ الْعَرْشَ وَمَنْ حَوْلَهٗ يُسَبِّحُوْنَ بِحَمْدِ رَبِّهِمْ ﴾ (۴۰/ المؤمن :۷)

''جو عرش کو اٹھائے ہیں اور جو اس کے چاروں طرف ہیں، وہ اپنے پروردگار کے حمد کی تسبیح کرتے ہیں۔''

بلکہ عرصہ وجود کی ہر چیز اسی کی حمد و تسبیح میں لگی ہوئی ہے:

﴿ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا يُسَبِّحُ بِحَمْدِهٖ ﴾ (۱۷/ بنیٓ اسرآء یل :۴۴)

''اور کوئی چیز نہیں جو اس (خدا) کی حمد کی تسبیح نہ کرتی ہو۔''

یہی شکرانہ کی حمد و تسبیح ہے، جس کا مطالبہ انسانوں سے ہے:

﴿ سَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ ﴾ (۴۰/ المؤمن:۵۵، ۵۲/ الطور:۴۸)

''اپنے پروردگار کی حمد کی تسبیح کر۔''

آنحضرت ﷺ کے سنن اور شمائل میں ہر وقت اور ہر موقع کی اس کثرت سے جو دعائیں ہیں۔ مثلاً: کھانا کھانے کی، نئے کپڑے پہننے کی، سونے کی، سو کر جاگنے کی، نئے پھل کھانے کی، مسجد میں جانے کی، طہارت خانہ سے نکلنے کی، وغیرہ وغیرہ، ان سب کا منشا اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں کی حمد اور زبان سے اس کا شکریہ ادا کرنا ہے، لیکن زبان کا یہ شکریہ دل کا ترجمان اور قلبی کیفیت کا بیان ہونا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو جو جسمانی نعمتیں عنایت فرمائی ہیں، ان کا شکریہ، یہ ہے کہ ہم اپنے ہاتھ پاؤں کو خدا کے حکموں کی تعمیل میں لگا رکھیں اور ان سے ان کی خدمت کریں جو اس جسمانی نعمت کے کسی جزو سے محروم ہیں مثلاً: جو اپاہج اور معذور ہوں، بیمار ہوں، کسی جسمانی قوت سے محروم ہوں یا کسی عضو سے بیکار ہوں، مالی نعمتوں کا شکریہ، یہ ہے کہ جو اس نعمت سے بے نصیب ہوں ان کو اس سے حصہ دیا جائے۔ بھوکوں کو کھانا کھلایا جائے۔ پیاسوں کو پانی پلایا جائے۔ ننگوں کو کپڑا پہنایا جائے، بے سرمایوں کو سرمایہ دیا جائے۔

قرآن پاک کی مختلف آیتوں میں مختلف نعمتوں کے ذکر کے بعد شکر الٰہی کا مطالبہ کیا گیا ہے، اس لیے ہر آیت میں اس شکر کے ادا کرنے کی نوعیت اسی نعمت کے مناسب ہوگی، مثلاً: ایک جگہ ارشاد ہے:

﴿ تَبٰرَكَ الَّذِيْ جَعَلَ فِي السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّجَعَلَ فِيْهَا سِرٰجًا وَّقَمَرًا مُّنِيْرًا ۝ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ خِلْفَةً لِّمَنْ اَرَادَ اَنْ يَّذَّكَّرَ اَوْ اَرَادَ شُكُوْرًا ۝ ﴾ (۲۵/ الفرقان :۶۱۔۶۲)

''بڑی برکت اس کی ہے، جس نے آسمان میں برج بنائے اور اس میں ایک چراغ اور اجالا کرنے والا چاند رکھا اور اسی نے رات اور دن بنایا کہ ایک کے بعد ایک آتا ہے، اس کے واسطے جو دھیان رکھنا یا شکر کرنا چاہے۔''

اس میں اپنی قدرت کی نعمتوں کا ذکر کر کے شکر کی ہدایت ہے۔ یہ شکر اسی طرح ادا ہوسکتا ہے کہ اس قدرت والے کی قدرت تسلیم کریں اور دن کی روشنی اور چاند کے اجالے اور رات کے سکون میں ہم وہ فرض ادا کریں جس کے لیے یہ چیزیں ہم کو بنا کر دی گئی ہیں، دوسری آیتوں میں ہے:

﴿ الرَّحِيمُ ۙ الَّذِيٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ ۚ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ ۚ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْئِدَةَ ۭ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۳۲/ السجدۃ:۶۔۸)

”بڑے رحم والا جس نے خوب بنائی جو چیز بنائی اور انسان کی پیدائش ایک گارے سے شروع کی، پھر اس کی اولاد کو بے قدر نچڑے ہوئے پانی سے بنایا، پھر اس کو درست کیا اور اس میں اپنی روح سے کچھ پھونکا اور تمہارے کان اور آنکھیں اور دل بنائے تم کم شکر کرتے ہو۔“

﴿ وَاللّٰهُ اَخْرَجَكُمْ مِّنْۢ بُطُوْنِ اُمَّهٰتِكُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ شَيْــــًٔا ۙ وَّجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْــِٕدَةَ ۙ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۱۶/ النحل:۷۸)

”اور اللہ نے تم کو تمہاری ماؤں کے پیٹوں سے باہر نکالا، تم کچھ جانتے نہ تھے اور تمہارے لیے کان اور آنکھیں اور دل بنائے۔“

ان آیتوں میں خلقت جسمانی کی نعمت کا بیان اور اس پر شکر کرنے کی دعوت ہے۔ یعنی دل سے خدا کے ان احسانات کو مان کر اس کی ربوبیت وکبریائی اور یکتائی کو تسلیم کریں اور یہ سمجھیں کہ جس نے یہ زندگی دی اور اس زندگی میں ہم کو یوں بنا دیا۔ وہ ہمارے مرنے کے بعد دوسری زندگی بھی ہم کو دے سکتا ہے اور اس میں بھی ہم کو یہ کچھ عنایت کر سکتا ہے اور پھر ہاتھ پاؤں سے اور آنکھ کان سے اس کے ان احسانات کا جسمانی حق ادا کریں، بعض اور آیتوں میں ہے:

﴿ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ ۭ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾

(۲۲/ الحج:۳۶)

”تو ان جانوروں کے گوشت میں سے کچھ آپ کھاؤ اور کچھ ان کو کھلاؤ جو صبر سے بیٹھا ہے یا محتاجی سے بے قرار ہے، اسی طرح ہم نے وہ جانور تمہارے قابو میں دیے ہیں، تا کہ تم شکر کرو۔“

﴿ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ وَاشْكُرُوْا ﴾ (۲/ البقرۃ:۱۷۲)

”اے ایمان والو! ہم نے تم کو جو روزی دی پاک چیزوں میں کھاؤ اور خدا کا شکر کرو۔“

﴿ فَكُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاشْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ اِيَّاهُ تَعْبُدُوْنَ ۝ ﴾

(۱۶/ النحل:۱۱۴)

”تو خدا نے تم کو جو حلال اور پاک چیزیں روزی کیں، ان کو کھاؤ اور اس کی نعمت کا شکر کرو اگر تم اسی کو پوجتے ہو۔“

یہ مالی نعمت کا بیان تھا، اس کا شکریہ بھی خدا کو مان کر مال کے ذریعہ ادا کریں۔

دنیا میں شکریہ کی تیسری قسم یہ ہے کہ کسی محسن نے جس قسم کا احسان ہمارے ساتھ کیا ہو، اسی قسم کا احسان ہم اس کے ساتھ کریں۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بے نیاز ذات کے ساتھ اس قسم کا کوئی شکریہ ادا نہیں کیا جا سکتا اس تیسری قسم کے شکریہ کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ساتھ جو احسان فرمایا ہو۔ اسی قسم کا احسان ہم اس کے بندوں کے ساتھ کریں۔ اسی نکتہ کو اللہ تعالیٰ نے قوم موسیٰ علیہ السلام کے ان لفظوں میں ادا فرمایا ہے:

﴿ وَاَحْسِنْ كَمَآ اَحْسَنَ اللّٰهُ اِلَيْكَ ﴾ (۲۸/ القصص: ۷۷)

”اور جس طرح اللہ نے تیرے ساتھ بھلائی کی تو بھی بھلائی کر۔“

اسی کا نام خدا کو قرضہ دینا بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا نعوذ باللہ محتاج نہیں کہ اس کو کوئی قرضہ دے۔ خدا کو قرض دینا یہی ہے کہ اس کے ضرورت مند بندوں کو یا قابلِ ضرورت کاموں میں روپیہ دیا جائے، ارشاد ہوتا ہے:

﴿ مَنْ ذَا الَّذِيْ يُقْرِضُ اللّٰهَ قَرْضًا ﴾ (۵۷/ الحدید: ۱۱)

”کون ہے جو خدا کو اچھا قرض دیتا ہے۔“

﴿ وَاَقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (۷۳/ المزمل: ۲۰)

”اور خدا کو قرض حسنہ دو۔“

﴿ اِنْ تُقْرِضُوا اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا ﴾ (٦٤/ التغابن: ۱۷)

”اگر خدا کو قرض حسنہ دو گے۔“

خدا کو قرض حسنہ دینے کی جو تفسیر اوپر کی گئی، اس کی روشنی میں اس حدیث کو پڑھنا چاہیے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ”قیامت کے دن خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں بیمار پڑا تو نے میری بیمار پرسی نہ کی، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو جہان کا پروردگار ہے میں تیری بیمار پرسی کیسے کرتا، فرمائے گا کہ تجھے خبر نہ ہوئی کہ میرا فلاں بندہ بیمار تھا تو نے اس کی پرسش نہ کی اور اگر کرتا تو، تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ پھر خدا فرمائے گا: اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے مجھے نہیں کھلایا، بندہ عرض کرے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو سارے جہان کا رب ہے میں تجھے کیسے کھلاتا، فرمائے گا تجھے معلوم نہ ہوا کہ میرے فلاں بندہ نے تجھ سے کھانا مانگا تو نے اس کو نہیں کھلایا اگر تو اس کو کھلاتا تو اس کا بدلہ آج میرے پاس پاتا، اے آدم کے بیٹے! میں نے تجھ سے پانی مانگا تو، تو نے مجھے پانی نہیں پلایا، بندہ کہے گا: اے میرے پروردگار! تو، تو سارے عالم کا پروردگار ہے، میں تجھے کیسے پانی پلاتا،

فرمائے گا: میرے فلاں بندہ نے تجھ سے پانی مانگا تو نے اس کو نہیں پلایا، اگر تو اس کو پلاتا تو آج تو اس کو میرے پاس پاتا۔'' [1] اس تشریح سے معلوم ہوگا کہ خدا کی دی ہوئی نعمتوں کا جانی اور مالی شکریہ ہم کو کس طرح ادا کرنا؟ اور اس کا قرض ہم کو کیوں کر اتارنا چاہیے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی نعمتوں کے شکر ادا کرنے کا بار بار تقاضا اس لیے بھی کیا ہے کہ ہم یہ نہ سمجھنے لگیں کہ خدا کے فضل و کرم کے سوا ہم ان نعمتوں کا کوئی استحقاق خود بھی رکھتے تھے۔ حالانکہ ان کے لیے نہ کوئی ہمارا خاندانی استحقاق تھا نہ کوئی ہمارا ذاتی علمی یا عملی۔ جو کچھ ملا اس کے فضل و کرم سے ملا اور جو کچھ ملے گا، وہ اسی کی عطا اور بخشش ہوگی۔ انسان اپنی روز مرہ کی متواتر بخششوں کو جو زمین سے آسمان تک پھیلی ہیں، دیکھ کر اور ان کے دیکھنے کا عادی ہو کر یہ سمجھتا ہے کہ ہمارے ساتھ اللہ کی یہ کوئی بخشش نہیں۔ بلکہ فطرت کی عام بخشش ہے، جس کے شکریہ کی کوئی ضرورت نہیں۔ مگر خوب سمجھنا چاہیے کہ یہی وہ بیج ہے جس سے کفر اور الحاد کی کونپلیں نکلتی ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں اپنی ایک ایک عنایت اور بخشش کو گنوایا ہے اور اس پر شکر ادا کرنے کی تاکید فرمائی ہے، تاکہ ربوبیت الٰہی کا یقین اس کے ایمان کے بیج کو سیراب کرے اور بارآور بنائے۔ دولت و نعمت پانے کے بعد انسان یہ سمجھنے لگتا ہے کہ وہ عام انسانوں سے کوئی بلند تر ہے اور جو اس کو ملا ہے، وہ اس کا خاندانی حق تھا یا اس کے یہ ذاتی علم و ہنر کا نتیجہ تھا۔ جیسا کہ قارون نے کہا تھا، یہی غرور ہے، جو ترقی کر کے بخل اور ظلم کی صورت اختیار کر لیتا ہے، اللہ تعالیٰ نے اس کی ممانعت فرمائی اور ارشاد ہوا:

﴿ وَلَا تَفْرَحُوا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِۨ ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ ۗ وَمَنْ يَّتَوَلَّ فَاِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝ ﴾ (۵۷/ الحدید: ۲۳۔۲۴)

''(اور تاکہ) جو خدا نے تم کو دیا اس پر اتراؤ نہیں اور اللہ کسی اترانے والے، بڑائی مارنے والے کو پیار نہیں کرتا جو خود کنجوس ہیں اور لوگوں کو بھی کنجوس بننے کو کہتے ہیں اور جو (اللہ کی بات سے) منہ موڑے گا (تو اللہ کو کیا پروا) وہ تو دولت سے بھرپور اور حمد (یعنی حسن و خوبی) سے مالا مال ہے۔''

وہ اپنی ذات سے نہ تو انسانوں کی دولت کا بھوکا ہے کہ وہ تو غنی ہے اور نہ ان کے شکرانہ کی حمد کا ترسا ہے کہ وہ تو حمید یعنی حمد سے بھرا ہوا ہے۔ خدا نے انسانوں پر جو تو برتو نعمتیں اتاری ہیں اور اپنی لگاتار بخششوں سے ان کو جو نوازا ہے، اس سے یہی مقصود ہے کہ وہ اپنے اس محسن کی قدر پہچانے، اس کے مرتبہ کو جانے، اس کے حق کو مانے اور اس کی نعمت و بخشش کا مناسب شکر اپنے جان و مال و دل سے ادا کرے:

﴿ وَرَزَقَكُمْ مِّنَ الطَّيِّبٰتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝ ﴾ (۸/ الانفال: ۲۶)

''اور اس نے تم کو پاک چیزیں روزی دیں، تاکہ تم شکر کرو۔''

---

[1] صحیح مسلم، کتاب البر والصلة، باب فضل عیادة المریض: ٦٥٥٦۔

﴿ وَهُوَ الَّذِي سَخَّرَ الْبَحْرَ لِتَأْكُلُوا مِنْهُ لَحْمًا طَرِيًّا وَتَسْتَخْرِجُوا مِنْهُ حِلْيَةً تَلْبَسُونَهَا ۖ وَتَرَى الْفُلْكَ مَوَاخِرَ فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (۱۶/ النحل:۱۴)

''اور اسی نے سمندر کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم اس سے تازہ گوشت (مچھلی) کھاؤ اور اس سے آرائش کی وہ چیز نکالو جس کو تم پہنتے ہو (یعنی موتی) اور تم جہازوں کو دیکھتے ہو کہ وہ اس میں پانی کو پھاڑتے رہتے ہیں اور، تاکہ تم خدا کی مہربانی ڈھونڈو اور، تاکہ تم شکر کرو۔''

﴿ كَذَٰلِكَ سَخَّرْنَاهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (۲۲/ الحج:۳۶)

''اور اسی طرح ہم نے ان جانوروں کو تمہارے بس میں کر دیا کہ تم شکر کرو۔''

﴿ وَمِنْ رَحْمَتِهِ جَعَلَ لَكُمُ اللَّيْلَ وَالنَّهَارَ لِتَسْكُنُوا فِيهِ وَلِتَبْتَغُوا مِنْ فَضْلِهِ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (۲۸/ القصص:۷۳)

''اور اس کی رحمت سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے رات اور دن بنایا کہ تم (رات کو) آرام اور (دن کو) اس کے فضل وکرم کی تلاش کرو اور، تاکہ تم شکر کرو۔''

ان کے علاوہ اور بھی بہت سی آیتیں ہیں، جن میں اللہ تعالیٰ نے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ ان ساری نعمتوں کا منشا یہ ہے کہ بندہ اپنے آقا کو پہچانے اور دل سے اس کے احسان کو مانے، لیکن گناہگار انسان کا کیا حال ہے:

﴿ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَشْكُرُونَ ۝ ﴾ (۱۰/ یونس:۶۰)

''اللہ نے انسانوں پر بڑے بڑے فضل کیے، لیکن ان میں سے بہت کم شکر کرتے ہیں۔''

﴿ وَلَقَدْ مَكَّنَّاكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ ۗ قَلِيلًا مَا تَشْكُرُونَ ۝ ﴾

(۷/ الاعراف:۱۰)

''اور ہم نے تم کو زمین میں قوت بخشی اور اس میں تمہارے لیے بسر اوقات کے بہت سے ذریعے بنائے، تم بہت کم شکر کرتے ہو۔''

ایک موقع پر تو اللہ تعالیٰ نے انسان کی اس ناشکری پر، پُرمحبت غضب کا اظہار بھی فرمایا:

﴿ قُتِلَ الْإِنْسَانُ مَا أَكْفَرَهُ ۝ ﴾ (۸۰/ عبس:۱۷)

''مارے جائیو، انسان کتنا بڑا ناشکرا ہے۔''

شکر کے باب میں ایک بڑی غلط فہمی یہ ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے زبان سے الحمد للہ پڑھ دیا تو مالک کا شکر ادا ہو گیا۔ حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے شکر دراصل دل کے اس لطیف احساس کا نام ہے، جس کے سبب سے ہم اپنے محسن سے محبت رکھتے ہیں، ہر موقع پر اس کے احسان کا اعتراف کرتے ہیں اور اس کے لیے سراپا سپاس بنتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں کہ ہم اس کو خوش رکھ سکیں اور اس کی فرمائشوں کو پورا کرتے رہیں، اگر ہم

صرف زبان سے شکر کا لفظ ادا کریں، لیکن دل میں احسان مندی اور منت پذیری کا کوئی اثر اور کیف نہ ہو اور اس اثر کے مطابق ہمارا عمل نہ ہو تو ہم اس محسن کی احسان مندی کے اظہار میں جھوٹے ہیں اور وہ شکر خدا کی بارگاہ میں قبول نہیں، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو اپنے پے در پے احسانات سے جس طرح نوازا، اس کے بیان کرنے کے بعد ان کو خطاب کر کے فرماتا ہے:

﴿ اِعْمَلُوْٓا اٰلَ دَاوٗدَ شُكْرًا ۭ ﴾ (۳٤/ سبا:۱۳)

"اے داؤد کے گھر والو! شکرادا کرنے کے لیے نیک عمل کرو۔"

اس آیت پاک نے بتایا کہ شکر کا اثر زبان تک محدود نہ ہو، بلکہ عمل سے بھی ظاہر ہونا چاہیے۔ اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام خدا سے دعا کرتے ہیں:

﴿ رَبِّ اَوْزِعْنِيْٓ اَنْ اَشْكُرَ نِعْمَتَكَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتَ عَلَيَّ وَعَلٰي وَالِدَيَّ وَاَنْ اَعْمَلَ صَالِحًا تَرْضٰىهُ ﴾ (۲۷/ النمل:۱۹)

"اے میرے پروردگار! مجھے نصیب کر کہ میں تیرے اس احسان کا جو تو نے مجھ پر اور میرے ماں باپ پر کیا ہے، شکر کروں اور وہ نیک کام کروں جو تجھے پسند ہو"

اس دعا میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شکر میں شکر کے دلی جذبہ کے ساتھ اسی کے مطابق اور مناسب نیک عمل بھی ہو۔

دل میں یہ بات آتی ہے کہ خدا نے اپنے شکر گزار بندوں کے حق میں جو یہ فرمایا ہے کہ وہ جیسے جیسے شکر کرتے جائیں گے، میں ان کے لیے اپنی نعمتوں کی تعداد اور کیفیت بھی بڑھاتا جاؤں گا، اس کی تاویل یہ ہے کہ بندہ جیسے جیسے مالک کے شکر کے لیے اپنے عمل میں سرگرم ہوتا جاتا ہے، اس کی طرف سے شکرانہ عمل کی ہر نئی سرگرمی کے جواب میں اس کو کوئی نئی نئی نعمتیں عنایت ہوتی جاتی ہیں، اسی لیے فرمایا:

﴿ لَىِٕنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ وَلَىِٕنْ كَفَرْتُمْ اِنَّ عَذَابِيْ لَشَدِيْدٌ ۝﴾ (۱٤/ ابراھیم:۷)

"اگر تم شکر ادا کرو گے تو میں تم کو اور بڑھاؤں گا اور اگر ناشکری کرو گے تو میرا عذاب بڑا ہی سخت ہے۔"

﴿ كَذٰلِكَ نَجْزِيْ مَنْ شَكَرَ ۝﴾ (۵٤/ القمر:۳۵)

"ہم اسی طرح اس کو جزا دیتے ہیں جس نے شکر کیا۔"

﴿ وَسَنَجْزِي الشّٰكِرِيْنَ ۝﴾ (۳/ آل عمران:۱٤۵)

"اور ہم شکر کرنے والوں کو جزا دیں گے۔"

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں ایک شکر ہی کا جذبہ پیدا ہو جائے تو دین و دنیا میں بھلائی کے

لیے اس کو کسی اور تنبیہ کی ضرورت نہ ہو، وہ خدا کی نعمتوں کی قدر جان کر اس کو مانے گا اور اس کے حکموں پر چلے گا اور اسی کے بندوں کے ساتھ شکرانہ میں بھلائی کرے گا اور خود بندوں کے احسانات کے جواب میں بھی ان کے ساتھ نیکی اور خیر خواہی کرے گا۔ بلکہ آنحضرت ﷺ نے خود آپس میں ایک انسان کی دوسرے انسان کے ساتھ شکر گزاری کے جذبہ کو اللہ تعالیٰ کے احسانات کی شکر گزاری کا معیار مقرر فرمایا ہے، ارشاد ہوا:

((مَنْ لَّا يَشْكُرِ النَّاسَ لَا يَشْكُرِ اللّٰهَ)) [1]

''جو انسانوں کا شکر ادا نہ کرے گا وہ خدا کا بھی شکر ادا نہ کرے گا۔''

اس حدیث کا ایک اور مطلب یہ ہے کہ جو انسانوں کے احسانوں کا شکریہ ادا نہ کرے گا، تو خدا بھی اپنے احسانوں کا شکریہ اس سے قبول نہ فرمائے گا۔

[1] جامع ترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الشكر لمن أحسن اليك: ١٩٥٤۔

خاتمہ

کتاب کی پانچویں جلد جو عبادات کے مباحث پر مشتمل تھی ختم ہوگئی، ان صفحات میں آنحضرت ﷺ کی ان تعلیمات کا بیان تھا، جو عبادات کے باب میں آپ نے فرمائی ہیں، ان تعلیمات کے ایک ایک آیت حرف پر غور کیجئے کہ انہوں نے وہم پرستیوں اور غلط فہمیوں کے کتنے تو بر تو پردے چاک کر دیے اور عبادت جو ہر مذہب کا اہم جزو ہے اس کی حقیقت کتنی واضح کر دی۔ عبادات کے جو طریقے اللہ تعالیٰ نے آپ کو سکھائے اور آپ نے وہ انسانوں کو بتائے وہ کتنے مکمل اور ان میں کا ایک ایک آئین آپ کے عمل اور قول کی سند سے کس قدر متعین اور مفصل اور دین و دنیا کی مصلحتوں اور فائدوں پر مشتمل ہے اور آپ نے ان کے ذریعہ انسانی دلوں کی کمزوریوں اور روح کی بیماریوں کا کس طرح علاج فرمایا ہے۔

آنحضرت ﷺ کے پیغمبرانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور انہیں میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی ہر تعلیم جس میں عبادت بھی داخل ہے، عملاً: صاف واضح اور متعین ہے اور زمانہ مابعد میں انسانی تاویلات کی آمیزش اور قیاس آرائیوں سے مبرا ہے اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسان کی پیغمبرانہ تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اس لیے اس کے ہر پہلو کو ایسا واضح ہونا چاہیے تھا کہ وہ پھر کسی پیغمبر کی آمد اور تشریح و توضیح کی محتاج نہ رہے، نبوت و رسالت کے آخری معلم نے (خدا ان پر اپنی رحمتیں اور برکتیں اتارے) اس فرض کو اس خوبی سے انجام دیا جس سے زیادہ کا تصور نہیں ہو سکتا۔

صَلَوَاتُ اللّٰهِ عَلَيْهِ وَبَرَكَاتُهُ۔

مغفرت کا طلبگار

سید سلیمان ندوی

۱۲ جمادی الثانیہ ۱۳۵۴ھ